سحبانُ الہِند

مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

ایک سیاسی مُطالعہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
NEW DELHI-110002

سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

ایک سیاسی مطالعہ

از: ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

باہتمام: محمد ناصر خان

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2

Phones: 23247075, 23289786, 23289159 Fax: 23279998 Res.: 23262486

Sohban-ul-Hind Maulana

Ahmad Saeed Dehlavi (R.A.)

By: Dr. Abu Salman Shahjahanpuri

Edition : 2011 Pages : 352

Our Branches:

Delhi: Farid Book Depot (P) Ltd.
422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6 Ph.: 23256590

Mumbai: Farid Book Depot (P) Ltd.
216-218, Sardar Patel Road, Near Khoja Qabristan,
Dongri, Mumbai-400009 Ph.: 022-23731786, 23774786

Printed at: Farid Printing Press, Delhi

فہرست

عرضِ ناشر

ہماری آزادی کی جنگ بہت طویل ہوگئی۔ایک جنگ ہم لوگ ۱۷۵۷ء میں پلاسی میں، ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم میں اور ۱۸۰۳ء میں دہلی میں ہارے تھے کہ احساس اُبھرا کہ پھر سے اُٹھیں اور اپنی کھوئی ہوئی آزادی چھین لیں۔ یہ کوشش کتنی مستحسن، کتنی عظیم اور کتنی بابرکت ہوتی ہے، آزادی چاہنے والوں کے دل جانتے ہیں۔آزادی کے حصول کی یہ جدوجہد بہت طویل ہوگئی ہے۔پہلی جنگ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں لڑی گئی۔مشہدِ بالاکوٹ میں اب بھی آزادی چاہنے والوں کے جذبوں کا نور روشن ہے۔ ہواؤں کے جھونکے اب بھی ان کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔دوسری جنگ ۱۸۵۷ء میں پورے ہندوستان میں لڑی گئی اور دہلی اس جنگ کا مرکز ٹھہرا تھا۔ یہ جنگ ہم پھر ہار گئے تھے۔پھر تو غلامی کی تاریک رات کے سائے گہرے اور طویل ہو گئے تھے۔ہم اب تک انھی سایوں میں سفر کر رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد دیوبند، ریشمی رومال، جمعیۃ علماء ہند، تحریک خلافت، کانگریس کا اعلانِ آزادی اور پھر آزادی کا طویل سفر اس سفر کے مختلف پڑاؤ ہیں۔اس سفر میں بہت سے لوگوں نے قوم کی راہنمائی کا بیڑا اُٹھایا۔ یہ بیڑا اُٹھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔یہ تو قربانیوں کا عہد تھا۔ یہ لوگ عزیمت کے طویل سفر پر نکلے تھے۔ متاعِ زندگی دے کر آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ان لوگوں نے یورپی سامراج سے چھٹکارے کے لیے قوم کو راہِ عمل دکھائی۔کبھی راہِ عمل کٹھن ہوگئی اور کبھی قوم نے ان کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنے سے انکار کر دیا۔

حضرت مولانا احمد سعید دہلوی جمعیۃ علماء ہند کے اہم راہنما تھے۔آپ سیاستدان، مفکر، مصنف، مفسر اور محدث کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔آپ نے آزادی کی طویل جنگ میں جمعیۃ کی قیادت و سیادت کا فریضہ سر انجام دیا۔ آپ بنیادی طور پر علمی (Academic) آدمی تھے۔اس لیے آپ نے مسلسل سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہوئے بھی وقت نکالا اور علمی کام کیا۔آپ کا سب سے بڑا علمی کارنامہ آپ کی دو تفاسیر ہیں۔ ابتداء اس طرح ہوئی کہ آپ نے حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے معروف ترجمہ قرآن کی تسہیل و تجدید کا ارادہ فرمایا تھا۔ پھر دو تفسیریں لکھیں گئیں اور علم تفسیر کی تاریخ میں آپ کا نام

روشن ہو گیا۔

حضرت مولانا احمد سعید دہلوی زبان و بیان پر عبور رکھتے تھے۔ دہلی کے درودیوار نے کبھی حضرت شاہ عبدالعزیز کے خطبات سنے تھے۔ شاعری کے تذکرے بتاتے ہیں کہ استاد ذوق سے جب اُن کے استاد شاہ نصیر ناراض ہو گئے تو وہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کا وعظ سننے جاتے۔ وہ ان کے وعظ سے زبان و بیان کے نکتے جانتے اور زبان اُردو کے رنگ ڈھنگ سیکھتے۔ حضرت مولانا احمد سعید حضرت شاہ عبدالعزیز کے سلسلے کی ایک کڑی تھے۔ وہ بھی اُردو زبان جانتے تھے۔ اُردو زبان جاننا آسان تو نہیں ہے۔ داغ نے یونہی تو نہیں کہہ دیا تھا:

آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

مولانا احمد سعید کے وعظ سننے والوں نے اور جاننے والوں نے انھیں سحبان الہند کہا تھا۔ سحبان کبھی ایک لفظ کو دوبارہ نہیں بولے۔ مولانا احمد سعید کے ہاں بھی تکرار کم تھا۔ بہرحال وہ واعظ بھی تھے اور خوش بیان واعظ تھے۔

مولانا احمد سعید کا بڑا کارنامہ تو سیاسی تاریخ میں اُن کا کردار ہے۔ یہ کردار خود ایک تاریخ ہے۔ اس کو منضبط صورت میں پیش کرنا ہماری تاریخی ضرورت بھی ہے اور فکری ضرورت بھی۔ محترم ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری ہماری تاریخ کے ماہر عالم ہیں۔ وہ ایک مدت سے تاریخ تلاش کر رہے ہیں۔ ان کی کیفیت تو یہ ہے:

میں کہ میری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ

میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری اب تک تاریخ پر بہت سا کام کر چکے ہیں۔ ہمیں یہ سعادت حاصل ہے کہ ہم حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی پر ان کے مطالعات شائع کر چکے ہیں۔ اب مولانا احمد سعید دہلوی ایک مطالعہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب قارئین سے شرفِ قبول حاصل کرے گی۔ ہماری یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے شہداء کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہم آئندہ بھی ۱۸۵۷ء کے سلسلے کے لوگوں پر علمی کام شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ رب ذوالجلال ہمارے ارادوں کو قبول فرمائے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

محمد ریاض درانی

پیش لفظ

مدت ہوئی خاکسار نے جمعیت علماے ہند کے رہنماؤں کی شخصیت اور ان کے سیاسی افکار و خدمات کے مطالعے کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میرے پیش نظر یہ شخصیات تھیں:

۱۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ
۲۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ
۳۔ حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم دہلویؒ
۴۔ حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
۵۔ حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ

الحمدللہ! آج منصوبے کی آخری شخصیت پر کتاب پریس کے حوالے کرتے ہوئے ایک مسرت محسوس کر رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے اس اہم کام کو انجام دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب ۱۹۸۷ء میں شایع ہوئی تھی۔ آخری کتاب جولائی ۲۰۰۶ء سے پہلے پبلشر کے حوالے نہ کر سکا۔ اب جبکہ دسمبر اپنے سفر کے آخری عرشے میں داخل ہو چکا ہے کتاب کمپوز ہو چکی ہے۔ کتابت کا ڈھیر میرے سامنے ہے اور میں بطور پیش لفظ یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

اس منصوبے کی مذکورہ بالا پانچ شخصیات کو کل نہ سمجھ لینا چاہیے کہ جمعیت علماے ہند کے دایرے میں نہ کوئی اور صاحب فکر و عزیمت ہے، نہ کسی نے قوم و ملت اور سیاست و مذہب کی کوئی خدمت انجام دی تھی۔ کل ہند پاکستان اور صوبائی ...... ہر دو سطح پر جمعیت علماے ہند کے

نظام فکر وعمل میں کئی شخصیات ایسی ہیں جن کی خدمات کو نظر انداز کردینا جمعیت کی سیاسی تاریخ میں ظلم سے کم نہ ہوگا۔ ان شخصیات کی خدمات کے اعتراف اور تذکرے کے بغیر جمعیت علماے ہند کے تاریخی سیاسی کردار اور دینی خدمات کا نقش پوری طرح اُجاگر نہیں ہوسکتا۔ مثلاً مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری کے فکر وتدبر اور ان کی سیاسی خدمت کا میرے قلب پر خاص اثر ہے۔ ان کی خدمات کا دائرہ مقامی سطح سے لے کر کل ہند سطح تک وسیع ہے لیکن میں نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ اپنی محدود صلاحیت اور ہمت کے مطابق بنایا تھا۔ اس لیے کہ مجھے اپنے شوق کے سوا نہ کوئی رہنمائی میسر تھی نہ تعاون! حال آں کہ پیش نظر محدود دائرے میں بھی یہ کسی ایک شخص کے بس کا کام نہ تھا۔ البتہ اب میں نے اپنے منصوبے عزیز گرامی فاضل وحافظ تنویر احمد شریفی کو سمجھا دیے ہیں اور مجھے ان کے ذوق وصلاحیت سے اُمید ہے کہ وہ ان کاموں کو بہ حسن وخوبی انجام دے سکیں گے۔ میں بہ قدر ہمت واستعداد ان کے ساتھ تعاون کروں گا۔ اب میرے سامنے اپنے پچھلے کاموں کو سمیٹنے کے سوا کوئی اور منصوبہ نہیں۔ عزیز موصوف کے سامنے جو پہلا منصوبہ ہے اور جس کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کا عنوان ''جمعیت علماے ہند کی کارفرما شخصیات'' ہے۔ اس منصوبے میں مرکزی شخصیات کے علاوہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی کم از کم دس شخصیات لازماً صوبوں کے حدود سے منتخب کی جائیں گی۔ میں نے آں عزیز سے گزارش کی ہے کہ وہ دہلی کے حالیہ سفر میں جو امیر الہند فداے ملت مولانا سید اسعد مدنی رحمہ اللہ سیمینار مورخہ ۱۰/۱۱/۱۲ فروری ۲۰۰۷ء میں شرکت کے لیے درپیش ہے۔ جمعیت علماء کے دائرۂ فکر کے اصحاب راے سے مشورہ کر کے منصوبے کو آخری شکل دیں۔

زیر نظر تالیف کی موضوع شخصیت ''سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمہ اللہ'' جمعیت علماے ہند کے رکن رکین تھے۔ وہ دہلی اور امرتسر کی ان ابتدائی مجالس میں شریک تھے جن میں جمعیت کے قیام کا فیصلہ، مقاصد ودائرۂ عمل کا تعین اور قواعد وضوابط کی تالیف ومنظوری کی کارروائی عمل میں آئی تھی۔ اس طرح وہ اصحابِ نظر اور اہل ہمت علماے کرام کی اس جماعت میں شامل ہیں جس نے جمعیت علماے ہند کی کممل شجرۂ طیبہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان کا شمار اہل علم ونظر میں بھی ہوتا ہے اور اصحاب عزیمت میں بھی۔ وہ رجال کار کی صف اوّل میں شامل

تھے۔ وہ اپنے وقت کے ادیب و خطیب بھی تھے اور بلند پایہ مفسر قرآن بھی! وہ بہ یک واسطہ مفتی اعظم ہند حضرت شیخ الہند (رحمہما اللہ) سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ وہ علمائے حق کی صف میں شامل ہی نہیں ان میں اپنی پہچان اور امتیاز رکھتے ہیں۔

مسلم لیگ کے طرزِ سیاست کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء میں نفرت، غصے اور اشتعال کے جو آگ بھڑکی تھی اور جس کا ایندھن صرف مسلمان بن رہے تھے۔ حضرت دہلوی نے اس سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ لیا تھا۔ اصحاب بدر کے لیے ایک بار آسمان کی کھڑکی کھلی تھی اور ان کے عمل عظیم پر انھیں اگلے اور پچھلے گناہوں کی بخشش ونجات کی خوشخبری سنائی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ایک بار آسمان دہلی کی کھڑکی بھی کھلی ہوگی اور جو لوگ مسلمانوں کی عزت و ناموس اور جان و مال کو بچانے کے لیے اپنی جانوں کو حقیر سمجھ کر اور پروا کیے بغیر دیوانہ وار نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ان کو بھی بخشش ونوال کی خوشخبری سنائی گئی ہوگی! اور کیا تعجب کہ وہ جو "عم نوالہ" ہے اس کا فضل ورحمت ان لوگوں کی حیاتِ مابعد تک پھیل گئی ہوگی، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں اپنی بخشش ونوال کو دنیا کی زندگی اور اس کے عیش و راحت میں رکھ دیا ہے۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ (۹۹:۷،۸) "جنھوں نے بحکم خداوند نہ سہی بہ طورِ انسانیت واخلاق عامہ کے 'تعاونوا علی البر و التقویٰ (۲:۵) کا عمل صالح انجام دیا تھا، وہ اپنے اس نیک عمل کے اجر سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں!

افسوس کہ حضرت دہلوی پر کوئی علمی و تحقیقی کام نہیں ہوا۔ ان پر چند مضامین کے سوا کوئی سرمایہ علم وادب اور ان کی خدمات ومقام میں کوئی تذکرہ موجود نہیں۔ چند مضامین ہیں ان سے آپ زیرِ نظر مجموعے میں لطف اندوز ہوسکیں لیکن ان پر اس پہلو سے جو تحقیق ہونا چاہیے تھا اس پر کسی نے توجہ نہیں کی اور یہ شکوہ شکوۂ عام ہے۔ بہتوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میرا ذوق وعمل ایک محدود دائرے کی چیز ہے۔ میں نے جس بات کا شکوہ کیا ہے اس کا تعلق سیاسی فکر وعمل اور سیاسی خدمات سے ہے۔ یہ ذوق عام اور بازار میں چلتا ہوا سکہ نہیں۔ اس لیے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مولانا دہلوی کے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہوا تو سرِ

تسلیم خم ہے، لیکن مولانا تو ادبی شخصیت بھی تھے اور ادیب بھی بلند پایہ تھے۔ ان کا خاندان دہلوی کے ان مخصوص خاندانوں میں سے تھا جن کی زبان کا سکہ روز بازار اُردو میں چلتا تھا۔ جن کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان کہلاتی تھی۔ جن کی زبان کی مثالیں دی جاتی تھیں اور جن کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ، جملے تراکیب، لہجے کو معیار اور سند سمجھا جاتا تھا۔ وہ اُردو کے ادیب اور انشاپرداز تھے۔ ان کے خطوط ان کی ٹکسالی زبان کا خزینہ ہیں۔ ان میں محاورہ و بول چال کی زبان کی عمدہ مثالیں ہیں اور ان میں تاریخ و سیاسیات کے واقعات کے بھی مستند حوالے ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کے خطوط سیاسی نہیں زبان وادب اور لسانیات کا سرمایہ ہیں لیکن کسی ادبی نقاد نے ان خطوط سے التفات نہیں کیا۔ نہ ان خطوط کی زبان و بیان اور ادبی خصایص پر نقد و تبصرے کی نظر ڈالی اور نہ ان کی بنیاد پر مکتوب نگار کے ادبی مقام کی تلاش اور تعین کی کوشش کی؟

ہمیں افسوس ہے کہ اس لحاظ سے بھی ہمیں ہر طرف سناٹا اور سکوت چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ جب تک کوئی شخص افسانہ، ڈراما، ناول، خاکہ وغیرہ نہ لکھے اسے ادیب اور انشاپرداز تسلیم نہ کیا جائے گا؟

حضرت سحبان الہند اور ان کے علمی اور قومی و ملی کاموں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا اور اب تو سیاست و مذہب اور ادب کے میدانوں میں لوگ انھیں بھول ہی گئے۔ البتہ اس مجموعے میں سوانح و شخصیت بھی ہے اور دینی خدمات اور تفسیر میں ان کی خصوصیات کا ذکر بھی آیا ہے، لیکن میرا موضوع ''سیاسی افکار و خدمات'' ہے اور میں نے اس مجموعے میں ان کے آثارِ علمیہ اور ان کے تذکرے کے لیے ایسے ہی مضامین کا انتخاب کیا ہے جن سے ان کے سیاسی ذوق، سیاسی شعوری اور سیاسی فکر و رجحان اور اسی میدان میں ان کی خدمات کا نقش اُجاگر ہو اور سیاسیات ہند اور تاریخی سیاسیاتِ ملّی میں ان کے مقام کو بھی متعین کیا جاسکے لیکن یہ فیصلہ کہ میں اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یا ناکام رہا ہوں قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں۔ اگر فیصلہ یہ ہو کہ میں اپنے مقصد میں کسی ادنیٰ درجے میں بھی کامیاب ہوا ہوں تو میں اسے اپنی بڑی کامیابی تصور کروں گا۔

ابوسلمان

۲۹ دسمبر ۲۰۰۶ء

Scanned by CamScanner

حصہ اوّل:

مقالات

سوانح، شخصیت

سیرت اور افکار وخدمت

مولانا احمد سعید

(دو قلمی خاکے)

(خواجہ حسن نظامی دہلوی)

گورا رنگ، دراز قد، کتابی چہرہ، خندہ پیشانی، پہلے بہت دبلے تھے، اب بہت موٹے ہیں، عمر تیس سے زیادہ۔ دہلی میں مکان ہے اور قدیم سے یہیں کے رہنے والے ہیں۔ طالبعلمی کے زمانے سے تقریر کا شوق تھا۔ اب تمام دہلی میں ان کے برابر کوئی خوش بیان اور عام فہم وعظ کہنے والا مولوی نہیں ہے۔ عقاید دیوبندی ہیں۔ مزاج میں شگفتگی اور ملنساری ہے۔ تحریک خلافت کے زبردست حامی ہیں۔ بڑے بڑے کام کر چکے ہیں اور اسی وجہ سے بہت عرصے تک جیل خانے میں رہے۔

باوجود عام ہر دلعزیزی کے غرور وخود پسندی سے پاک ہیں۔ ہر ادنیٰ واعلیٰ سے خلوص کے ساتھ ملتے ہیں۔ (۱۹۲۲ء)

(۲)

گورا رنگ، لمبوترا چہرہ، بھاری جسم، موزوں آنکھیں، بڑی ڈاڑھی، آواز بلند، عمر چالیس سے زیادہ، دہلی کے قدیمی باشندے، جمعیت علماے ہند کے ناظم، دہلی کے نہایت خوش بیان واعظ، خلوت میں کچھ اور جلوت میں کچھ اور!

ان کے وعظ میں ظرافت اور بذلہ سنجی اور بے باکی ہوتی ہے اس لیے ہر جگہ پسند کیا جاتا ہے۔

وہ خانگی بات چیت میں بھی بہت خوش طبع ہیں اور ہر وقت بشاش نظر آتے ہیں۔ دل میں کچھ اور ہوتا ہے، کہتے کچھ اور ہیں۔

ان کے سیاسی خیالات کانگریس کے حامی ہیں۔ اس لیے کئی بار جیل خانے جا چکے ہیں۔

وہ حاجی ہیں، عالم ہیں، حافظ قرآن ہیں۔ بہت سادگی اور بے تکلفی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

مولانا احمد سعید دہلوی

(مولانا حفیظ الرحمٰن واصف)

پیدائش:

مولانا مرحوم کا سن پیدائش ۱۳۰۶ھ ہے۔ یہ خود مولانا مرحوم نے راقم الحروف کو بتایا تھا۔ فرماتے تھے کہ دن اور تاریخ معلوم نہیں مگر مہینہ ربیع الثانی کا تھا۔ از روئے تقویم یہ دسمبر ۱۸۸۸ء کے مطابق ہے۔ یکم ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ کو ۵ دسمبر ۱۸۸۸ء ہوتی ہے۔ شمسی حساب سے پیدائش کا مہینہ بھی دسمبر ہے اور وفات کا بھی دسمبر۔ اس حساب سے اکہتر سال کی عمر پائی اور قمری حساب سے تہتر سال سے کچھ زائد عمر پائی۔ مولد ومنشا کوچہ ناہر خاں دریا گنج دہلی ہے۔

خاندان:

آپ کے والد حافظ نواب مرزا زینت المساجد میں منصب امامت پر فائز تھے اور مکتب بھی پڑھاتے تھے۔ آپ کے دادا خواجہ نواب علی دلی شہر کے مشہور صوفی و خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ کے بزرگوں کو جلال الدین اکبر بادشاہ نے عرب سے کشمیر میں بلایا تھا۔ شاہجہاں بادشاہ کے زمانے میں یہ خاندان کشمیر سے آگرہ آیا اور کچھ عرصے وہاں رہ کر دہلی میں منتقل ہوا اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے تک کشمیری کٹرہ میں سکونت پذیر تھا۔ کشمیری کٹرہ لال قلعے کے سامنے پتھر والے کنوئیں کے میدان میں (یاریکرونگ آفس کے آس پاس) آباد تھا۔ انگریزوں نے دلی کو فتح کرنے کے بعد کشمیری دروازہ سے لے کر دلی دروازہ تک کی آبادی کو مسمار کر دیا۔ اس کی زد میں یہ کشمیری کٹرہ بھی آ گیا۔ آپ کے آباؤ اجداد کو مغل دربار میں رسائی حاصل تھی اور خواجہ زادہ مغل کا خطاب عطا ہوا تھا۔

ابتدائی تعلیم:

آپ نے ابتدائی تعلیم مولوی عبدالمجید مصطفیٰ آبادی سے حاصل کی اور تکمیل حفظ قرآن کی دستار بندی مدرسۂ حسینیہ بازار مٹیا محل میں ہوئی۔

مدرسۂ حسینیہ کو ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں مولانا محمد حسین فقیر رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادوں مولانا محمد ابراہیم وغیرہ نے شیخ کریم بخش ساکن ترکمان دروازہ اور دیگر مسلمانوں کے چندہ سے تعمیر کیا تھا۔ وہاں مولانا محمد حسین فقیر کا وعظ ہوتا تھا۔ غالباً ۱۳۲۳ھ میں ان کی وفات ہوئی تو ان کے صاحبزادے مولانا محمد ابراہیم کا وعظ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مولانا احمد سعید کی عمر ۱۶/۱۷ برس کی ہوگی۔ آپ مولانا فقیرؒ کے اور ان کے بعد مولانا راسخ اور مولانا محمد ابراہیم کے وعظ سنتے تھے۔

مولانا فقیر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں بڑے صاحبزادے مولانا حبیب الرحمٰن اور ان سے چھوٹے مولانا عبدالرحمٰن راسخ پہلی بیوی کی اولاد تھے اور دوسری بیوی کی اولاد میں مولانا محمد ابراہیم بڑے اور مولانا محمد اسحاق چھوٹے تھے۔ مولانا راسخ فن شعر و سخن کے بھی امام تھے اور وعظ و تقریر میں بھی یگانہ روزگار تھے۔ ان کا وعظ اردو بازار کی مسجد میں بعد نماز جمعہ ہوا کرتا تھا۔ یہ مسجد اب مولانا احمد سعید کی مسجد کہلاتی ہے۔ پہلے بہت مختصر تھی۔ مولانا راسخ کے انتقال کے بعد اس میں مولانا احمد سعید کے وعظ شروع ہوئے۔ پھر مسجد کی توسیع اس طرح ہوئی کہ پڑوس میں ایک حاجی عبدالوہاب رہتے تھے انھوں نے اپنا آدھا مکان مسجد کو دے دیا۔ اس کو شامل کر کے مسجد کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔

وعظ گوئی کا آغاز:

جب آپ مولانا راسخ کے واعظ سنتے تھے تو چونکہ آپ کے اندر فطرۃً جوہر قابل موجود تھا، وعظ سنتے سنتے خود بھی وعظ کہنے لگے۔ علمی قابلیت حفظ قرآن سے آگے نہ تھی۔ لکھنا بھی غالباً نہیں آتا تھا۔ مدرسۂ حسینیہ میں مولانا محمد ابراہیم کا اور مدرسہ حسین بخش میں مولانا کرامت اللہ خاں کا وعظ ہوتا تھا۔ مولانا کرامت اللہ خاں اگرچہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ

علیہ کے شاگرد تھے۔ مگر رضا خانیت کی طرف میلان زیادہ تھا دونوں حضرات اپنے اپنے وعظوں میں اختلافی مسائل بیان کرتے اور ایک دوسرے کا رد کیا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں سماع موتی کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ بڑے زور کی جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ مدرسۂ حسینیہ میں تعلیم پانے والے لڑکے بھی اس قسم کے معرکوں کو نقل کر کے مناظرہ سیکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا احمد سعید مولوی محمد ابراہیم بنتے تھے اور صوفی حکیم ممتاز احمد ہاشمی (مولانا احمد سعید کے برادر نسبتی) مولوی کرامت اللہ خاں کا پارٹ ادا کرتے تھے۔ دونوں کھڑے ہو کر مناظرہ کرتے تھے۔

اُس زمانے میں وعظ و تذکیر کا طریقہ عصر حاضر سے کچھ مختلف تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں وعظ اور مولود شریف کی محفلیں منعقد کیا کرتے تھے۔ وہ محض محفلیں ہی ہوتی تھیں ان کو جلسہ نہیں کہا جا سکتا اور غالباً لفظ جلسہ جو مفہوم اب رکھتا ہے وہ اس زمانے میں نہیں تھا۔ کیونکہ ان محفلوں کے لیے عام پوسٹر شائع نہیں کیے جاتے تھے۔ صرف محلے میں زبانی اعلان کرا دیا جاتا تھا یا کچھ مسجدوں میں خاص خاص علماء کا وعظ مقرر تھا۔

ابتدائی مشاغل:

شروع شروع میں مولانا کو ایسی ہی محفلوں میں بلایا جاتا تھا۔ بعد میں کوچہ چیلاں کی مسجد جواب مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ کی مسجد کہلاتی ہے اس میں بھی مولانا نے ہر جمعرات کو وعظ کہنا شروع کیا۔ ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا:

> ”بھئی! ہماری زندگی تو شروع سے ہی قلندرانہ زندگی ہے۔ جب ہم کسی کے گھر پر جا کر وعظ کہتے تھے تو دو روپے نذرانہ ملتا تھا۔ کچھ تارکشی کا کام کر لیتے تھے اس طرح عسرت کے ساتھ گزر بسر ہوتی تھی“۔

گوٹہ ٹھپہ وغیرہ میں جو چاندی یا سونے کا یا تانبہ کا ملمع شدہ تار استعمال کیا جاتا ہے آج کل مشینوں سے باریک کیا جاتا ہے۔ اب سے چالیس سال قبل یہ مشینیں نہیں آئی تھیں۔ دو چرخیاں ہوتی تھیں جو ایک چوکی پر لگی ہوتی تھیں۔ بائیں ہاتھ کی چرخی پر تار لپٹا ہوا ہوتا تھا۔ دائیں ہاتھ کی چرخی کو ایک فولادی کیل کے ذریعے ہاتھ سے گھمایا جاتا تھا۔ بیچ میں بارہ لگا ہوتا تھا۔ تار اس میں سے کھنچتا ہوا دائیں ہاتھ کی چرخی پر منتقل ہوتا تھا بارہ ایک گول لکلی پیتل کی بنی

ہوئی ہوتی ہے جس کے بیچ میں ہیرے وغیرہ کا چھوٹا سا سوراخ دار جوئل ہوتا ہے اس میں سے تار کو نکال کر کھینچتے اور باریک کرتے ہیں۔ غرضکہ یہ محنت طلب طریقہ تھا تارکشی کا اور آپ کے والد بھی یہ کام کرتے تھے۔ مولانا کا نوعمری کا زمانہ تھا جب کہ آپ کے والد کی وفات ہوگئی اور متعلقین کی کفالت کا بار آپ کے ہی کندھوں پر آ گیا۔

مناظروں کا دور:

ہندوستان پر جب انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو انھوں نے ایک طرف تو عام مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ دوسری طرف یہ کیا کہ سیاسی اثر ڈالنے کے لیے انگریزی کالج کھولنے شروع کیے اور ان میں اپنی مرضی کا نصاب تعلیم رائج کیا اور مذہبی و دینی حیثیت سے ذہنوں کو مسخ کرنے کے لیے عیسائی مشن بھیجنے شروع کیے۔ تبدیل مذہب کے لیے ان کا طریقہ یہ تھا کہ روپے اور نوکریوں اور لڑکیوں کا لالچ دے کو عیسائی بناتے تھے اور اس مہم پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ قابل اور مستعد پادری ہندوستان میں آ کر اُردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اُردو میں تقریر کرنے کی مشق کرتے تھے اور عام مجموعوں میں اسلام پر اعتراضات کرتے تھے اور خوب کیچڑ اُچھالتے تھے۔ علمائے اسلام نے جوابی تقریریں شروع کیں اور مناظروں کا دور شروع ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں علمائے اسلام پر جو بیتی اس کی داستان بڑی دردانگیز ہے۔ تاریخ کے اوراق اس کے گواہ ہیں کہ حکومت متسلطہ نے ان کو بالکل پیس ڈالا تھا اور صدیوں تک کے لیے اُبھرنے کی سکت نہ چھوڑی تھی۔ انگریز بڑی دانا قوم ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جتنی قوت وشدت سے ان کو برباد کیا گیا ہے یہ اتنی ہی قوت سے اُبھریں گے اور ممکن ہے کہ جلد اُبھریں پادریوں کو بھیج کر ان کو مناظرے میں اُلجھا دیا۔ بہر حال اس یورش کا مقابلہ کرنا علماء کا ایک اہم فریضہ تھا۔ انہوں نے پوری جواں مردی و ہمت سے اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ پادریوں سے مقابلہ ہو ہی رہا تھا کہ آریوں نے بھی وار کرنے شروع کر دیے اور کچھ عرصے کے بعد ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی۔ پادریوں اور پنڈتوں سے عوام بھڑکتے تھے۔ کیونکہ وہ غیر مذہب لوگ تھے اور پادری تو ویسے بھی سات سمندر پار سے آئے تھے۔ اس لیے تبدیل مذہب میں

کچھ نمایاں کامیابی نہ ہوئی۔ اب اسلام کی گود میں ہی پرورش پایا ہوا ایک مور ما مودار ہوا جس نے پہلے مجددیت کا اور پھر پیغمبری کا دعویٰ کیا اور اسلام کی تبلیغ کے عنوان سے بعلی کھونسہ بن کر ہزاروں مسلمانوں کو مرتد کر کے سلطنت برطانیہ کا وفادار بنایا۔ (عیسائی مشنریوں کی مکمل تاریخ کتاب ''فرنگیوں کا جال'' مصنفہ مولانا امداد صابری کے صفحات پر ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے)۔

علماء ان طوفانوں کا مقابلہ بھی کر رہے تھے اور استخلاص وطن کی جدوجہد میں بھی مصروف تھے۔ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتفاق و اتحاد کی فضا ہموار ہو چکی تھی کہ انگریزوں نے ایک اور بھرپور وار کیا۔ یعنی ۱۹۲۲ء میں شدھی کا طوفان بڑے زور و شور سے اُٹھا اور اس نے ہندو مسلم اتحاد کے ٹکڑے اُڑا دیے۔ غرضکہ علماء کو اس طوفانی عہد سے واسطہ پڑا تھا۔ استخلاص وطن کی جدوجہد کے ساتھ اسلام اور شعائر اسلام کی حفاظت کے لیے بھی چومکھی لڑ رہے تھے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں چاندنی چوک بازار میں کوتوالی کے سامنے فوارہ نارتھ بروک کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر عیسائی پادری تبلیغی تقریریں کیا کرتے تھے۔ (اب فوارہ کی سیڑھیاں توڑ دی گئی ہیں اور سڑک کی سطح بھی اُونچی ہو گئی ہے) عیسائیوں میں سے زیادہ تر احمد مسیح اور ہندوؤں میں سے زیادہ تر پنڈت رام چندر لکچر دیتے تھے۔ سرکاری پابندی کے مطابق ایک دن ایک ہی فرقے کے مقرر لکچر دے سکتے تھے۔ علمائے اسلام کے لیے بھی ایک دن مقرر تھا۔ اس قسم کی تقریریں گھنٹہ گھر کے نیچے بھی ہوتی تھیں اور ان میں مولانا اشرف الحق (مولانا امداد صابری کے والد جو صاحب حال و قال بزرگ تھے اور مولوی لٹھ کے خطاب سے مشہور تھے) اور مولوی حفیظ اللہ خاں اور دیگر علماء حصہ لیا کرتے تھے۔ یہ اجتماعات بالعموم شام کے وقت ہوتے تھے۔

عربی تعلیم کی ابتدا:

غالباً ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک کا زمانہ تھا جبکہ مولانا کی عمر بیس بائیس برس کی ہوگی۔ آپ بھی کبھی کبھی فوارہ پر تقریر کرتے تھے۔ سامنے نواب روشن الدولہ کی سنہری مسجد میں مدرسہ امینیہ تھا اور حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ اس کے صدر مدرس تھے۔ مدرسے کے طلبہ بھی ان تقریروں میں آ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ انھیں میں سے حضرت مفتی اعظمؒ کے ایک ہونہار

ذی استعداد اور منتہی شاگرد مولانا قاری حافظ محمد یاسین سکندر آبادی بھی تھے۔ یہ مدرسۂ حسینیہ میں بھی کبھی کبھی چلے جاتے تھے اور مولوی احمد سعید سے واقف تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک مرتبہ مولانا احمد سعید کی تقریر کی تعریف سنی تو اپنے شاگرد سے کہا کہ اس نو جوان واعظ سے کسی وقت پوچھنا کہ اس نے کہاں پڑھا ہے اور کہاں تک پڑھا ہے؟ قاری صاحب موصوف وعظ میں شریک ہوتے ہی تھے ختم ہونے پر نو جوان واعظ کے ساتھ ہو لیے۔ راستے میں پوچھا کہ مولوی صاحب! آپ نے کہاں پڑھا ہے؟ قاری صاحب موصوف ایک طالب علم تھے اور نو جوان واعظ کو کم سے کم دار العلوم دیوبند کا فاضل ترین فیض یافتہ خیال کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ استاد محترم نے یہ خدمت کیوں میرے سپرد کی ہے؟

غرضکہ مولانا نے قاری صاحب کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھا دیا اور اصل بات کا جواب نہیں دیا۔ دوسرے دن پھر پوچھا مگر بات کو پھر ٹال دیا گیا۔ یہ ٹالتے رہے وہ پوچھتے رہے اور آخر نو جوان واعظ نے ایک دن یہ جواب دیا کہ ''مولوی صاحب آپ یہ بات پوچھتے ہیں تو مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ کہیں پڑھا ہو تو بتاؤں۔ بھئی میں نے تو کہیں نہیں پڑھا اور کچھ نہیں پڑھا۔ البتہ پڑھنے کی آرزو ہے۔ قاری صاحب موصوف کو یقین نہیں آیا لیکن کچھ عرصے میں تعلقات بڑھے۔ زیادہ میل جو ہوا تو قاری صاحب کو معلوم ہو گیا کہ واقعی یہ اَن پڑھ ہیں۔ پھر انھوں نے مولانا کو رائے دی کہ آپ مدرسۂ امینیہ میں داخلہ لے لیجیے اور علم حاصل کیجیے۔ مولانا نے کہا کہ بھئی مولوی صاحب! میں کیونکر پڑھ سکتا ہوں۔ والد کے انتقال کے بعد سے گھر بار کا سارا بوجھ مجھ پر ہے۔ شادی بھی ہو چکی ہے۔ دن بھر محنت کرتا ہوں جب کہیں جا کر کام چلتا ہے اور آذوقہ نصیب ہوتا ہے ان حالات میں داخلہ لے کر پڑھنے کی فرصت کہاں؟

مگر اُن کا پڑھانا اور اِن کو پڑھنا مقدر تھا۔ قاری صاحب نے اپنے استاد محترم سے اجازت لے کر مولانا کے گھر جا کر رات کے وقت پڑھانا شروع کر دیا۔ مگر چونکہ اس صورت میں قاری صاحب کا ہرج ہوتا تھا وہ خود بھی پڑھتے تھے۔ اس لیے مولانا سنہری مسجد میں ہی جا کر رات کو ان سے پڑھنے لگے۔ ہوتا یہ تھا کہ دن میں مولانا مال تیار کر کے شام کو فتح پوری بازار کے دکانداروں کو دیتے ہوئے سنہری مسجد میں آ جاتے تھے اور سبق پڑھ کر گھر جاتے تھے۔ ایک

سال تک قاری صاحب نے ان کو پڑھایا اور جب ابتدائی کتابیں نکلوا چکے تو باضابطہ مدرسۂ امینیہ میں داخلہ کرا دیا۔ یہ مولانا محمد یاسین وہی ہیں جن کو حضرت مفتی اعظمؒ نے رائے پور (سی پی) میں بھیج دیا تھا۔ آپ نے وہاں مدرسۂ اسلامیہ قائم کیا اور آخر دم تک اس کے مہتمم اور صدر مدرس رہے اور جمعیۃ علمائے سی پی کے صدر بھی رہے اور یہ واقعہ مجھے قاری صاحب موصوف نے خود ہی سنایا تھا۔

مدرسے میں مولانا کا داخلہ شوال ۱۳۲۸ھ میں ہوا اور شرح مائۃ عامل مفید الطالبین وغیرہ اسباق شروع ہوئے مولانا کی سند میں مندرجہ ذیل کتابیں درج ہیں۔

تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، صحاح ستہ اور مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر، قدوری، کنز الدقائق، شرح وقایہ، ہدایہ اولین، ہدایہ آخیرین، اصول الشاشی، نور الانوار، توضیح تلویح، ایسا غوجی، مرقاۃ، شرح تہذیب، قطبی، ملاحسن، حمد اللہ، مناظرہ رشیدیہ، ہدیۂ سعیدیہ، میبذی، مختصر المعانی، مطول، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، قلیوبی، سبعۃ معلقہ، دیوان متنبی۔

مولانا فرماتے تھے کہ مدرسے کے علاوہ میں نے خارج وقت میں کچھ گھر پر کچھ مدرسے میں حضرت مفتی صاحب سے اور بھی کتابیں پڑھی ہیں۔ راقم الحروف کو ان کتابوں کے نام بھی بتائے تھے۔ ان میں سے صرف فتح الباری کا نام یاد ہے جس کا آخری پارہ ملتان جیل میں پڑھا۔ مولانا کے دیگر اساتذہ حضرت مولانا حافظ محمد ضیاء الحق دیوبندی، مرحوم مولانا محمد قاسم دیوبندی مرحوم، مولانا سید انظار حسین ہنس پوری مرحوم وغیرہ تھے۔

مدرسے میں باضابطہ داخلہ کے بعد تارکشی کا کام چھوٹ گیا تھا اور وعظ و تبلیغ کے نذرانوں سے ہی گزر بسر ہوتی تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت مفتی صاحب کے حکم سے وعظ کا نذرانہ لینا بالکل بند کر دیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد کٹرہ ہدو محلّہ فراش خانہ کی مسجد میں آپ نے ترجمہ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ روزانہ صبح کو آپ وہاں جا کر ترجمہ بیان کرتے تھے۔ وہاں سے مبلغ ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ شروع میں سواری کے لیے ڈولی کا انتظام تھا۔ آپ ڈولی میں جایا کرتے تھے۔ پہلے زمانے میں مردوں کی سواری کے لیے بغیر پردے کی ڈولی یا

یکے ہوتے تھے اور عورتوں کے لیے پردے دار ڈولی۔ تانگہ بعد میں ایجاد ہوا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ نے یکہ خرید لیا تھا۔ ایک ترجمہ غالباً چودہ برس میں مکمل ہوا۔

قرآن شریف کا ترجمہ بیان کرنے کا رواج پہلے زمانے میں کچھ زیادہ نہیں تھا۔ غالباً صرف ایک جگہ یعنی مسجد نواب قاسم جان میں مولانا راسخ ترجمہ بیان فرماتے تھے۔ ان سے پہلے نواب قطب الدین خاں مصنف مظاہر حق کا نام سنا جاتا ہے۔

سرکار نظام سے مولانا کو مبلغ ۱۲۵ ماہانہ کا منصب بھی عطا ہوا تھا جو کئی برس تک جاری رہا۔ مگر تحریک خلافت میں کھلم کھلا حصہ لینے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ جب آپ پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہو کر دہلی کے دوسرے سیاسی قیدیوں مثلاً مولانا عبداللہ چوڑی والے وغیرہ کے ساتھ میانوالی جیل میں بھیج دیے گئے تھے تو شہر دہلی کے بعض متمول حضرات نے آپ کے اہل و عیال کے لیے کچھ وظائف مقرر کر دیے تھے۔ بھائی حاجی نذیر احمد میرٹھی وہ وظائف وصول کر کے گھر پہنچا دیا کرتے تھے۔

عربی تعلیم سے فراغت:

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولانا کو حضرت مفتی صاحب نے بطور معین مدرس کے مدرسے میں مقرر کیا اور کچھ ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لیے دے دیں۔ اکابر مدرسہ کا معمول تھا کہ جو طلبہ ذی استعداد ہوتے تھے ان کو تعلیمی ٹریننگ دینے کے لیے مدرسے میں ابتدائی درجوں کا مدرس بنا دیا جاتا تھا۔ یہ بالعموم بلا تنخواہ ہوتے تھے اور جب کسی مدرس کی جگہ خالی ہوتی تھی تو مدرسے میں ہی ان کو باضابطہ منصب مل جاتا تھا یا ایسا ہوتا تھا کہ ضرورت مدرس کے متعلق کوئی ذمہ کہیں سے آتا تھا تو ٹرینڈ معین مدرس کو وہاں بھیج دیا جاتا تھا۔ اس قسم کے معین مدرس سب سے پہلے مولانا حافظ قاری محمد یاسین سکندر آبادی تھے۔ ان کے بعد مولانا حافظ حکیم محمد ابراہیم راندیری۔ مولانا مفتی حافظ سید مہدی حسن شاہجہانپوری، مولوی عبدالمنان آروی، مولانا مفتی محمد عبدالغنی صدر مدرس و صدر مفتی مدرسۂ امینیہ، مولوی مشتاق احمد دہلوی، مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند اور بہت سے حضرات کے نام مدرسے کی رودادوں میں ہیں۔

مولانا کئی سال تک مدرسے کی تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے اور ایک مربی کامل کی

نگرانی میں یہ جوہر قابل جلا پاتا رہا۔ وہ علمی خزانہ جو اندر بھرا جا چکا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اب مولانا کی تقریر اُڑائی ہوئی تقریر نہ تھی بلکہ ٹھوس مدلل مربوط ہونے کے ساتھ زبان کی لطافت و شیرینی اور فصاحت و بلاغت کا اُمنڈتا ہوا دریا تھا۔

مناظرے کی تربیت:

یہ مناظروں کا دور تھا۔ اس دور میں مولانا نے زبردست اور معرکۃ الآرا مناظرے کیے۔ اس وقت آریوں میں بھی بڑے بڑے فاضل مناظر اور خطیب موجود تھے۔ پنڈت رام چندر دہلوی کا نہ صرف دہلی میں بلکہ ہندوستان بھر میں طوطی بول رہا تھا۔ قرآن مجید عمدہ پڑھتا تھا اور بڑا طرار و لسان تھا۔ مولانا نے اس سے بھی مناظرے کیے اور مولانا کی خطابت سب پر غالب رہی۔

مناظروں کے لیے پنڈال بنائے جاتے تھے۔ تیس چالیس ہزار تک کا مجمع ہوتا تھا۔ دور دور کے شہروں سے لوگ سننے کے لیے آتے تھے۔ آمنے سامنے دو اسٹیج اتنے فاصلے پر بنائے جاتے کہ ایک اسٹیج پر بولنے والے کی آواز دوسرے اسٹیج تک پہنچ جائے۔ لاؤڈ اسپیکر اس زمانے میں نہیں تھا۔ بیچ میں اور چاروں طرف مجمع ہوتا تھا۔ اسٹیج پر دو آدمی بیٹھے تھے۔ ایک مناظر اور ایک معاون۔ معاون مناظر کی رہنمائی اور امداد کرتا رہتا تھا۔ اس کو ضروری نکات یاد دلاتا تھا۔ کتابوں کے حوالے نکالتا تھا۔ مناظر کھڑا ہو کر بولتا تھا۔ اسی طرح باری باری سے دونوں مناظر تقریر کرتے تھے۔

مولانا احمد سعید جب مناظرہ کرتے تھے تو ان کے معاون حضرت مفتی اعظمؒ ہوتے تھے۔ یاد رہے کہ خود حضرت بھی اپنے ابتدائی عہد میں زبردست مناظر تھے۔ آپ نے ۱۳۲۱ھ میں شاہجہانپور سے ایک ماہانہ رسالہ بھی جاری کیا تھا جس کا نام البرہان تھا۔ اس میں قادیانیت کا رد کیا جاتا تھا۔

مولانا احمد سعید کی شیریں بیانی اور حضرت مفتی صاحب کی اعانت گویا سونے پر سہاگہ تھا۔ اس طرح مولانا نے بڑے بڑے میدان جیتے۔ ان مناظروں نے مولانا کے انداز بیان کو نقطۂ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ مولانا کی ظرافت مناظرے میں بھی اپنا رنگ دکھاتی اور مجمع کو ہنساتی تھی۔

ایک مرتبہ پنڈت مراری لال سے مناظرہ ہوا۔ آپ نے دوران تقریر میں کہا کہ

''پنڈت جی! میں سنسکرت سے واقف نہیں ہوں۔ آپ کے نام میں مجھے غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آپ کا نام میم کے پیش سے ہے یا زبر سے؟

ایک مرتبہ پنڈت رام چندر دہلوی سے مناظرہ ہو رہا تھا۔ پنڈت جی نے کہا ''مولوی جی! یہ دلیل ہے دلیل تانبے یا چاندی کا تار نہیں ہے جس کو آپ کھینچ تان کر بڑھا لیں اور اپنے مطلب کا بنا لیں۔ یہ دلیل ٹس سے مس نہ ہوگی''۔ مولانا نے اپنی باری پر فرمایا ''پنڈت جی! میری دلیل برہان قطعی ہے۔ یہ سونے کی ڈلی نہیں ہے فولاد ہے۔ یہ آپ کی کھٹ کھٹ سے نہیں پچکے گی۔ (واضح ہو کہ پنڈت جی سنار کا کام کرتے تھے)۔

ایک مناظرہ میں جو چاوڑی بازار دہلی میں ہوا تھا۔ پنڈت رام چندر نے سوال کیا کہ ارادہ کی تعریف کیا ہے؟ مولانا چونکہ معقولات میں اور علم کلام میں بھی کچھ کمزور تھے۔ کھڑے ہونے سے پہلے حضرت مفتی صاحب سے دریافت کیا۔ مفتی صاحب نے اس سوال کی گہرائی بتائی اور جواب تعلیم فرمایا۔ پنڈت جی بولے ''ہاں! خوب کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ مولوی جی! بالکل خالی ہو گیا؟ مولوی کفایت اللہ سے پوچھ کر جواب دو گے؟'' مولانا نے فوراً جواب دیا۔ ان کی جوتیوں کا صدقہ ہی تو ہے کہ میں ڈٹ کر تمہارا مقابلہ کر رہا ہوں اور سامنے کھڑا بول رہا ہوں۔ ان سے نہیں پوچھوں گا تو اور کس سے پوچھوں گا؟ یہ میرے استاد ہیں۔ استاد سے پوچھنے میں تمہیں شرم آتی ہوگی۔ میرے لیے تو ان سے پوچھنا باعث فخر ہے۔

ایک مناظرے میں مقابل نے کہا کہ ''تم کہتے ہو، پیغمبر صاحب پر جبریل کے ذریعے سے وحی آتی تھی۔ تو معلوم ہوا کہ وحی کے لیے واسطے اور ذریعے کی ضرورت تھی۔ مگر ہمارے رشیوں کے ہردے پر بلا واسطہ القا ہوتا تھا''۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے صرف اتنا فرمایا کہ ''ہردے خود ایک واسطہ اور ذریعہ ہے'' یہ اشارہ پا کر اس رہنمائی کی بنیاد پر مولانا نے کھڑے ہو کر جو تقریر کی ہے تو لوگ عش عش کر گئے اور مقابل کو لاجواب ہونا پڑا۔

ایک اور مناظرے میں مقابل نے حضرت مفتی صاحب کی رہنمائی پر تعریض کی تو مولانا نے فرمایا کہ ''پنڈت جی! جو کچھ ہے استاد کا فیض ہے۔ میری تقریر میں تو زبان میری ہے۔ دماغ استاد کا ہے''۔

مستند بغیر سند:

شوال ۱۳۳۱ھ سے مولانا بطور معین مدرس کے مدرسۂ امینیہ میں پڑھا رہے تھے اور خود بھی پڑھ رہے تھے۔ شعبان ۱۳۳۶ھ میں مدرسے سے اپنی تعلیم ختم کر کے فارغ ہوئے مگر چونکہ ملازمت کے لیے کہیں جانا نہیں تھا اس لیے مدرسہ کی مطبوعہ سند حاصل کرنے کا خیال نہیں آیا۔ ۱۹۴۲ء میں جبکہ مسلم لیگ والوں سے نیشنلسٹ مسلمانوں کی کشتی پھنسی ہوئی تھی۔ یہ خبر بڑے زور سے اُڑائی گئی کہ مولانا سند یافتہ عالم نہیں ہیں۔ اب مولانا کو سند حاصل کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ سند لینے کی تاریخ ۱۵ محرم ۱۳۶۱ھ مطابق ۲ فروری ۱۹۴۲ء ہے۔ سند میں جو کتابیں درج ہوئی ہیں ان میں منیۃ المصلی اور شرح عقائد کا نام نہیں ہے۔ مگر ریکارڈ میں ان دونوں کتابوں کا نام موجود ہے۔

سیاسی وملی خدمات:

۱۹۱۹ء میں حضرت مفتی اعظمؒ نے جمعیۃ علمائے ہند کے قیام وتاسیس کے لیے دیگر علمائے ہند سے جو مذاکرات فرمائے ان میں آپ کے دست راست اور رفیق کار مولانا احمد سعید ہی تھے جو ہر ایک کام میں اور ہر ایک مجلس میں شریک رہتے تھے۔ مدرسۂ امینیہ میں حضرت مفتی اعظم کا جو خاص کمرہ تھا اسی میں پہلا دفتر قائم ہوا اور وہیں بیٹھ کر یہ دونوں استاد شاگرد اس کے تمام ابتدائی امور انجام دیتے تھے۔ ہندوستان بھر کے تمام علماء کی مکمل فہرست مفتی صاحبؒ نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمائی۔

ان حضرات کی تحقیق وتلاش اور محنت وکاوش قابل ستائش ہے۔ کشمیر سے راس کماری تک اور یاغستان سے برما تک نہ صرف شہروں اور قصبوں سے بلکہ ہر ایک چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں سے گوشہ نشین اور گمنام علماء کا کھوج نکالا اور سب کو لاکر ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ یہ کام نہ صرف محنت طلب تھا بلکہ خطرناک بھی تھا۔ برٹش امپائر کے خلاف لب کشائی کرنا اُس وقت جان کی بازی لگانا تھا۔ عوام تو عوام بیشتر علماء کے دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ اب انگریزوں کی حکومت سے کبھی چھٹکارا نہیں ملے گا۔

مدرسۂ امینیہ میں ہمارے اساتذہ میں سے ایک عالم باعمل حضرت مولانا حافظ محمد

عبدالغفور صاحب عارف دہلوی بھی تھے۔کوچہ رائمان میں رہتے تھے۔فارسی کے مدرس اور نائب مہتمم تھے۔عمر میں حضرت مفتی صاحبؒ سے بڑے تھے۔مفتی صاحب نے جب آزادی کی تحریکات میں حصہ لینا شروع کیا تو اکثر تو وہ جھگڑتے تھے۔فرماتے تھے کہ دیکھو مولوی کفایت اللہ! تم بے کار کام کر رہے ہو۔مسلمانوں کو الجھاؤ میں ڈال رہے ہو۔یہ سیاسی لیڈر سب پاگل ہیں۔آزادی وازادی اب نہیں ملے گی۔ان انگریزوں کو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی آکر پار لگائیں گے۔تم خواہ مخواہ مصیبت میں پڑتے ہو۔

ایسی ہی مایوسانہ کیفیت تھی جو ۱۸۵۷ء کی داروگیر کے بعد علماء پر بھی طاری تھی جس کی وجہ سے علماء گمنامی وگوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور حال یہ تھا کہ ایک صوبہ کے علماء کو دوسرے صوبہ کے عوام تو عوام خواص بھی نہیں جانتے تھے۔ان علماء کا فیض اپنے اپنے شہروں اور خاص خاص حلقوں میں محدود تھا لیکن جمعیۃ علماء کے رشتہ میں منسلک ہونے کے بعد تمام ہندوستان و برما کے علماء مثل ایک خاندان کے ہو گئے اور ان کی فیض رسانی نے بہت وسعت اختیار کر لی۔ (اُس زمانے میں ملک برما بھی غیر منقسم ہندوستان کے ساتھ شامل تھا)۔

آفریں ہے اُن اولوالعزم لوگوں کی ہمت پر جو اپنی اَن تھک کوشش اور محنت وجاں فشانی سے اتنے عظیم الشان ادارے تخلیق کر گئے۔رسل ورسائل کی وسعت آج جتنی ہے پہلے اتنی نہ تھی۔اس زمانے میں گوشہ نشین علماء کو چپے چپے سے تلاش کر کے لانا، روشناس کرانا، مختلف الخیال اور متفرق المسلک علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دینا بہت بڑا کام تھا جس کا سہرا کارکنان قضاء وقدر نے حضرت مفتی اعظمؒ اور ان کے دست راست ورفیق کار مولانا احمد سعید اور مولانا ابوالحسنات عبدالباریؒ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ۔مولانا آزاد سبحانی وغیرہم کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔پھر تمام علماء نے جمعیۃ کو چلانے اور آگے بڑھانے کا عملی کام باتفاق رائے اوّل الذکر حضرات کے سپرد کیا۔یہی کام سب سے زیادہ مشکل اور اہم تھا۔ان حضرات نے کس طرح اس کو چلایا؟ آج اس کا تصور بھی مشکل ہے۔چہ جائے کہ کوئی عملی نمونہ پیش کرنا۔

سرمد غم عشق بوالہوس راند ہند — سوز دل پروانہ مگس راند ہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار — ایں دولت سرمد ہمہ کس راند ہند

بے لوث خدمت اور اَن تھک محنت:

ملک میں دورے کر کے جماعت کو روشناس کرانا۔ اس کی سیاسی ضرورت واہمیت کو عوام کے ذہنوں میں جاگزیں کرانا۔ اس کے چلانے کے لیے مالی اعانت پر مسلمانوں کو تیار کرنا۔ لیڈروں سے سیاسی مذاکرے اور اشتراک عمل کرنا۔ ان ذمہ دارانہ کاموں کے ساتھ خود ہی دفتر کے کاروبار کو بھی چلانا۔ آمد وخرچ کا حساب کتاب رکھنا، لکھنا مرتب کرنا۔ تمام ہند اور بیرون ہند کے علماء واکابر سے خط وکتابت اور ربط قائم رکھنا، ڈاک تیار کرنا، رجسٹر پر چڑھانا، ڈاکخانہ کا کام انجام دینا وغیرہ۔ یہ تمام کام اور ان کے ملحقات اور بس صرف دو آدمی! نہ کوئی محرر نہ چپڑاسی۔ مولانا احمد سعید نے ایک مرتبہ فرمایا کہ "میاں مفتی صاحب! دفتر جمعیۃ کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے اس طرح چلایا ہے کہ حضرت تو حساب کتاب لکھتے تھے اور میں ڈاک تیار کر کے خود ڈاک خانہ لے جاتا تھا"۔

میاں حفیظ الرحمٰن:

واضح ہو کہ مولانا جب حضرت مفتی اعظمؒ کے مکان پر تشریف لاتے تھے تو ہمیشہ میاں حفیظ الرحمٰن کہہ کر پکارتے تھے۔ اب آخر میں ان کے مکان پر جب میں حاضر ہوتا تھا تو میاں مفتی صاحب کہتے تھے لیکن وہ وضعداری اب بھی قائم تھی۔ یعنی حضرت مفتی اعظم کی وفات کے بعد بھی جب کبھی مکان پر تشریف لائے میاں حفیظ الرحمٰن! کہہ کر ہی آواز دی اور خدا گواہ ہے کہ اس انداز خطاب اور طرز ندا سے روح کو جو مسرت ہوتی تھی وہ کسی بڑے سے بڑے خطاب سے نہ ہوتی تھی۔ آج میاں حفیظ الرحمٰن کہہ کر پکارنے والا خاموش ہے اور کان اس کی آواز کے منتظر ہیں۔

حضرت کے مکان پر آنے والے اور میاں حفیظ الرحمٰن کہہ کر پکارنے والے ایک تو مولانا مرحوم تھے۔ دوسرے بھائی اکرام ہیں (اللہ ان کو سلامت رکھے) اول الذکر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مؤخر الذکر کی آمد ورفت ۱۹۳۹ء میں صدارت عظمیٰ کے ساتھ رخصت ہو گئی یعنی حضرت مفتی اعظمؒ جمعیۃ کی صدارت سے ہٹ گئے تو قاضی اکرام الحق صاحب کا آنا جانا بھی بند ہو گیا

اور شاید کبھی آئے بھی ہوں تو میاں حفیظ الرحمٰن کہہ کر نہیں پکارتے۔

اے دل کی واردات لکھنے والے قلم! ذرا تھم تو سہی! یہ صریر خامہ ہے یا کسی کی پکار ہے؟ سن! یہ روح کو جگانے والی آواز کس کی ہے؟ میں لکھتے لکھتے تصور کی دنیا میں جا پہنچا۔

اُڑا جاتا ہے دل بھی روح کے ساتھ
تری آواز آتی ہے کہیں سے
(واصفؔ)

مولانا نے میاں حفیظ الرحمٰن! کہہ کر آواز دی ہے۔ والد مرحوم نے حفیظ الرحمٰن کہہ کر پکارا ہے۔ فرماتے ہیں مولوی صاحب کو بیٹھک میں بٹھاؤ میں نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا ہے۔ داخل ہو رہے ہیں اور فرماتے ہیں میاں! تمہارے باوا کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا چائے بنا رہے ہیں۔ میاں! تو ہم کو چائے نہیں پلاؤ گے؟ اتنے میں حضرت خود چائے لے کر آ گئے ہیں اور پھر دونوں ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے ہیں اور مجھ کو بھی مولانا نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا ہے۔

اب ہم حضرت مفتی اعظم کے متین اور باوقار چہرے کو اور مولانا کے ہنستے ہوئے چہرے کو یاد کیا کریں گے۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکے یا نہ ٹپکے۔ دل کی آنکھیں خون کے آنسو برساتی رہیں گی۔

سیاسی تحریکات:

غرضکہ جمعیۃ علماء کے قیام کے بعد ملک میں سیاسی تحرکات نے زور پکڑا۔ رولٹ بل کے خلاف برہمی جو خلافت کی تحریک کے نام سے مشہور ہے اس میں جمعیۃ علمائے ہند کی زیر قیادت بھی مسلمانوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اس وقت ہندو مسلمانوں کا اتحاد نقطہ کمال تک پہنچا ہوا تھا۔ جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے بھی علماء اور عوام بے دھڑک جیلوں کو بھر رہے تھے۔ مولانا احمد سعید ان تحریکات کے سلسلے میں سب سے پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہو کر میاں والی جیل میں رہے۔ ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۲ء کو رہائی ہوئی۔ ان تمام تحریکاتِ آزادی میں مولانا کو آٹھ مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک میں اور پھر ۳۲ء کی تحریک میں حضرت مفتی اعظمؒ کے ساتھ گجرات جیل میں اور پھر ملتان جیل میں بھی رہے۔

۱۲فروری ۱۹۲۲ء کہ جبکہ گاندھی جی نے بمقام باردولی سول نافرمانی کی تحریک کو معطل کر دیا، انگریزوں کو بڑی حد تک سکون نصیب ہوا۔ مگر ہندو مسلم اتحاد کی فضا قائم تھی اور انگریزوں کے دل میں یہ دُگدا رہتا تھا کہ اگر یہ دونوں متحد ہو کر پھر کوئی تحریک شروع کر دیں گے تو اب کے حکومت برطانیہ کی چولیں ہی ہل جائیں گی اور عزت سنبھالنی مشکل ہو جائے گی۔

شدھی کا زمانہ:

چنانچہ جب گورنمنٹ نے ہندو مسلمانوں کے مشترک جلوسوں اور جلسوں کو دبانا چاہا تو اس کے خلاف بلوے ہوئے اور ہندو مسلمان اور زیادہ متحد ہو گئے اور یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ چوراچوری کے واقعہ کے بعد ۱۹۲۲ء میں وائسرائے نے ترک موالات کے ایک بڑے ہندو لیڈر سوامی شردھانند کو جو اس وقت جیل میں تھا بلا کر گفتگو کی اور اس گفتگو کے بعد جو صیغۂ راز میں رہی ان کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہی شردھانند نے شدھی کا کام شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر مونجے نے سنگھٹن قائم کی جو خالص ہندوؤں کی جماعت تھی۔ شدھی اور سنگھٹن چونکہ کانگریس لیڈروں کے ہاتھوں شروع ہوئیں اس لیے ملک میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور بدگمانیاں ہونے لگیں۔ اسی زمانے میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے اجلاس علی گڑھ، میں میاں سر فضل حسین وزیر تعلیم پنجاب نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ اچھوتوں میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ اس پر اخبار البشیر اٹاوہ نے اعتراض کیا کہ اُس تعلیمی جلسے کے مقاصد و قواعد کے خلاف ایک سرکاری عہدہ دار نے ایک مذہبی مسئلہ کیوں چھیڑا اور اس پر اپنے شبہ کا اظہار کیا۔ بالآخر یہ شبہ صحیح نکلا کیونکہ فوراً ہی ہندو مسلمانوں کی طرف سے ملک میں شدھی اور تبلیغ کا دور دورہ ہو گیا اور پھر جو ہندو مسلم بلوے شروع ہوئے تو انھیں کوئی قوت روکنے والی نہ تھی۔ (روشن مستقبل)

جمعیۃ علمائے ہند کی تاریخ میں یہ عہد بے انتہا نازک اور آزمائشی عہد تھا۔ ادھر تو ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد جس کے لیے ہندوستان کی تمام قوموں کا متحد ہونا ضروری تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو ارتداد سے بچانا۔ غرضکہ انگریز کا یہ ایسا بھرپور وار تھا جس نے پورا کام کیا اور ملک کی آزادی پچیس برس کے لیے مؤخر ہو گئی۔ اس وقت اکابر جمعیۃ کا فہم و تدبر

سخت آزمائش میں تھا۔ ملک کے چپے چپے پر ہندو مسلمانوں میں فساد اور خوں ریزی ہو رہی تھی۔ اللہ رب العزت ان اکابر کی روحوں پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے جنھوں نے ارتداد اور شدھی کا مقابلہ بھی پوری جوانمردی، عالی ہمتی اور عزم راسخ کے ساتھ کیا اور وطن کی آزادی کے لیے بھی لڑتے رہے۔ خدا رحمت کند آں عاشقانِ پاک طینت را۔

تبلیغی وفود:

سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک ملکانوں کے علاقے سے شروع کی تھی اور ہزارہا ملکانوں کو مرتد کر دیا تھا۔ اس زمانے میں حضرت مفتی اعظمؒ جمعیۃ علمائے ہند کے صدر اور مولانا احمد سعید ناظم تھے۔ حضرت نے جمعیۃ علماء کی طرف سے بھی اور مدرسۂ امینیہ کی طرف سے بھی بے شمار تبلیغی وفود مرتدین کے علاقوں میں بھیجے اور سب سے پہلا وفد تو غالباً خود ہی اچھنیرے کے مقام پر لے گئے تھے۔ مولانا محمد حسن دوحدی جو اُس وقت معین مدرس تھے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب وفد لے کر گئے گاؤں میں پہنچ کر ایک جگہ زمین پر رومال بچھا کر بیٹھ گئے۔ وفد میں مولانا دوحدی کے علاوہ دو تین طالب علم تھے۔ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ جگہ تو مناسب نہیں ہے۔ فرمایا کہ چپکے رہو۔ اسی میں عافیت ہے۔ گاؤں والے چند طلبہ کو دیکھ کر جمع ہو گئے۔ پھر آپ نے تقریر فرمائی۔

ان وفود کے صدر کبھی حضرت مولانا وحید حسن خاں ٹونکی مرحوم مدرس مدرسۂ امینیہ اور کبھی مولانا محمد عرفان مرحوم نائب ناظم جمعیۃ علمائے ہند و مدیر اخبار الجمعیۃ اور کبھی مولانا احمد سعید اور کبھی دیگر حضرات ہوتے تھے۔ مرتد ملکانوں کے علاقوں میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ قدم قدم پر فتنہ وفساد کا اندیشہ اور جان کا خطرہ لگا رہتا تھا۔

مولانا کا اندازِ خطابت:

ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب کے پاس خبر پہنچی کہ فلاں گاؤں پورا کا پورا مرتد ہو گیا ہے۔ حضرت نے مولانا احمد سعید کو حکم دیا کہ فوراً روانہ ہو جاؤ۔ مولانا دل کے کمزور تھے ہچکچا رہے تھے۔ بہت کچھ حیلے بہانے کیے مگر حضرت کا حکم تھا۔ مجبوراً روانہ ہوئے۔ گاؤں میں پہنچ کر

حالات معلوم کیے اور خاص کر یہ بات دریافت کی کہ آ ریہ لوگ آ کر ان گاؤں سے والوں سے کیا کہتے ہیں؟ اور کیونکر بہکاتے ہیں؟ بتایا گیا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ''تمہارے باپ دادا سب ہندو تھے۔ مسلمانوں نے آ کر تم کو زبردستی مسلمان بنایا اور تمہاری چوٹیاں کاٹیں'' اب مولانا کا طرز استدلال اور شان خطابت ملاحظہ فرمائیے۔ آپ نے جلسے کا اعلان کرایا اور کھڑے ہو کر فرمایا:

''آج اس گاؤں میں آ کر اور ایک بہادر قوم کے سپوتوں سے مل کر میں بے انتہا خوش ہوا ہوں۔ ملکانہ قوم دنیا کی چند بہادر قوموں میں سے ایک ہے۔ یہ قوم ہندوستان کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ تمہارے باپ دادا نے ہمیشہ ہندوستان کی حفاظت کی ہے۔ دشمنوں سے کبھی ہار نہیں مانی ہے۔ اور بھئی! مجھے ان لوگوں پر بڑی حیرت ہوتی ہے جو تمہارے باپ دادوں کو تمہارے منہ پر بزدل اور ڈرپوک کہتے ہیں اور تم جواُن سور ماؤں کی اولاد ہو سنتے ہو اور برا نہیں مانتے۔ لوگ تمہیں آ کر بہکاتے ہیں کہ تمہارے باپ دادوں کو مسلمانوں نے مار مار کر زبردستی مسلمان بنایا تھا اور ان کی گردنیں پکڑ پکڑ کر چوٹیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ کیا واقعی تمہارے باپ دادا ایسے ہی کمزور اور ڈرپوک تھے؟ مجھے یقین نہیں آتا! دیکھو بھئی! یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے باپ دادوں سے کوئی آنکھ بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ اسلام کو ایک اچھا اور سچا دین سمجھ کر اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے تھے۔ کیا اب تم اپنے سچے دین کو چھوڑ کر اپنے باپ دادوں کی روحوں کو صدمہ نہیں پہنچا رہے ہو؟''

تقریر ختم ہونے کے بعد گاؤں کے لوگ از سر نو مسلمان ہو گئے۔

اکابر بھی مان گئے:

آپ کی طرز خطابت کے ایسے ہی سیکڑوں کرشمے اکثر ظہور پذیر ہوتے رہتے تھے۔ جن سے ذہنیت اور خیال بدل جاتے تھے۔ فتنہ وفساد کے عزائم سست پڑ جاتے تھے۔

بریلی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں کوئی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس کو خراب کرنے کے لیے کئی سو آدمی اپنی بغلوں میں چھرے چاقو چھپا کر آئے تھے۔ مولانا احمد سعید صاحبؒ نے کھڑے ہو کر تین گھنٹے تقریر کی۔ فسادیوں کے مفسدانہ عزائم پر اوس پڑ گئی۔ کوئی چوں بھی تو نہ کر سکا۔ کانفرنس امن و عافیت کے ساتھ جاری رہی۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آتش بیان خطیب نے اُٹھ کر مولانا کو گلے لگایا اور فرمایا کہ "مولانا اگر آپ ہمیشہ ایسی ہی تقریر کیا کرتے ہیں تو دنیائے اسلام میں آپ کا جواب نہیں ہے"۔

پھر ایک نیا گل کھلا:

ابھی اکابر جمعیۃ آریوں کی مدافعت میں مصروف تھے کہ بیچ میں ایک اور مصیبت پیش آ گئی۔ بریلوی حضرات بھی تبلیغ کے میدان میں دوڑنے لگے اور گاؤں میں جا کر یہ کہنا شروع کیا کہ دیکھنا یہ دیوبندی لوگ کافر ہیں۔ بہت کچھ کافر کافر کہتے رہے مگر دیہاتیوں پر کچھ اثر نہ ہوا اور انھوں نے دیوبندیوں کے تبلیغی اجتماعات میں حاضر ہونا بند نہ کیا۔ تو دوسری ترکیب سوجھی۔ یعنی وہابی کہنا شروع کیا۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ دیہاتیوں نے جہاں یہ لفظ سنا اور بھڑکے۔

غرضکہ علماء کے راستے میں یہ ایک اور پہاڑ حائل ہو گیا۔ ایک موقعہ پر ایک گاؤں میں تبلیغی جلسہ ہونے والا تھا۔ گاؤں والوں سے کہا گیا کہ یہ لوگ وہابی ہیں۔ ان کی تقریر نہ سنا کرو۔ اور دیکھو! اپنے جلسے میں بھی نہ بلانا۔ ان کے وہابی ہونے کی پہچان یہ ہے کہ یہ لوگ قیام نہیں کرتے سلام نہیں پڑھتے۔ جلسے کے منتظمین معتدل المزاج تھے۔ انھوں نے سب کو بلاوا دے دیا۔ بریلوی علماء کے ساتھ ہی دیوبندی علماء بھی پہنچے۔ مگر بریلوی حضرات نے جلسے کے شروع میں میلاد شریف شروع کر دی۔ قیام کے وقت مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری مرحوم اور ان کے رفقاء نے جو دیوبند سے آئے تھے قیام نہیں کیا۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے قیام کیا ان کو دیکھ کر مولانا احمد سعید وغیرہ بھی کھڑے ہو گئے مگر دل میں سوچ رہے تھے کہ حضرت نے اپنے مسلک کے خلاف ایسا کیوں کیا۔ جلسے میں بریلوی حضرات نے اپنی تقریروں میں سارا زور وہابیت کی تردید و تنقیص میں خرچ کر ڈالا۔ دیوبندی حضرات نے اپنی تقریروں میں ان اختلافی مسائل کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ خالص تبلیغی تقریریں کیں۔

اس جلسے کا عوام پر اچھا اثر ہوا۔ دوسرے دن صبح کو ہر جگہ یہ تذکرے ہو رہے تھے کہ بھئی حنفی مولوی جو آئے تھے انھوں نے تو اپنی تقریروں میں اسلام کی کوئی بات نہیں کی۔ بس یہی یہ کہتے رہے کہ فلاں کافر ہے فلاں وہابی ہے۔ ایک بولا یہ گلابی وہابی کون سی قوم ہے جس کا وہ نام لے رہے تھے؟ ایک بولا ارے چودھری! دیکھیو! تقریریں تو دلی کے مولویوں کی بڑی چوکھی تھیں۔ بس اسلام کی باتیں کہیں اور اللہ رسول کی باتیں سنائیں۔ بھئی ہم تو اب اُنھیں کو بلایا کریں گے یہ حنفی مولوی تو ہم کو لڑواتے رہتے ہیں۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد مولانا نے حضرت مفتی صاحب سے قیام میں شریک ہونے کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا کہ یہ اختلافی مسائل ہیں۔ ان میں شدت اختیار کرنا مناسب نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان نومسلموں کو اپنی طرف مائل کرنا اور محبت کا برتاؤ کرنا اس وقت ہمارا سب سے اہم فریضہ ہے۔ اگر علماء کی طرف سے ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہوگی تو ان کو خدا کا پیغام پہنچانا مشکل ہو جائے گا اور ایک اہم تر مقصد فوت ہو جائے گا۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندانِ عشق ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

حضرت مفتی اعظم نور اللہ مرقدہ کے فہم و تدبر کی یہ ادنیٰ مثال ہے۔ اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے فراخدلی اور رواداری برتتے تھے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر طبقے کے مسلمانوں کے سر ان کے ادب و احترام میں جھک جاتے ہیں اور ہر مسلک کے مسلمان آج ان کی کمی محسوس کر کے آبدیدہ ہوتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ رواداری تھی۔ مداہنت یا تسامح نہیں تھا۔ آپ نے کبھی اپنے مسلک میں تبدیلی نہیں کی۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، کے مسلک پر سختی سے قائم رہے۔ نیز اسلامی شعائر کے معاملے میں کبھی نرمی نہیں برتی۔ غیر مسلموں کی خالص مذہبی تقاریب میں شرکت کی اجازت نہیں دی۔ دعوتوں اور ٹی پارٹیوں میں اسلامی آداب اور مشرقی معاشرہ کو ترک نہیں کیا۔ اپنے بیس برس کے دورِ صدارت میں اخبار الجمعیۃ کے صفحات پر تصویر شائع کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔

فاعتبروا یا ولی الابصار۔

جمعیۃ علمائے ہند کے اندر انقلاب:

نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی تھی۔ اس کی صدارت کے لیے حضرت مفتی اعظم کو اور نظامت کے لیے حضرت مولانا احمد سعید کو منتخب کیا گیا تھا۔ جب ان حضرات کی محنت شاقہ سے جمعیۃ نہ صرف ہندوستان و برما میں بلکہ تمام دنیائے اسلام میں روشناس ہوگئی اور اس پودے کی پھلنگ آسمان سے باتیں کرنے لگی اور اس کی جڑیں مضبوط ہوگئیں۔ تو بعض حضرات کے دلوں میں یہ خلش پیدا ہوئی کہ تمام ہندوستان کے مختلف الخیال اور مختلف المسلک علماء کی باگ ڈور دیوبندی حضرات کے ہاتھ میں کیوں ہے؟ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء میں جبکہ جمعیۃ علماء کی سالانہ کانفرنس شہر گیا میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے زیر صدارت منعقد ہوئی تھی۔ اس وقت سے اس قلبی خلش کا اظہار ہونے لگا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد جمعیۃ کی صدارت کے خلاف بھی کھچڑی پکنے لگی۔ مگر جن ایثار پیشہ اور مخلص علماء نے مل کر جمعیۃ کی بنیاد ڈالی تھی وہ اس کے اندر اختلاف کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے روزنامچہ (قلمی) میں تحریر فرماتے ہیں:

''مولوی سبحان اللہ صاحب اور ان کے ہمراہی مولوی عبدالعزیز وغیرہ نے آخر ماہ آکر ملاقات کی۔ مولوی سبحان اللہ نے زیادہ زور اس امر پر دیا کہ دیوبند کے علماء کا اثر جمعیۃ علماء میں زیادہ ہوتا جاتا ہے اس کا تدارک کرنا چاہیے۔ میں نے اس کا جواب دیا کہ جمعیۃ علماء کے مقاصد ایسے ہیں کہ جن میں ان کا زور ہونا ہمارے مقاصد کے خلاف نہیں ہے اور اس کو ہم نے سمجھ کے کیا ہے۔ ہماری اور ان کی کوئی دنیاوی مغایرت نہیں ہے۔ نہ ان کو غیر کرنے سے فائدہ ہے۔ بلکہ ہمارے اثر کا نقصان ہے۔ علاوہ ازیں اگر ان کا اثر جمعیۃ علماء پر نہ ہو تو پھر وہ جماعت علماء کہاں سے آئے گی جس کا اثر ہو۔ ان کے مدارس اور تلامذہ اطراف و اکناف ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انسے ہم کو استغنا نہیں ہے۔ نہ ان کے اثر کے کم کرنے سے ہمارا کوئی مقصد حاصل ہوتا ہے۔

پھر انہوں نے مسئلہ امیر شریعت چھیڑا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ دیو بند کی عصبیت کا باعث میں ہوں۔ شاید امیر شریعت کو اپنے ہم خیال علماء سے بنانے کی تجویز کروں۔ میں نے اس سے اختلاف کیا اور صاف کہہ دیا کہ میرے نزدیک یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ جمعیۃ علماء کے حال کے طرز عمل نے مجھے اور بھی اس کے نقائص کی طرف زائد توجہ دلا دی ہے۔ میں اس کی موافقت ہی نہیں کرتا۔ مگر آپ لوگوں کی رائے کی وجہ سے سکوت کروں گا۔ مخالفت نہ کروں گا۔ میں شریعت اسلامیہ میں سوائے خدا اور رسول کے کسی کے احکام کو بے چون و چرا نہیں مان سکتا ہوں۔ اگر جمعیۃ علماء ایک عبد حبشی کو امیر شریعت مقرر کردے گی میں اس کی مخالفت نہ کروں گا۔ خود احکام خدا اور رسول کا پابند رہوں گا۔ دیو بند کے علماء سے قوی اُمید ہے کہ مسائل اختلافیہ کسی قسم کے پیش نہ کریں گے۔ نہ اپنے مخصوص مسائل میں مجھے مجبور کریں گے۔ ان کے انتخاب سے فائدہ کی اُمید زیادہ ہے بہ نسبت نقصان کے۔ میں نے کہا کہ اگر مولوی حبیب الرحمٰن صاحب اور مولوی آزاد سبحانی صاحب اور مولوی عبدالقدیر صاحب کے متعلق رائے لی جائے تو کون شخص اول الذکر کو مقدم نہ کرے گا۔ خدا نے ان کو تقدم دیا ہے۔ میں خود اس تفریق کو کہ یہ دیو بند کے ہیں اور وہ نہیں۔ کبھی نہ خیال میں رکھتا تھا نہ اب اس کا لحاظ کروں گا۔ الخ

باوجود اس روک تھام کے جمعیۃ علماء کی لیڈر شپ کو بدلنے کے منصوبے بنتے رہتے تھے۔ حضرت مفتی اعظم نے جب محسوس کیا کہ مختلف اسباب (مثلاً خاندانی مفاخر اور نسلی امتیازات کا فقدان نیز دیو بندیت وغیرہ) کی وجہ سے علمائے کرام صدارت سے گرانی محسوس کر رہے ہیں تو ایک میٹنگ میں صدارت سے استعفا پیش کر دیا لیکن جب استعفا پیش ہوا تو متفقہ طور پر سب نے اس کی منظوری سے صراحۃً انکار کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مرکزی مقام میں صدر دفتر

رہنے کی صورت میں حضرت مفتی اعظم کی صدارت ناگزیر تھی۔ جب کبھی آپ نے صدارت سے علیحدگی کا ارادہ کیا ہمیشہ اس کی مخالفت کی گئی۔ آخر ایک نئی صورت حال سامنے آئی۔

دیوبند کی انقلابی جماعت:

دارالعلوم دیوبند میں جو حضرات صاحب اختیار تھے ان کی بے احتیاطیوں کی وجہ سے ان کے خلاف ایک کوہ آتش فشاں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ یہ فتنہ ستمبر ۱۹۲۷ء میں پوری قوت سے طلبہ کی اسٹرائک کی صورت میں ابھرا۔ اگرچہ یہ انقلابی تحریک مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم کی اولوالعزمی اور تدبر کی وجہ سے پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکی لیکن دارالعلوم کی انتظامی باڈی میں کچھ اصلاحات کا سلسلہ ضرور شروع ہو گیا۔ انقلابی جماعت نے یہاں کی ناکامی کے بعد ڈابھیل کا رخ کیا اور وہاں ایک جامعہ عربیہ قائم کیا مگر فضا سازگار نہ ہوئی۔ جماعت کے افراد منتشر ہونے شروع ہو گئے۔ کچھ افراد نے کلکتہ کا رخ کیا مگر وہاں جا کر اُمنگیں اور بھی سرد پڑنے لگیں۔ آخر دہلی کا رُخ کیا۔ انقلابی ذہنیت کے لیے بھی میدان مل گیا۔ دہلی کی آب و ہوا ہی ایسی ہے کہ ہر اُبھرنے والی اُمنگ کو اُبھرنے کا موقع دیتی ہے اور ہر زنگ آلودہ جوہر کو جلا دے کر اُبھارتی ہے۔

مولانا بشیر احمد بھٹہ جو مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے ان کا مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند سے کچھ اختلاف ہوا اور بڑھتا رہا۔ ادھر اُس انقلابی جماعت کے سرکردہ حضرات کی نظر دہلی پر پڑ ہی چکی تھی۔ ہم سفر مل گئے۔ منزل مقصود متعین ہو گئی۔ ''مولانا احمد سعید کے اقتدار کو ختم کرنا اور جمعیۃ علمائے ہند کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں لینا۔ رہنمائی کے لیے مولانا بشیر احمد مرحوم جیسا مدبر۔ نتیجہ میں مولانا احمد سعید کے لیے ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ترک نظامت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں صدر و ناظم دونوں کا استعفا جمعیۃ کے سامنے آ گیا۔

اسی زمانے میں مولانا بشیر احمد صاحب نے راقم الحروف سے فرمایا کہ ''دراصل ہمارا اختلاف ناظم صاحب سے ہے۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ کو ہم کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ناظم صاحب کے بغیر مفتی صاحب صدارت پر رہنے کے لیے کسی

صورت سے تیار نہیں ہیں"۔

یہ واقعہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم کو جو تعلق مولانا سے تھا اور رفاقت وتعاون کا جو جذبہ وہ مولانا کے اندر پاتے تھے اس کی اُمید ان کو اور کسی سے نہ تھی۔ اس وجہ سے بھی وہ بغیر مولانا کے اپنی صدارت گوارا نہ کر سکتے تھے۔

بہر حال ۱۹۳۹ء میں جمعیۃ کی صدارت حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اور نظامت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی طرف منتقل ہوگئی۔ حضرت شیخ کی وفات کے بعد مولانا احمد سعید کو صدر چنا گیا اور دم واپسیں تک آپ جمعیۃ علمائے ہند کے صدر تھے۔

۴۷ء میں مولانا کی خدمات:

انقلاب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے اور خاص کر دہلی و پنجاب کے مسلمانوں پر جو کچھ گزری اور اس میں مولانا نے (جو ڈیڑھ دو برس سے اختلاج وغیرہ مہلک امراج میں گرفتار تھے) اور ان کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن ناظم عمومی جمعیۃ علماء نے جو خدمات انجام دیں وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائیں گی۔ بشرطیکہ مورخ فن تاریخ کے آداب اور اس کی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھ کر تاریخ لکھے لیکن اس سیاسی عہد میں یہ اُمید نہیں۔ آج کے دور میں اسلاف کی قربانیوں اور مخلصانہ خدمات کو فراموش کر دینا اور ان کی یاد کو صفحات تاریخ سے محو کر دینا ہی انسانیت کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

رائگاں رندوں کے اوصاف حمیدہ ہو گئے — بوالہوس ان کی نظر میں برگزیدہ ہو گئے
میرے افسانوں سے دنیا نے لیا درس جنوں — میرے افسانے بھی اب تو ناشنیدہ ہو گئے
بتکدے کی راہ لی تھی چھوڑ کر باب حرم — میری قسمت سے یہ آہو بھی رمیدہ ہو گئے
گرم ہو جاتا تھا جن سے نوجوانوں کا لہو — آج وہ افکار مرہونِ قصیدہ ہو گئے

قطرہائے خون دل کا کیا کہوں واصفؔ مآل
دفن وہ بھی صورت اشک چکیدہ ہو گئے

اس دور ابتلا کا حال اور اس نامسعود انقلاب کی خوں ریزی کا تذکرہ چند صفحات میں نہیں

سما سکتا اور اُس وقت اکابر جمعیۃ نے جان کی بازی لگا کر اور سر ہتھیلی پر رکھ کر جو خدمات انجام دیں ان کے لیے بھی بڑے بڑے دفتر درکار ہیں۔ کتاب ''مختصر تذکرۂ خدمات جمعیۃ'' سے آپ کو کچھ مختصر سا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

اُس زمانے میں ایک دن یہ افواہ سنی گئی کہ کوچہ چیلاں سے جامع مسجد تک کے علاقے کو مسلمانوں سے خالی کرا لینے کی تیاری مکمل ہو گئی ہے۔ وہ رات سر پر کھڑی تھی جبکہ بلوائی اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے والے تھے۔ مولانا احمد سعید کو یہ پیغام دیا گیا کہ آپ اپنے نیشنلسٹ مسلمانوں کو ساتھ لے کر ہماری حفاظت میں آ جائیے۔ اس کا جو کچھ جواب مریض اختلاج مولانا احمد سعید نے دیا وہ ملا واحدی کے الفاظ میں سنیے۔ لکھتے ہیں:

> ''ایک واقعہ تو ایسا ہے کہ شاید وہی نجات کا ذریعہ ہو جائے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کی ایک بھیانک رات تھی۔ کرفیو کے باوجود کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی اور پکارا واحدی صاحب! میں مکان کی دوسری چھت میں تھا جہاں مردانہ تھا۔ میرے بڑے لڑکے مجتبیٰ واحدی نیچے اُترے اور انھوں نے اطلاع دی کہ لالہ دیس راج ہیں۔ دیس راج میونسپل کمیٹی کے ساتھی تھے۔ علاقہ کا مسلمان ممبر میں تھا اور ہندو ممبر وہ۔ میں نے مجتبیٰ سے کہا بلا لو۔ دیس راج صاحب بولے آپ ہی آ یئے۔ خیر! میں گیا تو متعدد موٹریں کھڑی تھیں۔ لالہ دیس راج نے کہا کہ یہ مسز کرپلانی ہیں صدر انڈین نیشنل کانگریس کی دھرم پتنی۔ یہ مسٹر شانتی سروپ آہوجہ ہیں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ مسز کرپلانی نے سوال کیا ''اس محلے میں تو امن ہے؟'' میں نے کہا ''ہاں اس محلے میں تو ابھی امن ہے مگر امن ٹوٹنے کا ہر آن امکان ہے''۔ مسٹر آہو بولے ''مہاتما گاندھی کو اطلاع ملی ہے کہ یہاں خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ آپ صاف صاف بتایئے کہ خطرے کا ''وہم'' کیوں ہے؟ مسز کرپلانی مہاتما جی سے کیا کہیں؟ میں نے کہا ''برابر کے محلے زد میں آ چکے ہیں اس وجہ سے اطمینان نہیں ہے۔ مولانا

احمد سعید صاحب کا گھر قریب ہے ان سے اور پوچھ لیجیے۔ ممکن ہے کہ وہ کچھ اور زیادہ بتا سکیں‘‘۔ چنانچہ مولانا سے پوچھا گیا۔ انھوں نے بھی وہی فرمایا جو میں نے کہا تھا۔ صرف اتنا اضافہ کر دیا کہ ’’مسٹر آصف علی اور مفتی کفایت اللہ کا محلّہ آپ کے انتظامات کا منتظر ہے‘‘۔ آہوجہ صاحب نے کہا ’’آپ اور آپ کے ساتھی ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں چلے جائیں۔ وہ خالی ہے۔ وہاں مطلب خطرہ نہ رہے گا۔ کوٹھی کی حفاظت محلے کی حفاظت کی نسبت آسان ہے‘‘۔ مولانا نے فرمایا ’’محض اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچانی کون سی اچھی بات ہے۔ آپ بچا سکتے ہیں تو محلے کے نہیں شہر بھر کے مسلمانوں کو بچائیں آج کل ساتھی اور غیر ساتھی کا فرق محال ہے‘‘۔

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

’’اپریل میں بیمار نہیں تھے۔ بیمار کئی سال سے جاڑے میں پڑتے تھے۔ جاڑا آیا اور دل کا حال بگڑا لیکن اپریل (۱۹۵۹ء) کا اضمحلال کسی بیماری کی وجہ سے نہیں تھا۔ دلی کی کایا پلٹ نے مضمحل کر رکھا تھا۔ زبان سے ایک لفظ نہیں کہا مگر لکھتے برابر رہتے تھے کہ دیرینہ صحبتوں کے تصور سے بے چین ہوں۔ دیرینہ صحبتوں کی یاد بجلیاں گراتی ہے۔ دلی کی کایا پلٹ مولانا کی آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی۔ ہم اس کی رُوداد سن کر متاثر ہیں۔ مولانا پتھر تھوڑا ہی تھے جو متاثر نہ ہوتے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، حافظ عزیز حسن بقائی اور جعفری صاحب کا وفد روزانہ مولانا ابو الکلام آزاد، پنڈت نہرو، مہاتما گاندھی کے پاس جایا کرتا تھا جو تینوں کو بتایا کرتا تھا کہ مسلمانوں پر کل کیا گزری۔ ایک دن گاندھی جی مسلمانوں کے پاس تشریف لے آئے۔ کونے کونے کے مسلمان سمٹ کو مولانا احمد سعید

کے علاقے میں جمع ہو چکے تھے۔ دلی کے اور محلے مسلمانوں سے تقریباً
خالی تھے۔ مہاتما جی کا جلسہ مسٹر آصف علی والے مکان کوچہ چیلاں میں
منعقد کیا گیا۔ مولانا احمد سعید نے تقریر شروع فرمائی۔ دو چار لفظ بولے
ہوں گے کہ لفظوں کی جگہ آنسو بہنے لگے اور مولانا کی جگہ مولانا حفظ
الرحمٰن نے تقریر کی تکمیل فرمائی۔

میرا خیال ہے کہ انقلاب ۱۹۴۷ء سے جس قدر مولانا متاثر ہوئے۔
اس قدر شاید کوئی متاثر نہیں ہوا۔ گاندھی جی کی قیام گاہوں تک کا بلا ناغہ
سفر کتنا خطرناک تھا۔ پھر گاندھی جی سے شکایت کرنا معمولی حکام کو ہی
نہیں سردار پٹیل وزیر داخلہ بھارت کو دشمن بنانا تھا۔ پٹیل صاحب
گاندھی جی سے خفا ہونے کی طاقت اور ہمت نہ رکھتے تھے۔

(الجمعیۃ مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۵۹ء)

۱۹۴۷ء سے زندگی کے آخری لمحات تک عوام کے کاموں اور سفارشوں کے لیے دوڑ دوڑ کر حکام اور وزرا کے پاس جانا اور اپنے امراض کی پروا نہ کرنا۔ ان خدمات کے ساتھ علمی مشاغل مثلاً تصنیف و ترجمہ کا جاری رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس سراسیمگی اور بدحواسی کے دور نامسعود میں خداوند عالم نے جن کو استقامت کی توفیق بخشی وہ جمعیۃ علمائے ہند کے حضرات تھے۔ خداوند ذوالجلال نے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند کو وہ جرأت و ہمت اور وہ استقلال عطا فرمایا جو ایسے موقعوں پر تاریخ کی ممتاز شخصیتوں کا قدرتی حصہ ہوتا ہے۔ ان کی رفاقت میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب جو پانچ چھ سال سے اختلاج قلب وغیرہ میں مبتلا تھے اور ضعف و نقاہت نے ایک حد تک گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا تھا۔ ہمت مردانہ کے ساتھ اُٹھے اور کوہ استقلال بن کر کارکنان جمعیۃ کی بزرگانہ سرپرستی فرمائی۔ اب یا تو مرض ہی نہ رہا تھا یا احساسِ مرض مفقود ہو گیا تھا۔ ان حضرات کے استقلال و استقامت نے جماعت کے کارکنوں میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ ان کے حوصلے بلند ہو گئے اور انھوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر وہ خدمات انجام دیں جو مسلمانانِ دہلی کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ خاص کر اس زمانے

میں کہ حکومت بلوائیوں کے نرغے میں تھی اور پیس کمیٹی کی تمام کوششیں ناکام ہورہی تھیں۔ حتیٰ کہ ٹاؤن ہال جو امن کمیٹی کا مرکز تھا اس کے گرد لاوارث نعشیں جگہ جگہ پڑی ہوئی تھیں۔ ہندو دوستوں نے پریشان ہوکر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، سید محمد جعفری صاحب، حافظ محمد نعیم صاحب وغیرہ ارکان پیس کمیٹی سے التجا کی کہ وہ مسلمانوں کو لے کر اوکھلا تشریف لے چلیں جہاں ان کی حفاظت اور آسائش کا پورا انتظام کردیا جائے گا۔ ورنہ خطرہ ہے کہ اس بحرانی دور میں وہ اپنے قوم پرور مسلم دوستوں کی حفاظت نہ کرسکیں گے اور شرمساری کا یہ داغ ہمیشہ ان کی پیشانی پر رہے گا۔ اُس وقت جماعت کی ترجمانی کرتے ہوئے شیر دل حفظ الرحمٰن نے کہا ''وطن عزیز کی آزادی کی کوشش اس لیے نہیں کی تھی کہ ہم کسی کیمپ میں جاکر پناہ لیں۔ ہم اپنے مکانات اور اپنے محلوں میں رہیں گے اور صبر و استقامت سے اس بغاوت کا مقابلہ کرتے ہوئے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شہید ہوجائیں گے۔

(علمائے حق جلد دوم مصنفہ مولانا سید محمد میاں صاحب ص ۵۷۵)

تصانیف اور ترجمہ قرآن:

بہت عرصے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ راقم الحروف مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا اور غالباً اس زمانے میں احادیث قدسیہ کا ترجمہ لکھ رہے تھے۔ اس کے کچھ اقتباسات سنا کر فرمایا کہو میاں مفتی صاحب! کیا خیال ہے تمہارا؟ یہ کتاب چلے گی یا نہیں؟ عرض کیا کہ آپ کی کتاب اور مقبول نہ ہو! ضرور ہوگی۔ ماشاء اللہ بہت اہم خدمت ہے۔ مگر...... یہ کہہ کر میں کچھ متامل ہوا۔ فرمایا ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟ عرض کیا کہ اگرچہ آپ کے سامنے لب کشائی کرنا گستاخی ہے مگر دلی جذبات کی ترجمانی بھی ضروری ہے۔ آپ نے اپنی تصانیف سے دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے مگر اپنے اصلی فن کی طرف اب تک توجہ نہیں فرمائی۔ قرآن کا ترجمہ لکھیے۔ آپ کو قرآن پر جتنا عبور ہے اس عہد میں اور کوئی ایسا نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس نعمت سے نوازا ہے اور زور قلم بھی دیا ہے۔ یہ بہت بڑی خدمت ہوگی سن کر متفکر ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد فرمایا میاں مفتی صاحب تم نے بات تو بڑی اہم کہی ہے۔ مگر یہ کام اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ میں نے پھر اصرار کیا فرمایا اچھا

بھی سوچوں گا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کا ارادہ مولانا کے دل میں پہلے سے تھا یا بعد میں پیدا ہوا لیکن الحمدللہ کہ وفات سے پہلے ترجمہ کا کام مکمل فرما چکے تھے۔ مولانا کی دیگر تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے۔

اعتماد و رفاقت:

واقعات مذکورۂ بالا سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا کو خاص توجہ اور خلوص سے تربیت دی اور انھوں نے بھی ابتدائی دور میں پوری سعادتمندی کا ثبوت دیا۔ اکابر مدرسہ کا دستور تھا کہ مستعد اور ہونہار طلبہ کو اپنی نگرانی میں ٹریننگ دیتے تھے اور جہاں ضرورت ہوتی تھی وہاں بھیج دیتے تھے۔ مولانا مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کو راندیر بھیجا۔ مولانا قاری محمد یاسین صاحب کو رائے پور بھیجا۔ اسی طرح دیگر حضرات کو مختلف مقامات پر بھیج دیا گیا۔ مگر مولانا احمد سعید کی یہ خصوصیت ہے کہ حضرت نے ان کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کیا اور اس رفاقت کو اس طرح نباہتے رہے کہ جب کوئی لیڈر یا عالم ملنے کے لیے آتا تھا یا کسی مہمان کی دعوت ہوتی تھی تو مولانا احمد سعید کو ضرور بلایا جاتا تھا۔ حاشا وکلا مجھے ایسی کوئی دعوت یاد نہیں کہ مولانا دہلی میں ہوں اور حضرت نے ان کو یاد نہ فرمایا ہو اور بغیر ان کے نوالہ توڑا ہو اور راقم الحروف کی محرومی بھی قابل داد ہے کہ مولانا کی طرف سے دعوت کا تو کیا ذکر ایک چائے کی پیالی سے بھی ہمیشہ محروم ہی رہا۔ البتہ والد ماجد کبھی کبھی اپنے مہمانوں کے ساتھ مولانا دعوت کرتے تھے۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ گھر کے نجی معاملات میں بھی مولانا احمد سعید ہمیشہ دخیل رہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہمارے گھر کا ایک بالکل نجی (یعنی ہم بہن بھائیوں میں سے کسی کی تقریب نکاح کا) معاملہ تھا۔ حضرت نے حکم دیا جاؤ مولوی احمد سعید کو بھی بلا لاؤ۔ میں نے ہمت کر کے عرض کیا کہ ابتدائی مرحلے تو ان کی موجودگی میں طے ہو چکے ہیں۔ اب ان کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا ان کو بلا کر لاؤ ورنہ میں بھی گفتگو میں شریک نہیں ہوں گا۔ کس قدر لگاؤ تھا ان بزرگوں کو اپنے چھوٹوں سے اور کیا مقام تھا ان چھوٹوں کا بڑوں کے دلوں میں! اللہ اکبر!

مارچ ۱۹۳۳ء میں ملتان جیل سے مولانا احمد سعید، حضرت مفتی اعظم سے پہلے رہا ہوئے

تو حضرت نے ان کی جدائی پر اپنے دلی جذبات کا یوں اظہار فرمایا:

چل دیا وہ حال دل سے بے خبر — جان و دل کا ہے سفر جس کا سفر
جس سے وابستہ تھیں میری راحتیں — جانتا تھا میں جسے قلب و جگر
کنج تنہائی کا میرے تھا رفیق — مونس جاں تھا سفر ہو یا حضر
مولوی احمد سعید خوش لقا — واعظِ آتش بیاں جادو اثر
شیر دل، کانِ مروّت، سیر چشم — پیکرِ صدق و وفا والا گہر
ناظم جمعیۃ اعلام ہند — تجربہ کار و امین و باخبر
چھوڑ کر زنداں میں مجھ کو چل دیا — پھیر لی اُنس و محبت کی نظر
تیری فرقت کا تصور الغیاث — الحذر تیری جدائی الحذر
تیرے دم سے قید خانہ باغ تھا — اور ترے اخلاق تھے اس کے ثمر
چونکہ راضی بالقضا تھا اس لیے — قید کا مطلق نہ تھا تجھ پر اثر
تھی بدولت تیرے بزمِ عیش گرم — جیل میں دن رات اور شام و سحر
ملک تیری دوستوں پر وقف تھی — جان بھی دیتا کوئی لیتا اگر
رعب و ہیبت سے تری اے مردِ حق — فوج باطل ہو گئی زیر و زبر
ہیبتِ حق تیرے چہرے سے عیاں — لرزہ براندام تجھ سے شیر نو
یہ حقیقت ہے کہ کرتی ہے تری — خوش بیانی دل میں پتھر کے اثر
بے شبہ ہے تیری تقریر بلیغ — دل نشینی میں کنقش فی الحجر
باغ جمعیۃ مساعی سے تری — سبز و شاداب و شگفتہ پر ثمر
تیرا دل ہے مال و زر سے بے نیاز — فضل حق پر رہتی ہے ہر دم نظر
دیکھ کر قربانیاں تیری ہمیں — یاد آتے ہیں خلیل نامور
حق ترا حامی ہو اور طالع سعید — اور قدم چومے ترے فتح و ظفر
ہو تری اولاد تیری جانشیں — مثل تیرے بلکہ فائق ہوں پسر
کارناموں کو ترے زندہ رکھیں — اور ہر ایک ان میں ہو سرِ پدر

اور ہو دارین کی آفات سے	فضل مولیٰ واسطے تیرے سپر
مورد الطاف باری تو رہے	عمر بھر ہر سال ہر شام و سحر
پھولتے پھلتے رہیں تیرے فیوض	صیت ہو تیرا محیط بحر و بر
لطف سے تیرے ہے اُمید قبول	پیشکش ہے گرچہ میری محقر

محمد کفایت اللہ عفاعنہ مولانا اسیر سیاسی اے کلاس۔ نیو سنٹرل جیل ملتان بارک نمبر ۱۱ کمرہ نمبر ۴۔ مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۳۳ء مطابق ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ

اکثر مسلم لیگی مسلمان کہا کرتے تھے کہ مولانا کفایت اللہ تو بچارے سیدھے سادے اور نیک آدمی ہیں۔ ان کو تو مولوی احمد سعید نے بہکا رکھا ہے۔ یہ غلط فہمی ان کو اس لیے ہوتی تھی کہ حضرت مفتی صاحب کم گو اور سنجیدہ تھے۔ عام آدمی کو ان سے کھل کر اور بے باک ہو کر بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ان کی اصابت رائے اور فہم و تدبر کو انھیں کے مرتبے کے لوگ مانتے تھے یا ان کے اکابر جانتے تھے۔ مولانا احمد سعید ہنسوڑ تھے ہنسی مذاق کے عادی تھے۔ الیکشن بھی لڑاتے تھے اور عمدہ لڑاتے تھے۔ یہ پرہیزگار لوگوں کا کام نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔ عمر بھر میں انھوں نے صرف ایک الیکشن میں دلچسپی کا اظہار ضرور فرمایا مگر محض زبانی تائید و حمایت تک۔ اس سے زیادہ نہیں۔ یہ ملا واحدی کا الیکشن تھا۔ واحدی صاحب پہلی مرتبہ میونسپل الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ حق یہ ہے کہ واحدی صاحب کا کردار بھی اس پایہ کا کردار تھا کہ حضرت مفتی صاحب جیسے محتاط اور عالی نظر انسان کی توجہات کو اپنی طرف کھینچ سکتا تھا۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری اور اہل شہر نے ان کی کامیابی پر جیسی خوشی منائی تھی شاید ہی کبھی منائی ہو۔ بڑا لمبا جلوس تھا جو ٹاؤن ہال سے چلا تھا۔ جلوس جب کوچہ چیلاں میں داخل ہوا تھا تو واحدی صاحب پہلے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان سے گلے مل رہے تھے اور ان کی توجہات پر ممنونیت کا اظہار کر رہے تھے۔

غرضکہ عوام یا تو حضرت مفتی صاحب کے اور مولانا کے تعلقات کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ ان کے بہکائے ہوئے ہیں اور یا یہ بات تھی کہ حضرت مفتی صاحب کی عظمت اور تقدس

ان کے دلوں پر اس قدر غالب تھا کہ ان کی کانگریسیت کو بھی مولانا احمد سعید کے سر تھوپ دیتے تھے۔ یعنی کانگریسیت ایک ایسی بدنما چیز تھی کہ مفتی صاحب کے احترام کی وجہ سے ان کی طرف اس لفظ کو منسوب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جو کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنی طرف سے اپنی وضعداری کو آخر تک نباہ دیا اور مولانا کی طرف سے شاید کبھی ان کو کوئی رنجش یا کدورت نہ ہوئی ہوگی۔ ورنہ کبھی نہ کبھی اس کا اظہار ضرور ہوتا۔ ایک بحرِ ذخار میں بڑے بڑے دریا گر کر گم ہو جاتے ہیں۔

مدرسۂ امینیہ کا اہتمام:

حضرت مفتی اعظمؒ کے مرض وفات میں مدرسۂ امینیہ کی ضروری میٹنگ مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کو مکان پر منعقد ہوئی۔ آیندہ کے انتظامات کے سلسلے میں اہم غور وغوض کرنا تھا۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے صراحۃً کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا۔ یہ معاملہ مجلس کے زیر غور تھا کہ مدرسہ کا انتظام کس کے سپرد کیا جائے۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ''بھئی میں نے کبھی کسی بات پر فخر نہیں کیا لیکن اس بات پر مجھے فخر ہے اور ہمیشہ اس کی مسرت رہے گی کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے آخری لمحات تک مجھ پر اعتماد فرمایا یعنی جب مجلس کے ارکان نے حضرت سے اس بارے میں کچھ ارشاد فرمانے کی اور اپنا خیال ظاہر فرمانے کی خواہش کی تو حضرت نے زبان سے کچھ نہیں فرمایا اور میری طرف اشارہ کر دیا۔

چونکہ بطور دور اندیشی کے یہ امر زیرِ غور لایا گیا تھا اس لیے عارضی طور پر چیکوں کے اوپر دستخط کرنے کا اختیار حکیم شریف الدین صاحب بقائی کو دے کر جلسے کو ملتوی کر دیا گیا اور حضرت کی وفات کے بعد مورخہ ۱۳؍ جنوری ۱۹۵۳ء کے جلسے میں مولانا کو مدرسے کا مہتمم اور راقم الحروف کو نائب مہتمم بنایا گیا۔ آپ نے انکار فرمایا لیکن حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد نور اللہ مرقدہ کے شدید اصرار پر کچھ عرصے کے لیے آپ نے اعزازی عہدۂ اہتمام قبول کیا اور تقریباً دوڈھائی سال کے بعد راقم الحروف کی عزت افزائی فرما کر خود مستعفی ہو گئے۔ مگر مدرسے کی سرپرستی اپنی زندگی کے آخری لمحات تک فرماتے رہے اور ہر امر میں مشورہ دیتے رہے۔

اعلیٰ حضرت اور سحبان الہند:

خلافت بنی اُمیہ کے زمانے میں عرب میں باہلی قبیلے کا ایک شخص سحبان وائل تھا۔ یہ شخص اعلیٰ درجے کا فصیح و بلیغ اور لسان خطیب تھا۔ ادب ولغت پر اتنا حاوی تھا کہ اپنی تقریر میں کوئی لفظ مکرر نہیں لاتا تھا۔ ایک مضمون کو جب دوسرے وقت بیان کرتا تھا تو نئے الفاظ میں نئے اسلوب سے بیان کرتا تھا۔ جس طرح حاتم طائی کی سخاوت و جوانمردی اور رستم کی طاقت ضرب المثل ہے اسی طرح سحبان کی فصاحت و بلاغت نہ صرف عرب میں بلکہ دنیائے اسلام میں ضرب المثل ہے۔

ہندوستان کے اہل علم نے جب مولانا کے اندر اعلیٰ درجے کی بلاغت اور شیریں بیانی پائی تو سحبان الہند کا خطاب دیا اور واقعی یہ خطاب آپ کی شان کے لائق تھا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو ہمیشہ اعلیٰ حضرت کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا کے سفر:

ہندوستان کا تو شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو جہاں مولانا تشریف نہ لے گئے ہوں۔ ان سفروں کی تفصیل لکھنا دشوار ہے۔ البتہ بیرون ہند کے دو تین سفر لکھے جاتے ہیں۔

آپ نے پہلا حج ۱۹۱۴ء/۱۳۳۲ء میں کیا تھا۔ دہلی کے ایک متمول تاجر جن کا نام غالباً حاجی احمد جان تھا۔ آپ کو اپنے خرچ پر لے گئے تھے۔ اس سفر میں آپ نے جو خطوط مولانا امین الدین مہتمم مدرسہ کے نام بھیجے وہ بجنسہٖ نقل کرتا ہوں۔

پہلا خط: مکرمی و معظمی سیدی ومولائی جناب مہتمم صاحب قبلہ زید مجدکم۔

السلام علیکم! الحمد للہ بندہ بخیریت تمام مکہ مکرمہ پہنچ گیا تادمِ تحریر بخیریت ہے۔ آپ کی خیریت ومیاں سعید الدین کی سعادت اور مدرسہ امینیہ کی مقبولیت کے لیے وقتاً فوقتاً دعا کرتا

رہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

مصر، بیت المقدس، دمشق، مدینہ منورہ سے مختصر کیفیت اپنے سفر کی لکھتا رہا ہوں۔ غالباً نظر سے گزری ہوگی۔ البتہ تادم تحریر آپ کی خیریت کو آنکھیں ترس رہی ہیں۔ اگر آپ کو میری حالت زار پر ترس آ جائے تو براہِ کرم اپنی خیریت کا خط بمبئی کٹلری بازار حاجی محبوب بخش سراج الدین کی دکان پر روانہ فرما دیجیے۔ غالباً بشرط زندگی یکم محرم تک بمبئی پہنچنا ہوگا۔ جی تو یہ چاہتا تھا کہ جہاز سے اُترتے ہی آپ حضرات کی صورت دیکھتا لیکن اگر یہ ممکن نہیں تو کم از کم آپ صاحبان کی خیریت کے خطوط تو نظر سے دیکھ لوں۔ قدرے کیفیت مولائی وآقائی جناب مولوی کفایت اللہ صاحب کے خط میں ملاحظہ فرمالیں۔ جملہ معلمین و متعلمین کی خدمت میں سلام علیک۔ ایچ اے مرزا اور ان کے بھائیوں کو سلام علیک۔

آپ کا ادنیٰ خادم بندہ احمد سعید دہلوی۔ از مکہ مکرمہ ۱۶ ذی قعدہ ۳۲ھ

دوسرا خط: سیّدی ومولائی مکرمی ومحترمی ومخدومی جناب قبلہ مہتمم صاحب زید مجدکم السلام علیکم الحمدللہ بندہ مع الخیر والعافیہ دوشنبہ کے روز ۴؍محرم کو ۳ بجے بمبئی پہنچا۔ جناب کا عنایت نامہ مطالعہ کیا۔ دل کو نہایت مسرت وسرور حاصل ہوا۔ خدا تعالیٰ آپ کو ہمیشہ زندہ وتندرست رکھے۔ مولانا! باللہ العظیم آپ کے خلوص ومحبت نے مجھے میرے والدین کو بھلا دیا۔ میں جناب کو اپنے والد کے قائم مقام سمجھتا ہوں اور یقین ہے کہ آپ بھی مجھے اپنا بیٹا ہی خیال کرتے ہوں گے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ نالائق اولاد ہوں کوئی خدمت جناب کے احسانات کے صلے میں نہیں کر سکتا۔ جناب والدہ صاحبہ کی علالت سے دل نہایت رنجیدہ ہے۔ خدا تعالیٰ ان کو صحت کلی عنایت کرے اور ہمارے سر پر عرصہ دراز تک قائم رکھے۔ تمام سفر میں آپ حضرات کی یاد سے دل بے چین رہتا تھا۔ خداوند کریم کی رحمت سے اُمید ہے کہ عنقریب خدمت عالی میں حاضر ہو کر قدمبوسی سے مشرف ہوں گا۔ انشاء اللہ جمعرات کی صبح کو متھرا لائن سے روانہ ہو کر جمعہ کی شام کو ۷ بجے دہلی جنکشن پر پہنچوں گا۔ جملہ طلبائے مدرسہ وحضرات مدرسین کی خدمت میں سلام علیک۔ بھائی حافظ سعید الدین کو سلام علیک۔ ایچ اے مرزا، منشی یامین، عبدالٰہی، بابو صاحب، فضل الرحمٰن، خلیل الرحمٰن کو سلام علیک۔ والسلام۔ بندۂ نیاز احمد سعید دہلوی۔ ۵؍محرم

الحرام ۱۳۴۳ھ بروز سہ شنبہ۔

اس کے بعد ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء میں دوسرا حج کیا اور تمام عالم اسلام کی مؤتمر مکہ میں شرکت کر کے مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے مؤتمر کی شرکت کے لیے جو وفد بھیجا گیا تھا آپ بھی اس کے رکن تھے جمعیۃ کے وفد کے ارکان مندرجہ ذیل تھے:

حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صدر وفد، مولانا عبدالحکیم صدیقی پرائیویٹ سیکرٹری صدر وفد، مولانا محمد عرفان سیکرٹری وفد، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد سعید، مولانا نثار احمد، ارکان وفد۔

خلافت کمیٹی کا وفد مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل تھا:

مولانا سید سلیمان ندوی صدر وفد، مسٹر شعیب قریشی سیکرٹری وفد، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، ارکان وفد۔ علاوہ ازیں تقریباً چار سو علماء وزعماء ہندوستان سے اس سفر حج میں ہم سفر تھے۔

۱۳۵۶ھ/۱۹۳۸ء میں حضرت مفتی اعظمؒ کے ساتھ برما کا سفر کیا اور تقریباً ۳ ماہ میں واپسی ہوئی۔ برما کے مسلمان عرصے سے حضرت مفتی صاحب کی زیارت کے آرزومند تھے۔ اکثر تقاضا ہوتا رہتا تھا۔ آپ کے تشریف لے جانے سے بہت مسرور ہوئے۔ دارالسلطنت رنگون کے علاوہ برما کے متعدد شہروں میں ہر دو حضرات کی تقریریں ہوئیں۔ حضرت کی کم اور مولانا احمد سعید کی زیادہ۔ اس سفر کی وجہ سے مدرسۂ امینیہ کو کافی مالی امداد ملک برما سے حاصل ہوگئی تھی۔

داستان لحد:

حضرت مفتی اعظمؒ کے مرض وفات میں جبکہ تیمارداروں پر مایوسی طاری ہوگئی تو راقم الحروف کے دل میں تدفین کے بارے میں خلجان پیدا ہوا۔ دل میں یہ آرزو تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قرب وجوار میں جگہ تجویز کی جائے تو مناسب ہے۔ ارادہ تھا کہ موقعہ آنے پر ظاہر کر دوں گا اور اسی کی کوشش کروں گا۔ اسی دوران میں خواجہ ہلال قطبی نے مجھ کو بتایا کہ مولانا احمد سعید اور حضرت مفتی صاحب نے اپنے لیے مہرولی میں جگہ تجویز کر رکھی ہے۔

پھر ایک روز مولانا نے بھی مجھ سے ذکر فرمایا اور کہا کہ مفتی صاحب کا عندیہ معلوم کرلو۔ مگر میری آرزو تو کچھ اور تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ خود دریافت فرما لیجیے۔ مولانا نے مفتی صاحب کے سامنے یوں ذکر چھیڑا کہ حضرت آپ کو یاد ہوگا۔ مہرولی میں آپ کے لیے اور میرے لیے دو قبروں کی جگہ محفوظ ہے۔ حضرت نے اشارے سے صرف اتنا فرمایا۔ ہوں! مراد یہ تھی کہ یاد ہے۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اس کے آگے نہ مولانا کی کچھ ہمت پڑی بولنے کی نہ حضرت نے کچھ فرمایا۔

۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کی شام رات کے ساڑھے دس بجے حضرت کی وفات ہوئی۔ غسل میت سے فارغ ہو کر مردانہ بیٹھک میں رات کے ۲ بجے مقام تدفین پر بحث شروع ہوگئی۔ سات آٹھ حضرات موجود تھے۔ شدید اختلاف ہوا۔ مولانا احمد سعید نے جب اپنی تجویز پیش کی تو مولوی سمیع اللہ نے اس کی شدید مخالفت کی اور اپنی تجویز یعنی جامع مسجد کی باغیچی میں دفن کیے جانے پر زور دیا۔ ان کی زبردست دلیل یہ تھی کہ وہاں فاتحہ پڑھنے کون جائے گا۔ حکیم حاجی شریف الدین بقائی بھی مہرولی کی تجویز کے خلاف تھے۔ جب اختلاف زیادہ ہوا تو راقم الحروف کو بلایا گیا اور یہ طے کرلیا گیا کہ آخری رائے حفیظ الرحمٰن کی رائے ہوگی اور اسی پر عمل کیا جائے گا۔ میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری دلی آرزو تو یہ تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے احاطے میں تدفین ہو لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے مہرولی کی تجویز کا واقعہ پورے طور پر سننا چاہتا ہوں۔ چنانچہ مولانا نے اور حکیم شریف الدین صاحب نے واقعہ سنایا۔ اس پر میں نے سوالات کیے۔ تنقیحات پیش کیں اور نکھر نکھرا کر مندرجہ ذیل تفصیل سامنے آئی۔

''پندرہ سولہ برس پہلے کی بات ہے۔ مولانا احمد سعید نے کوشش کی کہ درگاہ حضرت خواجہ کاکیؒ کے اندر دو قبروں کی جگہ مل جائے۔ مگر بغیر معقول نذرانے کے جگہ ملنی ممکن نہ تھی۔ پہاڑی بھوجلا کے رہنے والے ایک صاحب خلیفہ محمد ولی نام بازار چتلی قبر میں رہتے تھے۔ یہ نیاز علی گوٹہ والے ساکن گلی اڈن محلہ پہاڑی بھوجلا کے فرزند تھے اور ان حضرات سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ جب ان کو یہ بات معلوم ہوئی تو مولانا کے پاس آئے اور کہا کہ درگاہ شریف کے دروازہ کے متصل ظفر محل کے نیچے میری ایک خاندانی زمین ہے اور اس میں صرف دو قبروں کی جگہ باقی

ہے۔ میں وہ آپ کو نذر کرتا ہوں۔ اگر آپ پسند فرمالیں اس کے بعد یہ طے ہوا کہ اس جگہ کو دیکھ لیا جائے۔ دن اور وقت متعین کرلیا گیا تانگہ میں حضرت مفتی صاحب مولانا احمد سعید حکیم شریف الدین صاحب بقائی اور چوتھے خلیفہ محمد ولی صاحب بیٹھ کر مہرولی روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر جگہ کو دیکھا۔ حضرت مفتی صاحب نے جائے وقوع وغیرہ کو ملاحظہ فرما کر کوئی اظہار خیال نہیں فرمایا۔ اس سفر کے تمام وقت میں کوئی ایسا لفظ نہیں فرمایا جس سے اس جگہ کو اپنے لیے منتخب کر لینے یا متعین کر لینے کا مفہوم پیدا ہوتا ہو۔ اس کے بعد زندگی کے آخری لمحات تک کسی سے اس کا تذکرہ نہیں فرمایا۔ حد تو یہ ہے کہ گھر میں اپنی اہلیہ محترمہ سے اور اولاد تک سے ذکر نہیں فرمایا۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا احمد سعید نے وہاں دو سرداب بنوا کر محفوظ کرا دیے''۔

مولانا نے فرمایا کہ یہ بات بھی طے ہوئی تھی کہ پہلے جس کی وفات ہوگی اس کو مشرقی سرداب میں دفن کیا جائے گا۔

اس واقعہ کو سننے کے بعد میرے پیش نظر اِدھر تو اپنی دلی خواہش تھی اُدھر مولانا کی آرزو اور اس کے مطابق ان کے گزشتہ انتظامات۔ اگرچہ مولانا سے یا ان کی تجویز سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی مگر ان کے ساتھ حضرت کے نصف صدی کے تعلقات کا خیال کر کے میں نے یوں تقریر کی:

''اگرچہ میری دلی آرزو یہ تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قرب و جوار میں رکھا جائے۔ مگر اس واقعہ کو سننے کے بعد میں اپنی رائے پر مولانا کی رائے کو ترجیح دیتا ہوں۔ حضرت کا اُس جگہ کو ملاحظہ فرمانے کے لیے تشریف لے جانا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس جگہ کو پسند کرتے تھے اور وصیت نہ فرمانا حتیٰ کہ کسی سے ذکر نہ فرمانا اس لیے تھا کہ کسی خاص جگہ دفن ہونے کی وصیت کرنے کو آپ منع فرمایا کرتے تھے۔ (فقہا نے ایسی وصیت کو باطل لکھا ہے۔ وعلیہ الفتوی۔ کذا فی رد المختار شامی)

فیصلہ ہو گیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی اور سات برس بعد یہ عزیز شاگرد اور معتمد رفیق بھی ان کے پہلو میں جا سویا۔

بعض لوگوں نے مجھ کو سخت سست کہنا شروع کر دیا تھا۔ کافی عرصے تک یہ طعنے سنتا رہا کہ

اپنے والد کو اتنی دور لے جا کر ڈال دیا۔ قریب ہوتے تو روزانہ لوگ مزار پر فاتحہ پڑھتے اور زیارت کرتے اور میں نے تو اپنی آ... کہ مولانا کی رائے پر قربان کر دیا تھا اس کی بھی ایک ہلکی سی خلش خود میرے دل میں رہتی تھی۔

ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ میں حضرت والد مرحوم کی قبر پر زیارت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ وہ احاطہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اندر واقع ہے۔ دل میں سوچ رہا ہوں کہ ان کی قبر تو مہرولی میں تھی۔ شاید میں راستہ بھول گیا ہوں لیکن دل میں یہ یقین بھی ہے کہ یہ قبر انھیں کی ہے۔ یکا یک دیکھا کہ میرے برابر میں خود حضرت بھی کھڑے ہوئے ہیں اور میں دل میں حیران ہوں کہ کیا یہ خود ہی اپنی قبر کی زیارت کو تشریف لائے ہیں۔ خواب طویل ہے میں نے مختصر کر دیا ہے۔

میں نے حضرت الاسلام مولانا سید حسین احمد نور اللہ مرقدہ سے تعبیر چاہی۔ ارشاد ہوا کہ یہ خواب مبشرات میں سے ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ مہرولی میں مدفون ہیں مگر ان کی روح مبارک حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی روح انور کے ساتھ ہے۔

مرقد کا چبوترہ:

حضرت مفتی صاحب کی تدفین سے پہلے قبر کے آس پاس کے چبوترے کی منڈیر ٹوٹی ہوئی تھی اور جب تدفین کے وقت لوگوں کا بے پناہ اژدہام ہوا تو بالکل شکستہ ہوگئی۔ مولانا اکثر میرے سامنے کہا کرتے تھے کہ ارے بھئی چبوترے کی مرمت کرانی ہے اور میں چپ ہو جاتا تھا۔ ایک روز مستری اسلام الدین ساکن فرش خانہ میرے پاس آئے اور کہا کہ مولانا کے حکم سے میں نے مہرولی میں مدد لگا دی ہے۔ اب اس کے لیے روپوں کی ضرورت ہے۔ میرے استفسار پر مستری صاحب نے بتایا کہ منڈیر کی تعمیر میں تقریباً تین سو روپے یا کچھ زائد صرف ہوں گے۔ کیونکہ وہ از سرنو بنیاد کھود کر پختہ بنوائی جائے گی۔ پچاس روپے تو مولانا نے مجھے دیے تھے۔ سامان خرید لیا اور کام شروع کرا دیا ہے۔ سردست پچاس روپے اور لینے تھے۔ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ اب جا کر حفظ الرحمٰن سے لو۔ میں متفکر اور متعجب ہوا اور پھر گھر سے مبلغ سو روپے لیے مستری صاحب کو ساتھ لے کر مولانا کی خدمت

میں حاضر ہوا۔ پچاس روپے مولانا کی خدمت میں پیش کیے اور پچاس روپے مستری صاحب کو دیے مولانا نے فرمایا کہ بھئی یہ تو میں نے اپنی طرف سے مرمت کے لیے دیے ہیں۔ یہ کیوں مجھے واپس دے رہے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تکلیف نہ کیجیے میں خود ہی چبوترہ بنوادوں گا۔ فرمایا ارے بھئی میرا سردابہ بھی تو وہاں ہے اس لیے میری بھی کچھ ذمہ داری ہے۔ عرض کیا کہ حضرت جی! آپ کا بھی سردابہ وہاں ہے اور میرے والد وہاں دفن کیے جاچکے ہیں۔ آپ خادم کو یاد فرما کر چبوترے کی تعمیر کے متعلق مشورہ فرماتے اور کوئی معاملہ طے ہو جاتا تو اس کی نوعیت دوسری ہوتی لیکن آپ نے خادم کی لاعلمی میں مستری کو بلا کر اور پچاس روپے دے کر مدد لگوادی اور اب مستری صاحب کو میرے پاس بھیج دیا۔ اب تو یہ رقم میں منظور نہیں کروں گا۔ غرضکہ مولانا نے چپکے سے رقم واپس لے لی۔ منڈیر کی تعمیر میں مبلغ چار سو روپے صرف ہوئے۔ اس کے بعد میں نے مرقد مفتی اعظم تعمیر کرایا۔ اُس میں مزید تین سو روپے صرف ہوئے۔

دم واپسیں:

آپ کو عہد جوانی میں مرض سل لاحق ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے آپ کو تقریر کرنے سے منع کیا تھا۔ اُس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر بھی نہیں آیا تھا۔ بولنے میں قوت بھی زیادہ صرف ہوتی تھی مگر عمر بھر تقریریں کرتے رہے اور خوب تندرست رہے۔ بڑھاپے کا دور شروع ہونے پر غالباً پرانا مرض جاتا رہا تھا مگر دوسرے امراض نے آ گھیرا تھا۔ اکثر اختلاج وغیرہ کی شکایت رہی تھی۔ ۱۹۴۵ء سے آپ بہت زیادہ نحیف ہو گئے تھے۔ وفات سے دو تین برس قبل سے ڈاکٹر کہتے تھے کہ مولوی جی زندہ کیونکر ہیں۔ ان کا دل تو جواب دے چکا ہے۔ انھیں میں سے بعض یہ کہتے تھے کہ مولوی جی کو تو غریبوں کی دعاؤں نے روک رکھا ہے۔ غرضکہ دو تین برس سے دل کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ مگر خدمت خلق میں کوتاہی نہ ہوتی تھی۔

مورخہ ۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء مطابق ۳ جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ بروز جمعہ بعد مغرب حرکت قلب بند ہوگئی اور وہ بلبل ہزار داستان جس کی شیریں بیانی کا نصف صدی تک ڈنکا بجتا رہا سات بج کر دس منٹ پر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا اور کتاب اللہ کا وہ نقیب جس نے عمر بھر اللہ کی مخلوق کو اس کی آیات کا مفہوم سمجھایا دائمی نیند سو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوسرے دن بروز ہفتہ جنازہ مہرولی لیجایا گیا اور حضرت مفتی اعظم کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ یہ تھا ڈراپ سین اس عظیم الشان رفاقت کا جو ۱۳۳۶ھ سے بھی پہلے سے شروع ہوئی تھی اور زندگی میں بھی نباہی گئی بعد مردن بھی نباہی جارہی ہے۔ اعلی اللہ مقامھما ورفع درجاتھما۔

تاہل اور اولاد:

مولانا نے اپنی پہلی اہلیہ کو چھوڑ دیا تھا۔ ان سے دو اولادیں ہوئی تھیں جو صغیر السن ہی فوت ہوئیں موجودہ اہلیہ محترمہ صوفی حکیم ممتاز احمد ہاشمی کی بہن ہیں۔ مولانا نے ایک اہلیہ محترمہ اور چار صاحبزادے چار صاحبزادیاں چھوڑی ہیں۔ صاحبزادوں میں سب سے بڑے مولانا حافظ محمد سعید صاحب میونسپل کونسلر مالک دینی بک ڈپو ہیں۔ آپ بھی مدرسۂ امینیہ کے فارغ التحصیل عالم اور حضرت مفتی اعظمؒ کے شاگرد رشید ہیں۔ اللہ تعالیٰ سلامت رکھے۔ دارین میں درجات بلند فرمائے اور اُن آفات سے محفوظ رکھے جو بڑوں کے اُٹھ جانے کے بعد ہر چار طرف سے ہجوم کرتی ہیں۔ آمین۔

مولانا مرحوم نے اپنے ذاتی دو مکان چھوڑے ہیں۔ پہلا زنانہ مکان تھا جو کوچہ ناہر خاں میں واقع ہے۔ دوسرا بعد میں خریدا اور بنوایا۔ یہ مردانہ مکان کٹرہ مہر پرور میں واقع ہے۔ آپ اسی میں رہتے تھے اور اسی میں وفات پائی۔

عام اخلاق وعادات:

یہ عنوان بظاہر تو بہت آسان ہے مگر دراصل اس پر کچھ لکھنا بہت مشکل۔ بنی نوع انسان میں ہر فرد کا زاویہ نظر مختلف ہوتا ہے۔ ایک ہی شخص کے متعلق رائے قائم کرتے والے مختلف رائیں قائم کرتے ہیں اور خاص کر مولانا مرحوم کی زندگی تو ایسی عجیب وغریب زندگی تھی کہ اس کو مجموعہ اضداد کہا جائے تو بجا ہے۔

جن لوگوں کو کسی بزرگ کے ساتھ حد سے زیادہ عقیدت ہوتی ہے وہ اپنے ممدوح کے متعلق معمولی واقعات کو کرامت پر محمول کرتے ہیں۔ ایک مرشد کا واقعہ ہے کہ ان کے ہاں تین مہمان آئے ہوئے تھے اور اسی قدر کھانا تیار کرایا گیا تھا۔ جب کھانا تناول کرنے کے لیے

دسترخوان بچھایا گیا تو اتفاق سے پانچ مہمان اور آ گئے۔ ان کو بھی دسترخوان پر بٹھالیا گیا۔ آپ نے ہاتھ دھونے شروع کر دیے۔ جب مریدوں نے مرشد کو ہاتھ دھوتے دیکھا تو ان سب نے بھی ہاتھ دھونے شروع کر دیے۔ اگرچہ کسی نے ایک کسی نے ڈیڑھ چپاتی سے زیادہ کھانا نہ کھایا تھا۔ مگر ہر جگہ حضرت کی یہ کرامت مشہور ہوگئی کہ تین چار آدمیوں کا کھانا آٹھ نو آدمیوں کے لیے کافی ہو گیا۔ غرضکہ عقیدت کی زیادتی عقیدت مندوں کو مبالغہ پر آمادہ کرتی ہے اور بعض مرتبہ گھڑنت پر اُبھارتی ہے۔

مولانا احمد سعید کے اندر سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ان میں جو کمزوریاں تھیں وہ بھی ظاہر تھیں اور جو کمالات قدرت نے ان کو عطا فرمائے تھے وہ بھی واضح اور روشن۔ ان کی مجلس میں حاضر ہونے اور ان کی ظرافت سننے کے بعد بعض ناواقف حضرات ان کے چال چلن کی طرف سے بدگمان ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ ان کی محض زبانی دل لگی تھی۔

علم وفضل کے ساتھ وجاہت اور ڈیل ڈول بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ اپنے اساتذہ اور اکابر کے ساتھ جب وہ کسی مجلس میں بیٹھے ہوتے تھے تو آنے والا اجنبی شخص سب کو چھوڑ کر انھیں کی طرف بڑھ کر مصافحہ کرتا تھا۔

مولانا کی ایک خاص آن یہ تھی کہ تنہا کبھی نہیں رہے۔ جب کبھی گھر سے باہر نکلتے تھے تو کوئی نہ کوئی ساتھ ضرور ہوتا تھا اور واپسی بھی اسی طرح ہوتی تھی۔ اگر کہیں راستے میں ساتھی جدا ہو جاتا تو اور کسی کو پکڑ لیتے تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند کے قیام کے بعد کام کی زیادتی کی وجہ سے تقریباً روزانہ بعد عشاء حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں مکان (واقعہ گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیز) پر آتے تھے۔ واپسی کے وقت رات زیادہ ہو جاتی تھی۔ راقم الحروف کے حقیقی ماموں مولوی قیام الدین نادر کی یہ مستقل ڈیوٹی تھی کہ وہ ان کے ساتھ جاتے تھے اور گھر تک پہنچا کر آتے تھے۔

ہر حال میں خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کے عادی تھے۔ مزاج معتدل تھا۔ غصہ بہت کم آتا تھا۔ تندرستی کے زمانے میں خوراک اپنے تن و توش کی مناسبت سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ علم مجلسی میں کمال حاصل تھا۔ مشتعل آدمی کو چند باتوں میں ٹھنڈا کر دینا ان کے لیے ایک

معمولی بات تھی۔

فربہی کی وجہ سے بظاہر کاہل الوجود تھے اور بغیر سواری کے آنا جانا مشکل تھا۔ مگر بار بار یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ضرورت کے وقت میلوں کا پیدل سفر کر لیتے تھے اور سفر کی حالت میں بے انتہا پھرتیلے ہو جاتے تھے۔ وفات سے تیرہ چودہ برس قبل فربہی جاتی رہی تھی۔ اس کی جگہ ضعف و نقاہت طاری ہو گئی تھی۔

تراویح کی جماعت گھر میں ہی ہوتی تھی۔ خود قرآن شریف سناتے تھے اور کھڑے اس وقت ہوتے تھے جبکہ لوگ سب جگہ سے تراویح پڑھ کر اپنے گھروں میں واپس آ جاتے تھے۔ رمضان شریف میں رات کو تو شاید آدھا گھنٹے آرام کے لیے ملتا ہوگا۔ البتہ دن میں زیادہ آرام کر لیتے تھے۔

بیس پچیس برس سے مردانہ مکان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس مکان میں پہلوان محمد اسماعیل غوری، عبدالحمید تیل والے اور چند آدمی آپ کی خدمت میں مستقل طور پر رہتے اور رات کو بھی سوتے تھے۔

ہر جگہ آپ اپنا ایک خاص مجلسی ماحول پیدا کر لیتے تھے۔ مفتی صاحب کے ساتھ جب سفر کا اتفاق ہوتا تھا تو قیام گاہ سے علیحدہ بے تکلف دوستوں کی ایک مجلس جما کرتی تھی۔ مولانا میر مجلس ہوتے تھے کیونکہ اکابر کی معیت میں کھل کر خوش طبعی نہ ہو سکتی تھی۔ تمام کاموں سے فارغ ہو کر اکابر کے آرام و راحت کے انتظامات کر کے دوستوں میں جا بیٹھتے تھے۔ ہر شہر میں ان کے اس قسم کے یاران محفل موجود تھے اور اگر نہیں ہوتے تھے تو پیدا کر لیتے تھے۔

سفارش کے معاملے میں بہت فیاض واقع ہوئے تھے۔ اس کے موثر اور غیر موثر ہونے سے کچھ سروکار نہ تھا۔ بس سفارش تحریر فرمانے سے کام تھا۔

اس میں شک نہیں کہ بہ تقاضائے بشریت مولانا کے اندر کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔ جن کی وجہ سے بعض لوگ ان سے ناخوش اور بدگمان ہو جاتے تھے اور اگر کبھی کوئی زاہد خشک پہلی مرتبہ ان کی خاص بے تکلفی کی محفل میں آ پھنستا تھا تو بہت ہی وحشت زدہ ہو جاتا تھا لیکن باوجود اس کے جب ہم ان کی پچاس برس کی مسلسل خدمات پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا

ہے کہ ان کی ایک معمولی سی دینی وقومی خدمت دوسروں کے سالہا سال کے مجاہدہ وریاضت سے بدرجہا بلند وبرتر ہے۔ سیاسی مسلک میں بھی وہ ہمیشہ اپنے اکابر کے راستے پر قائم رہے۔ آزادیٔ وطن کی تحریک میں جبکہ بڑے بڑے مجاہد لیڈروں کے قدم ڈگمگا گئے تھے مولانا کے قدموں میں لغزش نہ آئی۔

ان کی عظیم الشان خدمات کو یاد کر کے آج ہم ان کے اُٹھ جانے کے بعد ان کی کمی محسوس کر رہے ہیں اور ان کی جگہ کو خالی دیکھ کر ایسا محسوس کر رہے ہیں کہ ہم نے ایک بہت بڑا مربی اور سرپرست کھو دیا ہے۔ خوش نصیب تھے وہ لوگ جو اس عبرت آباد حوادث میں ہنستے ہنساتے زندگی گزار گئے اور اپنی یاد دلوں میں چھوڑ گئے۔ کاش کہ ہمارے لیے یہ عبرتیں اپنے سفر کی تیاری کا سامان بن جائیں۔ واللہ ولی التوفیق والیہ المرجع والمآب۔

سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی

(حاجی انیس دہلوی)

حضرت داغ دہلوی نے کیا خوب کہا ہے:

فغاں میں آہ میں فریاد میں شیون میں نالے میں
سناؤں دردِ دل طاقت اگر ہو سننے والے میں

آج کا دہلی شہر جو کبھی شاہجہاں آباد کہلاتا تھا۔ اب دُور دُور تک پھیل گیا ہے۔ ہر جگہ انسانوں کا ہجوم نظر آتا ہے لیکن انسان دوستی کی وہ صورتیں اب کہاں؟ جن کے دم سے دلی کی روایتی تہذیب، مہمان نوازی اور غربا پروری کا شہرہ تھا۔ ان ہی میں سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی بھی تھے، جنہوں نے مرتے دم تک دہلوی تہذیب کو زندہ سلامت رکھا۔ مولانا احمد سعید دلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ محمد نواب مرزا تھا۔ جن کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا اور اپنے آبائی قبرستان چونسٹھ کھمبے میں دفن ہوئے۔ مولانا کے بہت سے عزیز قبرستان مہندیاں میں بھی دفن ہیں۔ مہندیاں کا ابتدائی بڑا دروازہ مولانا کے نام سے ہی منسوب ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ پھر کئی عربی مدارس اور علمائے کرام سے درس حاصل کیا جن میں مولانا راسخ دہلوی کا نام بھی شامل ہے۔ آخر میں علوم دینیہ کی باقاعدہ تکمیل حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ کی نگرانی میں مدرسۂ امینیہ میں پوری کی۔

آپ کے بزرگ کشمیر سے ہجرت کر کے دلی آئے تھے۔ مولانا بتایا کرتے تھے کہ ہم لوگ کشمیری کٹرے کے رہنے والے تھے جہاں ان دنوں پتھر والا کنواں اور لاجپت رائے مارکیٹ ہے۔

مولانا واصف دہلوی کا کہنا ہے کہ میری تحقیق کے مطابق کشمیری کٹرہ فیض گنج دریا گنج میں اکبرآبادی بیگم کی مسجد کے پاس تھا جسے مرزا غالب نے کشمیری کٹرے کی مسجد لکھا ہے۔ جس میں شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن مجید کا ترجمہ لکھا تھا اور اسی مسجد میں رہتے تھے۔ مسجد کی تصویر آثار

الصنادید میں موجود ہے۔ مسجد تو اب نہیں، صرف تصویر رہ گئی ہے، غالباً یہ مسجد بھنڈاری کے پاس چوک میں تھی۔ جہاں اب بھی کچھ کشمیری خاندان آباد ہیں۔

مولانا احمد سعید دلی کے اس تاریخی کوچے میں رہتے تھے جس سے ہندوستان کی ایک تاریخ وابستہ ہے۔ کوچہ چیلان دلی کی ممتاز شخصیتوں کی قیام گاہ رہا ہے جن میں حکیم مومن دہلوی، خواجہ میر درد، علی برادران، مفتی کفایت اللہ، بیرسٹر آصف علی اور ملا واحدی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا کے ہاں آٹھ اولادیں ہیں۔ چار لڑکے اور چار لڑکیاں۔

لڑکوں میں محمد سعید، مظہر سعید، محمود سعید اور حامد سعید تھے۔ بڑے لڑکے حافظ مولوی محمد سعید کا انتقال ۱۵ دسمبر ۱۹۶۵ء کو ہوا اور دوسرے لڑکے مظہر سعید بھی ۱۹ جنوری ۱۹۶۸ء کو انتقال فرما گئے دونوں لڑکے اپنے والد کے قریب ہی دفن ہیں۔

چار لڑکیوں میں سعیدہ بیگم، مسعود بیگم، محمودہ بیگم، اور فہمیدہ بیگم ہیں۔ جن میں سعیدہ بیگم ۱۱ جنوری ۱۹۸۳ء کو اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔ مولانا کی اہلیہ محترمہ کا انتقال مولانا کی وفات کے ٹھیک سترہ سال بعد ۳ دسمبر ۱۹۷۶ء کے دن ہوا۔

مولانا کی شخصیت بے حد جاذب نظر تھی۔ سنا ہے جوانی میں اُن کے حسن کا سارے شہر میں چرچا تھا۔ بحیثیت واعظ وہ مردوں سے زیادہ عورتوں میں مقبول تھے۔ کہتے ہیں مولانا حسن پرست بھی تھے حسن وخوبصورتی دیکھ کر اس کی تعریف بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا ملا واحدی کو اپنے ایک خط میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

> ''آج کا دستور ہے کہ محبوب اور مطلوب کو چھریاں دکھا کر رام کرتے ہیں۔ پناہ بخدا یہاں تو برسوں خوشامد کرتے گزر جاتی ہے جب کہیں جا کر کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ کہیں نہیں بھی ہوتی ہے لیکن جو کامیابی میسر ہوتی ہے وہ پرلطف اور پرسرور ہوتی ہے''۔

مولانا کا قلمی چہرہ کچھ اس طرح تھا کہ سرخ وسفید رنگ، دمکتا ہوا چہرہ، بلند و بالا قد، چوڑا چکلا جسم، لمبے لمبے ہاتھ جو چلتے وقت آگے کم اور پیچھے زیادہ جھولتے تھے، بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، جس میں دلی کی تہذیب اور اُس کے عروج وزوال کی بے شمار جھلکیاں پنہاں تھیں۔

پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ، اُونچی ناک، پیشانی پر علم وصداقت کا روشن آفتاب، ناتراشیدہ سفید بھرواں داڑھی، جس پر کبھی کبھی پان کے سرخ قطرے شبنم کی طرح رقصاں نظر آتے، انداز گفتگو نہایت نرم وشیریں، کبھی کبھی دوران گفتگو مصنوعی دانتوں سے ہوا نکل جاتی اور بتیسی باہر آ گرتی۔ بدن پر بنیان یا بنڈی، اس پر لمبا کرتا اور ایک ڈھیلی ڈھالی واسکٹ، موسم سرما میں روئی کی دو صدریاں، ایک آدھی آستین کی ایک پوری آستین کی گھٹنوں تک زیب تن کرتے، گھر میں سلا ہوا تہمد، باہر جانا ہوتو چوڑی موری کا پاجامہ، پیر میں موزے بغیر بند کا جوتا یا سلیم شاہی جوتی، عربی چغے کے ساتھ سر پر دوپلی ٹوپی کے اوپر عربی رومال اس انداز سے بندھا ہوتا کہ دیکھ کر عرب مجاہدوں کی جلالت آنکھوں کے روبرو رقصاں ہو جاتی۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ آپ حافظ قرآن تھے، عالم و فاضل تھے، مفسر قرآن تھے، زیارت بیت اللہ شریف سے کئی بار فیضیاب ہوئے، صوفی منش ارباب تصوف کے قدر دان، اہل فقر سے ایسی محبت کہ اپنے آپ کو فقیر لکھنا باعث فخر سمجھتے۔ ادیب، سخن داں و سخن شناس، نازک خیال شاعر، دلی مرحوم کی ٹکسالی زبان کے ماہر، واعظ فرماتے تو روزہ مرہ اور محاورے کا مزا آجاتا۔

نثر نگاری میں یکتا، موقع محل اور مخاطب کے فہم وشعور کے مطابق جچی تلی بات کہنا، اپنے دل کی بات دلوں پر نقش کر دیتے تھے۔ میر کی طرح میاں......اور...... بھائی کہہ کہہ کر مخاطب کرتے، دلی کی تاریخی شائستگی اور تہذیب کے امین، غرضیکہ مولانا اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

مولانا شاعر بھی تھے اور اسیر تخلص فرماتے تھے۔ غالباً یہ تخلص مولانا کے زمانۂ اسیری کی یادگار ہے۔ شعر گوئی کے ساتھ حضرت مولانا کو شعر فہمی کا بھی خاص ملکہ تھا۔ چنانچہ جب کوئی شاعر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنا کلام سناتا تو پورے انہماک کے ساتھ اُسے سنتے اور داد سے بھی نوازتے۔ مستند اساتذہ کے بے شمار اشعار آپ کو یاد تھے۔ اکثر برمحل اور برجستہ انہیں پڑھ دیا کرتے تھے۔

ایک دن ایک صاحب بہادر سے ملنے گئے۔ صاحب نے بڑا انتظار کرایا، مولانا اپنے احباب سے باتیں کرتے اور انتظار فرماتے رہے اور جب ملاقات ہوئی تو بے ساختہ یہ شعر پڑھا:

ان ہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
اُن ہی کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات اُن کی

یہاں مولانائے مرحوم کے تعلق سے میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے ان کی مہذبانہ روش کا اظہار ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بزرگوں کے لیے کس قدر احترام تھا اور بزرگ بھی ان کی سخن فہمی سے کس قدر متاثر تھے۔

۱۹۱۰ء میں جب مولانا احمد سعید مدرسہ امینیہ میں زیر تعلیم تھے۔ طالب علموں کی جماعت اصلاح الکلام کی جانب سے باڑہ ہندوراؤ میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں نواب سائل دہلوی کا رسمی تعارف مولانا نے کراتے ہوئے کہا:

"شاہی زمانہ ہوتا تو نواب صاحب جیسے قادر الکلام اور فصیح و بلیغ شعرا کو خلعت ملتے، انعامات سے نوازے جاتے، ہم غریب طالب علم آپ کو سوائے دعا کے اور کیا دے سکتے ہیں"۔

نواب صاحب نے شعر سنانے شروع کیے، نواب صاحب کا رُخ مجمع کی طرف تھا۔ مولانا احمد سعید اسٹیج پر ہی بیٹھے تھے اور نواب صاحب کے ہر شعر پر انتہائی جوش و خروش سے داد دے رہے تھے۔ ان کا یہ عالم دیکھ کر نواب سائل نے مجمع کی طرف سے رُخ موڑا اور پوری طرح مولانا سے مخاطب ہو گئے۔ پنڈال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا مجمع سے آوازیں آنے لگیں، نواب صاحب! نواب صاحب ادھر بھی......! مجمع چیختے چیختے تھک گیا مگر نواب صاحب نے اُدھر کا رخ نہیں کیا۔

شعر و شاعری کا ذوق مولانا کو دورِ اسیری میں بھی جاری رہا۔

مولانا کو شعر و ادبی محافل اور مشاعروں سے خاص رغبت تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مشاعروں کی تہذیبی روایات بڑی حد تک زندہ تھیں اور ان کی زندگی اور بقا کے لیے اربابِ علم و فن ہر طرح کوشاں تھے، اسی سلسلے میں مولانا کی اس کوشش اور خواہش کا ذکر کیا جانا ضروری ہے جس کے تحت ہندوستان کی تاریخی عمارت لال قلعہ میں ۱۹۵۲ء میں یوم جمہوریہ کے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ مولانا کی اس کوشش کے پس پشت یہ جذبہ بھی شامل تھا کہ اس طرح

اہل دلی بہادر شاہ ظفر کی شعری عظمتوں کو بھی یاد کرتے رہے۔
لال قلعہ کا مشاعرہ بے حد اہتمام سے منعقد کیا گیا۔ صدر مشاعرہ مولانا ہی تھے۔ اس مشاعرے میں جوش ملیح آبادی نے حسب عادت ایسا کلام سنایا جس میں علمائے دین اور حور و غلمان کا مذاق اُڑایا گیا تھا۔ مشاعرے میں پنڈت نہرو کے علاوہ استاد بے خود دہلوی، بسمل شاہ جہان پوری، گوپال متل کے علاوہ دیگر اکابر شعرا بھی موجود تھے کسی کو بھی جوش صاحب کی یہ جرأت پسند نہیں آئی۔ سب نے احتجاج کیا۔ استاد بے خود نے جوشؔ کا کلام سن کر دلی کی زبان میں دو چار گالیاں دیں اور فرمایا:

بے خود نہ سمجھ خوب سمجھتا ہوں تجھے
شمع میرے ہی جلانے کو تو ٹھنڈی کر دی

پھر ایک مادر زاد گالی دے کر فرمایا:

بوڑھا ہوں مگر تاب جواں رکھتا ہوں — صورت پہ نہ جا حسن بیاں رکھتا ہوں
ملتی ہے مجھے دادِ فصاحت بے خود — میں قلعۂ دہلی کی زباں رکھتا ہوں

پنڈت جی نے جب یہ حالت دیکھی تو بے خود مرحوم کے پیر پکڑ کر دبائے تا کہ معاملہ ٹھنڈا ہو۔ مولانا نے جب مشاعرے کا رنگ بگڑتے دیکھا تو اپنی غزل بسمل شاہجہانپوری کو دیتے ہوئے کہا: ''لو بھئی اسے پڑھو اور چلو''۔

غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

زندگی سے اپنی گھبرا کر چلے — گھر سے آئے تھے پلٹ کر گھر چلے
بات میری خاک تم سن کر چلے — سیکڑوں الزام مجھ پر دھر چلے
تھا خلاصہ زندگی کا اس قدر — شام آئے شب سے پہلے گھر چلے
ساقیا ظاہر ہو یوں شانِ کرم — میکدے سے جو چلے پی کر چلے
خشک لب میرے رہے پیشِ نظر — میکدے میں جب مہ و ساغر چلے
تیرے صدقے ایسے شہ لطف و کرم — ہاتھ خالی آئے دامن بھر چلے
مقصد اپنا ہو گیا پورا اسیر — مرنے آئے تھے کسی پر مر چلے

ایسے آنے سے نہ آنا خوب تھا
شام آئے شب سے پہلے گھر چلے

مولانا کے خطوط میں بھی ادبی چاشنی، مذہبیت، طنز وظرافت، شگفتگی اور بے ساختہ پن جا بجا ملتا ہے۔ مکاتیب احمد سعید کے نام سے ایک مجموعہ سید ضمیر حسن دہلوی نے ترتیب دیا ہے۔ ضمیر صاحب مولانا کے رشتہ دار ہیں۔ مولانا کی اہلیہ سید ضمیر حسن کی والدہ کی سگی پھوپھی تھیں۔

مولانا کے خطوط کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

١٧ دسمبر ١٩٤٠ء کے ایک خط میں اپنے قریبی دوست حافظ رحمت الٰہی معتکف کو لکھتے ہیں۔ ''آپ دیکھتے ہیں کہ کمبخت جاپان ساون کی گھٹا کی طرح غراتا ہوا چھاتی پر چڑھا آتا ہے۔ اس کو نہ تو خدا کا خوف ہے، نہ دنیا کی شرم ہے۔ جو چیز ہماری گورنمنٹ نے برسوں میں محنت کر کے خون بہا کر یا عذر و مکر سے حاصل کی تھی، یہ دنوں اور گھنٹوں میں چھیننا چاہتا ہے۔

اپنے بچپن کے دوست ملا واحدی کو کراچی ہجرت کرنے پر لکھتے ہیں:

''میاں میں تو تمہاری تلاش میں تھا۔ پتہ کوئی نہیں بتاتا تھا، تمہیں خبر بھی ہے تم نے کتنا گناہِ عظیم کیا ہے۔ اللہ کے ہاں اس کی باز پرس ہوگی۔ تب پتہ چلے گا، تمہارے بھاگنے سے سارا محلہ بھاگ پڑا۔

ویرانی دلی کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ٢٨/٩/٥٧ کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔ دلی جن سے دلی تھی واحدی! وہ دکان اپنی بڑھا گئے، دلی اب باقی نہیں ہے۔ دلی اور امرتسر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں تو گھر سے بہت کم نکلتا ہوں، احباب کا فقدان، دلی کی ویرانی، جیسے کوئی چنبیلی کا درخت ہو اور ببول کے بیچ میں لگا دیا جائے۔ مور کی طرح ناچتا ہوں اور اپنے پاؤں کو دیکھ کر روتا ہوں۔ احباب کا تصور کرتا ہوں اور جگر کا یہ شعر پڑھتا ہوں۔

یوں زندگی گزار رہا ہوں تیرے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

زندگی کے آخری سال میں ملا واحدی کو دوسرے خط میں اپنی مصروفیت کے بارے میں

تحریر فرماتے ہیں:

''یہاں آج کل شادیاں زیادہ ہو رہی ہیں۔ لوگ نکاح پڑھانے کے لیے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ غمی والے جنازے کی نماز پڑھانے کے لیے گھسیٹتے ہیں۔ مجھے خبر نہیں کہ میرے جنازے کی نماز کون پڑھائے گا۔ بزرگوں میں سے کوئی نہیں، بہر حال کوئی نہ کوئی پڑھا دے گا۔

(آپ کی نماز جنازہ مولانا الیاس کے صاحبزادے مولوی محمد یوسف امیر تبلیغ جماعت نے پڑھائی تھی) .

شمع اخیر شب ہوں سن سرگزشت میری
پھر صبح ہونے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

مولانا خطیب بھی تھے اور ادیب بھی۔ ان کی تقریر و تحریر میں دلی کی روزمرہ کی زبان ہوتی تھی۔ لوگوں کا دل موہ لیتے تھے۔ کئی کئی گھنٹے تقریر کرتے اور مجمع دم بخود بیٹھا رہتا۔ ان کی تمام کتابیں نہایت دلچسپ پیرائے میں تحریر ہیں۔ آپ کم و بیش ۲۰ کتابوں کے مصنف ہیں۔

(۱) جنت کی کنجی (۲) دوزخ کا کھٹکا (۳) از بلا (۴) مشکل کشا
(۵) شوکت آراء بیگم (۶) خدا کی باتیں (۷) رسول کی باتیں (۸) دین کی باتیں
(۹) پردہ کی باتیں (۱۰) پہلی تقریر سیرت (۱۱) دوسری تقریر سیرت (۱۲) تقاریر احمد سعید
(۱۳) ماہ رمضان (۱۴) جنت کی ضمانت (۱۵) صلوٰۃ و اسلام
(۱۶) رسول اللہ کے تین معجزے (۱۷) ہماری دعا قبول کیوں نہیں ہوتی
(۱۸) عرش الٰہی کا سایہ۔

سب سے اہم اور علمی کارنامہ آپ کی عام تفسیر کلام پاک ہے۔ جسے آپ نے ۱۸ سال کی شب و روز محنت اور عرق ریزی کے بعد ۱۹۵۶ء میں شعبان کی ۱۴ تاریخ کو پورا کیا۔ مولانا کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ اتنی زندگی دے کہ میں تفسیر مکمل کرلوں۔ الحمدللہ یہ خواہش پوری ہوئی۔ مولانا کی وفات کے بعد مولوی محمد سعید نے تفسیر کشف الرحمٰن کے نام سے شائع کی۔ بعد میں پاکستان سے بھی طبع ہوئی۔

تفسیر کے بارے میں مرحوم مولانا قاری محمد طیبؒ کا کہنا تھا:

''مجھے تمام تراجم میں بوجہ بلاغت حضرت تھانوی قدس سرہ کا ترجمہ پسند تھا لیکن یہ ترجمہ شگفتگی میں اس سے بھی کچھ سواہی نظر آتا ہے۔ ارادہ کرتا ہوں کہ اپنی تحریرات میں جہاں آیات کے ترجمے درکار ہوں گے تو اس ترجمے کی نقل پر قناعت کرسکوں گا''۔

مولانا حافظ قرآن تھے اور آخر عمر تک تراویح میں قرآن مجید سناتے اور مستقل طور پر حاجی فریدالدین قریشی بڑے انہماک سے سنتے رہے۔

مولانا کا تعلق خلافت تحریک سے بھی رہا اور وہ تمام محرکات کے دل سے قائل تھے جن کے تحت ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑی جارہی تھی۔ اس سلسلہ میں وہ کئی مرتبہ جیل گئے۔ پہلی بار ۱۹۲۱ء میں قید ہو گئے اور ایک سال کی سزا دہلی اور میانوالی جیل میں کاٹی، دوسری بار ۱۹۳۰ء میں دو سال کی سزا ہوئی جو دہلی اور گجرات جیل میں بسر ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں ایک بار پھر گرفتار ہوئے اور ایک سال کا عرصہ دہلی اور ملتان جیل میں گزارا۔ ۱۹۴۰ء میں کچھ عرصے کے لیے اعظم گڑھ جیل میں ڈال دیے گئے ۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی میں نظر بند ہوئے اور تین سال تک دہلی، لاہور، فیروز پور اور ملتان جیل میں رہے، اس طرح مرحوم نے سیاست میں عملی طور پر حصہ لے کر قید و بند کی سخت صعوبتیں برداشت کیں۔ میانوالی جیل میں آپ نے بان بٹے اور چکی بھی پیسی، محنت و مشقت کے باوجود آپ کو جیل میں شعر گوئی کے علاوہ، کھانا پکوانے اور کھلانے کا بھی شوق رہا۔ کبھی کبھی بیڈ منٹن سے بھی دل بہلایا کرتے تھے۔ عبدالعزیز انصاری اور دوسرے قیدیوں کو حدیث کا درس دیتے اور وعظ و نصیحت فرماتے رہے۔

۱۹۳۲ء کے دوران ملتان جیل میں فتح الباری کا آخری حصہ مفتی کفایت اللہ کی اُستادی میں ختم کیا۔ ۱۹۴۲ء کے دوران مولانا کے ہمراہ ان کے دونوں لڑکے محمد سعید، مظہر سعید بھی گرفتار ہوئے۔ مولانا کے دوران اسیری میں جو ساتھی اُن کے ہمراہ رہے اُن میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، بیرسٹر آصف علی، لالہ دیش بندھو گپتا، لالہ جگل کشور کھنہ، مولانا داؤد غزنوی، لالہ شنکر لال، پنڈت نیکی رام شرما، منشی عبدالقدیر، سید جلال الدین اور حافظ فیاض احمد جیسے جانباز لوگوں کے نام نمایاں ہیں۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری آپ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''ہم میں سے جب کوئی جیل سے رہا ہوتا تو سب بچوں کی طرح روتے، بلکتے اور بادل ناخواستہ الوداع کہتے۔ مولانا احمد سعید رہا ہونے لگے تو ان کی گھگھی بندھ گئی۔ آنسوؤں کے تاروں سے نغمہ جدائی پھوٹ رہا تھا۔ اب کہاں لیکن وہ رنگا رنگ بزم آرائیاں۔ یعنی سب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں''۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ''میں دہلی صرف دو ہستیوں کے لیے آتا ہوں اور وہ ہیں مفتی کفایت اللہ اور احمد سعید''۔

مولانا بے حد ملنسار اور خلیق تھے۔ کبھی کسی سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ہر آنے والے کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے۔ مولانا بڑوں میں بڑے، برابر والوں میں برابر والے اور بچوں میں بچہ تھے۔ آپ کی شخصیت بڑی باغ و بہار تھی۔ حاضر جوابی میں ان کا جواب نہ تھا۔ ایک بار جیل میں مولانا نے چوہا مار کر ڈوری میں باندھا اور اسے دروازے کے ساتھ لٹکا دیا۔ جب جیلر آیا تو مولانا نے ازراہ مذاق کہا ''جیلر صاحب! یہ دیکھیے میں نے چوہا مارا ہے۔ فرمائیے کتنے دن کی معافی ملے گی''۔

جیلر نے کہا آپ تو عدم تشدد کے حامی ہیں، آپ نے تشدد کیوں کیا''۔ مولانا کا برجستہ جواب تھا کہ ''صاحب وہ کون سا سرکاری ملازم تھا''۔

مولانا کے اس جملے پر جیلر کو بھی ہنسی آ گئی۔

مولانا مرحوم نڈر، بے باک اور حق پسند تھے جس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو ۱۹۲۱ء میں اسیری کے دوران دہلی جیل میں پیش آیا تھا۔ ہوا یوں کہ جیلر کی بدسلوکی کے خلاف قیدیوں نے بیرکوں میں بند ہونے سے انکار کر دیا۔ خطرے کی گھنٹی بجی، وارڈن بندوق لے کر آ گئے، مولانا سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ رات کو بارہ بجے فیصلہ ہوا جب لوگ بیرکوں میں داخل ہوئے، سزا کے طور پر آپ کو منٹگمری جیل میں بھجوا دیا۔ آپ کے ہمراہ حافظ ظہور الدین، لالہ شنکر لال، رشید خاں، شیخ محمد تقی، عبدالعزیز انصاری، جگت پال اور گوپال سودیشی بھی تھے۔ جہاں سب کو سی کلاس میں ڈال دیا گیا۔

مولانا نے مصائب زنداں کی تمام روداد ایک نجی ڈائری میں لکھی تھی۔ اس ڈائری کے

حصول کے سلسلے میں جب میں نے کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ ڈائری شیخ عبدالحق پراچہ لے گئے تھے۔ اب چونکہ پراچہ صاحب اس جہاں میں نہیں اس لیے اس ڈائری کے بغیر مولانا کی سیاسی ہلچل پر تفصیل سے روشنی ڈالنے سے محروم ہوں۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کردوں کہ مولانا کی وہ ڈائری جس میں ان کے اشعار درج تھے حالات کی نذر ہو چکی ہے۔

مولانا چاہتے تو بہت سی سرکاری مراعات حاصل کر سکتے تھے۔ مولانا آزاد، پنڈت نہرو اُن کے قریبی دوست تھے۔ مگر ان کی غیور طبیعت نے کبھی یہ گوارا نہ کیا۔ ایک بار پنڈت جی نے اپنے سیکرٹری جان متھائی کو مولانا کے پاس بھیجا تا کہ -/۳۰۰ روپے ماہوار وظیفے کے کاغذات پر منظوری دے سکیں۔ مولانا نے کاغذات کو پیشانی سے لگایا اور فرمایا ''پنڈت جی سے احمد سعید کا سلام کہنا، اور کہنا آزادی کی لڑائی لڑنا میرا فرض تھا اور ادائیگی فرض کی کوئی قیمت نہیں ہوتی''۔

۱۹۱۲ء سے نظام حیدرآباد نے بھی مولانا کے لیے -/۳۰۰ روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا ہوا تھا۔ جب آپ کانگریس میں شامل ہوئے اور جنگ آزادی میں حصہ لیا تو نظام نے وظیفہ بند کرنے کی دھمکی دی آپ نے جواب میں وظیفہ لینے سے انکار کر دیا۔ ایک اور واقعہ بھی عرض کرتا چلوں جس سے مولانا کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

مولانا کا معمول تھا کہ وہ فراش خانے کی مسجد میں قرآن مجید کا ترجمہ بیان فرما کر جمعیۃ کے دفتر میں تشریف لاتے تو اپنی جیب سے پیسے نکال کر دیتے اور آواز دے کر کہتے ''میاں عبدالحق چائے تو بنالو'' اسی طرح دوپہر کا کھانا بھی دورِ نظامت میں گھر سے منگا کر تناول فرماتے۔ غرضیکہ مولانا کی زندگی ایسی صاف ستھری تھی کہ کبھی مالیات کے سلسلے میں جماعت کے مرہونِ منت نہیں ہوئے۔

۱۹۲۰ء میں جمعیۃ العلماء ہند قایم کی گئی تو مفتی کفایت اللہ صدر اور آپ ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے اور ۱۹۴۰ء تک اسی عہدے پر رہے۔ اس کے بعد نائب صدر اور صوبہ دہلی کے صدر بنے۔ ۱۹۵۷ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے انتقال کے بعد صدر مقرر ہوئے۔ آپ جس محفل میں ہوتے صدر بنائے جاتے۔ فسادات دہلی کے دوران جامع مسجد کے سامنے پریڈ گراؤنڈ میں جہاں اب مولانا آزاد کا مزار ہے مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ہوا جس کی صدارت بھی

آپ نے فرمائی۔ مولانا آزاد کی جامع مسجد کی تاریخی تقریر نے مسلمانوں کو آزادی سے جینے کا حوصلہ دیا۔ مولانا آزاد نے فرمایا:

''آج تم زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اُجالا تھا۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اُتر گئے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو اُن پر مسکرا دیے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اُٹھی تو رُخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا تمہارا یہ راستہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کی تار کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس قدر غافل ہو گئے ہیں، جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا''۔

مولانا کی حاضر جوابی اور انداز بیان سے متاثر ہو کر مولانا راسخ دہلوی نے مچھلی والوں کی مسجد جواب مسجد مولانا احمد سعید کہلاتی ہے، میں وعظ شروع کرا دیا تھا۔ آپ شب قدر میں اس رات کی فضیلت کچھ اس طرح بیان کرتے کہ مغفرت کی دعا کرتے وقت لوگ دھاڑیں مار مار کے روتے تھے، مولانا کے پاس کوئی حساب تھا جس سے وہ رمضان میں شب قدر کا قیاس کرتے تھے، اور رات پچھلے پہر اندھیرا کر کے بڑے جذباتی انداز میں دعا کراتے تھے اور اپنی لکھی ہوئی یہ مناجات بھی پڑھتے تھے۔

منتظر ہیں آنے کی آنکھیں ہماری دیر سے
آنے والے آ یہ مجمع طالب دیدار ہے
جلوہ دکھلا کر تمنا پوری کر دے دید کی
اپنی چشم شوق پورے سال سے بیدار ہے
کچھ سنے تو عرض کر دیں دردِ دل کا مدعا
گرچہ قابو میں نہیں دل اور زباں بیکار ہے
سخت طوفاں ہے ہوائیں ہیں خلاف
اس پہ آفت یہ کہ کشتی برسر منجدھار ہے

تنگ جینے سے ہوئے ہیں جینے والے اے کریم
زندگی سے اپنی ہر اک باحیا بے زار ہے
بخشنے سے گر گناہوں کے تجھے کچھ عذر ہے
پھر بتا جائیں کہاں وہ کون سی سرکار ہے
پھیر جا اپنی معافی کا قلم بس پھیر جا
کہنے والا کہہ گیا ہے تو مرا ستار ہے

مولانا کو بزرگوں کے مزارات اور صوفیائے کرام کے برگزیدہ طبقے سے بڑی عقیدت تھی جب کبھی اجمیر شریف اپنے داماد اور بڑی لڑکی سے ملنے جاتے تو گھر سے درگاہ خواجہ غریب نوازؒ تک ننگے پاؤں حاضری دیا کرتے۔ سلطان جی کی سترہویں میں رات کے پچھلے پہر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک چکر لگائے بغیر انہیں چین نہیں آتا تھا۔ جب کبھی اُداس ہوتے اور رونے کو جی چاہتا تو کسی گانے والے کو ساتھ لے کر خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار شریف پر تشریف لے جاتے۔

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ اور ان کے گھرانے سے بھی آپ کے قریبی تعلقات تھے خواجہ صاحب سیاسی اختلافات کے باوجود ہر عید پر کوچہ چیلان آ کر ملا واحدی، آصف علی، جعفری صاحب سے ملتے ہوئے مولانا کے پاس آتے، مٹھائی کھاتے بھی اور کھلاتے بھی۔ بعد میں خواجہ صاحب مفتی کفایت اللہ کے مکان پر تشریف لے جاتے، اب ایسی وضعداریاں کہاں؟

مولانا کو فصاحت و بلاغت میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ضرورت کے وقت آپ بہترین مناظرہ نگار، خطابت کے وقت بلند پایہ خطیب و مقرر کہ قدر دانوں نے سحبان الہند تسلیم کرلیا۔

مولانا احمد سعید کی بات ہے، سنہری مسجد چاندنی چوک کے سامنے فوارے کی سیڑھیوں پر اس زمانے میں مسجد فتح پوری سے دریبہ کلاں تک ایسی پٹری لمبی سی تھی جہاں آریہ سماجی لیڈر، مسلمان مولوی اور عیسائی پادری مناظرہ کیا کرتے تھے۔ سفید سرخ چہرہ، قامت کے اعتبار سے طویل، پیر میں پھول دار دہلوی جوتا، سر پر گول ٹوپی، بدن پر سفید اور باریک انگرکھا، تنگ پاجامہ زیب تن کیے ہوئے دلی کی چٹخارے دار زبان میں آریوں کے بعض اعتراضات کا

جواب دے رہے ہیں۔ چہرے پر مسکراہٹ سونے پر سہاگہ کا کام دے رہی تھی۔ تقریر میں تسلسل تھا، ہر جملے سے مزاح اور چٹکلے ٹپکتے دکھائی دیتے، تقریر اس قدر دلچسپ اور شگفتہ کہ بھیڑ جمع ہو گئی۔

حضرت مولانا جہاں فطرتاً نڈر اور بے باک تھے وہیں لین دین کے معاملے میں سچے، صاف اور امین تھے۔ لوگوں کے ہزار ہا روپے اور زیورات بطور امانت رہتے تھے اور کئی جگہ امانت کا اندراج رکھتے۔ محفل میں موجود اپنے مصاحبوں کو مخاطب کر کے کہا کرتے ''میاں پہلوان سنو! فلاں صاحب اپنی امانت رکھ گئے ہیں۔ جو میں نے محمد سعید کے پاس رکھوا دی۔ اس طرح وہ اپنی صحبت میں موجود لوگوں کو بھی گواہ بنالیا کرتے تھے کچھ صاحب خیر، بیواؤں اور غریبوں کی امداد بھی مولانا کی معرفت کیا کرتے تھے۔ اس امانت کو بھی مولانا مستحق لوگوں تک بے حد رازداری کے ساتھ پہنچا دیا کرتے تھے۔ کچھ مساکین کا راشن داتا رام گپتا کے ہاں سے بھی مقرر کر رکھا تھا۔

مولانا بڑے مہمان نواز تھے ان کے ہاں ٹین کے ڈبوں میں ہمیشہ مٹھائی موجود رہتی تھی اور آنے والوں کی مٹھائی سے خاطر کرتے اور کہتے تھے ''میاں یہ تو آپ کو کھانی پڑے گی۔ آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں''۔ مولانا کے ہاں کسی بھی وقت چلے جائیے کوئی نہ کوئی اپنا دکھڑا سناتے ہوئے نظر آتا تھا۔ مولانا ہمدردی سے اُس کی باتیں سنتے اور حتی الامکان اس کی مدد کرتے۔ سفارشی خط لکھتے یا ضرورت محسوس کرتے تو متعلقہ آفیسر سے خود جا کر ملتے اور اس کام کو انجام دلاتے۔

١٩٤٧ء کے بعد جن مسلم رہنماؤں نے دہلی والوں کی خصوصاً مسلمانوں کی خدمت کی ان میں مولانا حفظ الرحمٰنؒ، عزیز حسن بقائی، چوہدری عبدالستار، میر مشتاق احمد کے ساتھ ساتھ مولانا کا نام بھی ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا۔ ١٩٤٧ء کی روح فرسا فضا میں دلی کی جس طرح بربادی کی گئی تھی مولانا اس سے بے حد فکر مند تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مہاتما گاندھی سے رابطہ قائم کیا۔ انھیں حضرت بختیار کاکیؒ کی درگاہ پر لے گئے اور صفائی و مرمت کے لیے شب و روز ایک کر دیے۔ فسادات کے دوران جب گاندھی نے دلی کا دورہ کیا تو آپ مولانا کے گھر بھی

تشریف لے گئے۔

فسادِ دلی کے بعد تعزیہ داری ختم ہو چکی تھی۔ آپ نے اپنی ذاتی کوششوں سے ۱۹۵۱-۵۲ء میں تعزیہ کا جلوس دوبارہ نکلوانے میں ذاتی دلچسپی لی۔

۱۹۴۶ء سے مولانا کی وفات تک میں ان کی قدم بوسی میں حاضر رہا۔ گاہے گاہے ان کی محفلوں میں شریک ہونے کا شرف بھی حاصل رہا۔ مولانا کی صحبت میں اُن کے کمالات و اوصاف کو سمجھنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا اور زندگی کے نشیب و فراز کو قریب سے سمجھا اور جانا۔ ۱۹۵۰ء کے قریب مولانا کے ادارہ دینی بک ڈپو (جسے اُن کے لڑکے مولوی محمد سعید چلاتے تھے) سے بھی تعلق رہا، کچھ عرصہ مولانا کی سرپرستی میں جمعیۃ علماء ہند صوبہ دہلی کا ناظم اور ڈھلائی یونین کا سیکرٹری بھی رہا۔

مولانا کے مردانے مکان میں ہر روز ایک محفل سجتی تھی جو آدھی رات تک جاری رہتی تھی، اس میں ہر طبقہ و خیال کے لوگ موجود ہوتے، دانشوروں سے لے کر دلی کے کرخنداروں تک کی رسائی آپ کی محفل میں تھی۔ مولانا کی دوستی ہمیشہ ہی ہر طبقہ کے لوگوں کے ساتھ رہتی تھی۔

ان کی محفل میں روزانہ آنے والوں میں کوئی مناسب تعلیم یافتہ، شستہ آدمی نہیں ہوتا تھا۔ البتہ جمعہ کے روز جو لوگ تشریف لاتے تھے ان میں بعض آدمی اچھے بھی ہوتے تھے، جن میں تعلیم یافتہ، قانون داں، سیاست داں، شہر کے تاجر اور معزز حضرات بھی تھے ان کے دوست راشٹر پتی بھون کناٹ پیلس یہ ہی نہیں بلکہ چوڑی والان سے لے کر صدر بازار، بیری والا باغ پر بھی رہتے تھے جن میں غوری پہلوان سے لے کر پنڈت نہرو تک سب ہی لوگ شامل تھے۔

روزانہ یا گنڈے دار آنے والوں میں اسماعیل غوری پہلوان، محمد عیوض گھوسی، حاجی عبدالعزیز صدر ڈھلائی یونین، عبدالحمید تیل و عطر فروش، پیر جی یاسین عرف مولوی لال مرغا۔ عبدالسلام زئی، خلیفہ محمد ایوب، فیاض علی ہاشمی، سید مجید احمد، محمد مرزا گھی والے، انور دہلوی، علی محمد شیر میواتی، شوکت علی ہاشمی، گلزار دہلوی اور عقیل ناروی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ہر جمعہ کو پابندی سے آنے والوں میں حاجی رحمت الٰہی معتکف، حاجی محمد صالح (حاجی علی جان والے، حافظ محمد نسیم بٹن والے، حکیم خلیل الرحمٰن نار، پیر جی صدیق، ہلال احمد زبیری، محمد

عثمان گھڑی ساز، بادشاہ پہلوان، محمد صابر تاروالے، نور محمد، نذر محمد عباسی اور خواجہ محمد سلیم کے نام مجھے یاد ہیں۔

یارانِ طریقت کی محفل آدھی رات تک جمی رہتی اور گھڑی گھڑی کشمیری چائے کا دور چلتا رہتا، طرح طرح کی بولیاں بولی جارہی ہیں۔ خوش گپیاں ہورہی ہیں، جامع مسجد کی سیڑھیوں سے لے کر امریکہ، برطانیہ تک کی سیاست پر بحث ہورہی ہے۔ غوری پہلوان اور عبدالعزیز صدر کے درمیان نوک جھونک جاری ہے۔ عیوض گھوسی، حمید تیلی، غوری پہلوان اور صدر عبدالعزیز کے درمیان گالیوں کا چوکھی مقابلہ ہورہا ہے اور مولانا اپنی مسند پر ڈیسک کے سہارے یا گاؤ تکیہ آگے رکھے لکھنے میں مشغول ہیں۔ ان لوگوں کی باتیں اور آوازیں ذرا بھی مخل نہیں۔ سونے پر سہاگہ مولانا خود بھی ان کی باتوں سے بے خبر نہیں، بلکہ لطیف انداز میں کبھی کبھی سر اُٹھا کے کوئی چلتا ہوا جملہ کہہ دیتے جس سے محفل زعفرانِ زار بن جاتی اور رنگ چوکھا ہو اُٹھتا، آپ کی محفل میں آنے والا کوئی فرد غیر حاضر ہوتا تو دوسرے ہی روز خیریت طلب کرتے یا خود اُس کے گھر پہنچ جاتے۔

سننے والے مولانا کی باتوں سے بہت محظوظ ہوتے اور ان کے لطیفوں سے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ ان کے لطیفوں میں بھی سحر بیانی کو دخل تھا۔ میں وہ سحر بیانی کہاں سے لاؤں جوان کے لطیفوں کو دوہراؤں، سوچتا ہوں کہ بطور نمونہ دو چار لطیفوں کو نقل کردوں مگر بات بنائے نہیں بنتی، مولانا بے ساختہ ایسے محاورے بول جاتے تھے کہ اچھے اچھے زبان داں بغلیں جھانکتے رہ جاتے، چھپی مارنا، کبوتر بازوں کا قدیم محاورہ ہے۔ استعمال کرنا تو درکنار، کتنے اہل زبان اور زباں داں جو اس کے معنی جانتے ہیں۔ مولانا کی نظر آدمی کے عیب پر نہیں اُس کے ہنر پر جاتی تھی، وہ جواری، شرابی، سٹے باز اور اسی قبیلے کے دوسرے لوگوں سے بھی محبت سے پیش آتے اور اپنے قرب سے لوگوں کو تائب کرادیتے، ایک مرتبہ ایک تعیش پسند رئیس کو نصیحت کرتے ہوئے مسکرا کر فرمایا:

''میاں تم ہمارے کہنے سے وہ سب کچھ تو چھوڑو گے نہیں جو کرتے ہو۔ البتہ ایک کام اور کرلیا کرو، اس اللہ کے دیے میں سے کسی یتیم یا بیوہ کی شادی پر کچھ لگادیا کرو پھر تو وہ سارے شہر

میں یتیموں اور بیواؤں کی شادی کرانے والے مشہور ہو گئے۔

تقسیم کے بعد دلی میں دلی والے تو بہت کم رہ گئے تھے۔ البتہ قرب و جوار سے آکر دلی میں بسنے والوں کی کافی تعداد ہو گئی اور کیوں نہ ہو بقول مرحوم آصف علی، دلی اور اور دلی والوں کا دل بہت بڑا ہے جو بھی اس میں آتا ہے سما جاتا ہے۔ دلی کی بڑھتی ہوئی آبادی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے آپ سے دریافت کیا ''حضرت! آپ دلی والا کسے مانتے ہیں۔ مولانا نے برجستہ جواب دیا۔ ''جو عیدین کی نماز دلی میں پڑھے''

مولانا کی فراخ دلی پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔

ستمبر ۱۹۵۵ء کے دوران جامع مسجد میں ایک جلسہ روس کے مفتی اعظم ضیاء الدین بابا خان کے اعزاز میں مولانا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جلسہ ختم ہونے پر مولانا اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ پیدل گھر کی طرف گامزن تھے کہ اچانک جواہر ہوٹل کے قریب اسماعیل چوئی نامی شخص نے آپ کے کولھوں پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ ڈیڑھ انچ گہرا اور تین انچ لانبا زخم آیا لیکن اس کے باوجود مولانا نے اُسے کچھ نہیں کہا اور اُسے معاف کرتے ہوئے فرمایا ''میاں کسی کے کہنے سننے میں آ کر اس نے خلاف توقع یہ حملہ کر دیا ہوگا''۔

عمر کے آخری حصے میں مولانا کو ایک سیاسی شکست کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو مولانا اور ڈاکٹر مرزا احمد علی کے درمیان راجیہ سبھا کے لیے مقابلہ ہوا۔ آپ صرف دو ووٹ سے ہار گئے۔ اکثر اب واقعہ کو یاد کر کے مولانا کہتے تھے ''میاں چلتے چلتے چودھری برہم پرکاش نے مجھے الیکشن میں زبردستی پھنسا دیا اور چودھری کی وجہ سے یہ ذلت اُٹھانی پڑی۔''

چالیس سال کی عمر کے بعد جب کوئی مرض جان کو لگ جاتا ہے تو وہ بہت کم جاتا ہے۔ کچھ دنوں کو دبتا ہے پھر اُبھر آتا ہے۔ مولانا ۴۰ سال کی عمر سے قلب کے مریض تھے۔ علاج مسلسل جاری رہتا۔ آپ یونانی طریقہ علاج کو پسند فرماتے۔ جب کہ لڑکے ڈاکٹری علاج پر اعتقاد رکھتے تھے۔ حکیم محمد الیاس، حکیم شریف الدین بقائی وغیرہ کا علاج بھی رہتا اور ہمدرد کا خمیرہ ارشد والا یا جواہر مہرہ بھی چلتا رہتا۔ طبعاً دوا کے چور تھے، پرہیز کبھی کیا نہیں، مچھلی کے کباب، شامی کباب، کوفتے، شب دیغ، بیسنی روٹی، اچار، مربے، خالص شہد، آم اور خربوزے

بڑی رغبت سے کھاتے، آخری سالوں میں کھانا صرف دن میں کھاتے اور رات کو چائے نوش فرماتے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد قیلولہ ضرور فرمایا کرتے تھے۔

آخری دنوں میں مریض قلب کے علاوہ ریاحی بواسیر، مسوں میں کھجلی، پیٹ میں حبس، نزلہ، رات کو بے چینی۔ سردی کا لگنا اور نیند کا نہ آنا جیسے موذی امراض کے شکار ہو گئے تھے۔ مولانا فرماتے تھے ''آخر زندگی کب تک ساتھ دے گی، صبح ہوتی ہے تو شام کا بھروسہ نہیں اور شام ہوتی ہے تو صبح کا بھروسہ نہیں''۔

۴ دسمبر ۱۹۵۹ء مولانا احمد سعید کی زندگی کا وہ آخری دن تھا۔ جب آپ نے روزانہ کے معمولات کے مطابق تمام کام انجام دیے۔ بعد نماز مغرب بیت الخلاء گئے، واپس آ کر بیٹھے اور اخبار ہاتھ میں اُٹھایا پھر ایک لڑکے کو جو اتفاق سے تنہا تھا کہا ''جا بے محمد سعید کو بلا کر لا میری طبیعت خراب ہو رہی ہے''۔ یہ سنتے ہی لڑکا ان کو بلانے کے لیے زنانہ مکان پر گیا، ادھر مولانا بیٹھے بیٹھے ہی پلنگ کے عرض میں لیٹے گئے اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

موت کی خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی۔ دلی میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ آخری دیدار کے لیے لوگوں کا تانتا بندھ گیا، پنڈت نہرو بھی اپنے بزرگ ساتھی کا دیدار کرنے آئے، دیر تک مکان پر جنازے کے سرہانے کھڑے رہے۔ دوسرے روز صبح جنازے کو مہرولی لے جایا گیا۔ تدفین کے وقت لاکھوں افراد کا ہجوم تھا۔ آنجہانی اندرا گاندھی نے بھی مزار پر تشریف لا کر عقیدت کے پھول برسائے۔

لحد میں جا سوئے یا الٰہی عزیز و غم خوار کیسے کیسے

مولانا احمد سعید کو مہرولی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ کے باہر ظفر محل کے قریب حضرت مفتی کفایت اللہؒ کے دائیں جانب دفنایا گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے:

جسم احمد سعید فانی تھا نام احمد سعید باقی ہے

مولانا کو اپنے اُستاد مفتی کفایت اللہ سے اس قدر عقیدت تھی کہ اپنی زندگی میں ہی مفتی صاحب کے قریب اپنی آخری آرام گاہ تیار کرالی تھی، اگر مولانا اپنی جگہ پہلے سے متعین نہ کر گئے

ہوتے تو یقیناً انہیں جامع مسجد کے سامنے مولانا ابوالکلام آزاد کے قریب ہی سپردخاک کیا جاتا۔
مولانا کے مزار مبارک کے سرہانے جو پتھر لگا ہوا ہے وہ اُن کی وفات کے بعد چوڑیوالان کے رہنے والے ایک عقیدت مند محمد عاشقین نے نصب کرایا۔ یہ وہی محمد عاشقین ہیں جنھوں نے مولانا احمد سعید کے صاحبزادے مولوی محمد سعید کی وساطت سے درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ میں پانی کی سپلائی کے لیے اپنی جیبِ خاص سے بجلی کا موٹر لگوایا تھا جو آج تک جاری ہے۔
سرہانے لگے پتھر پر جو عبارت کندہ ہے۔اس سے بھی مولانا کی مکمل شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ملاحظہ فرمائیے:

نذرِ عقیدت

داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی — ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

(۱) ہندوستان کی جنگِ آزادی کا نڈر جنرل اور عظیم رہنما
(۲) جمعیت العلماء ہند کے روحِ رواں (۳) آفتابِ فصاحت و بلاغت
(۴) شہنشاہِ خطابت (۵) عارفِ اسرار شریعت و طریقت
(۶) مبلغ اسلام (۷) متوکل علی اللہ
(۸) علم مجلسی میں یکتا (۹) سخن فہم اور سخن گو

مفسر قرآن سحبان الہند حضرت علامہ حافظ الحاج مولانا احمد سعید نوراللہ مرقدہ تاریخ وفات ۴ دسمبر ۱۹۵۹ء بروز جمعہ بعد نمازِ مغرب ساڑھے سات بجے۔
(نصب کردہ محمد عاشقین ۳۸۳۹ چوڑیوالان دہلی)

مولانا دراصل بڑے ہی صاحبِ کمال بزرگ تھے، وہ لوگوں میں اس طرح ملے جلے رہے پھر بھی لوگ بخوبی نہیں سمجھ سکے، وہ کیا تھے؟
وہ درحقیقت دلی کے آخری ولی تھے، دلی کی آخری تہذیب کی یادگار تھے، دلی والوں کا دل تھے، مولانا کے متعلق جتنا کچھ لکھا جائے کم ہے۔ مولانا کی شخصیت کا تقاضہ ہے کہ اُن کی ذات پر علیحدہ سے ایک سمینار منعقد کیا جائے۔ تاکہ ان کی زندگی کے ہر گوشے کو واضح کیا جاسکے۔

سحبان الہند مولانا احمد سعید

(انیس ہاشمی دہلوی)

مولانا احمد سعید دلی کے ایک غریب گھرانے کے چشم و چراغ تھے مگر یہ گھرانہ دلی والوں کی اصطلاح میں دلی کے روڑوں کا گھرانہ تھا۔ مولانا ہماری آزادی کی تاریخ کے ایک نامور اور ممتاز رہنما تھے اور اپنے دور کے نہایت موثر خطیب، واعظ اور مقرر تھے۔ ۱۹۱۲ء سے پیشتر کے زمانہ کی دلی میں مولانا کے حسن کا چرچا بھی خاصا تھا۔ اکثر محفلوں میں مولانا کا ذکر کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ میاں آدمی اگر حسین ہو تو احمد سعید جیسا ہو۔ ۱۹۱۲ء تک تو دلی کی آبادی ایک لاکھ کے قریب تھی اور اس میں غالب اکثریت دلی والوں کی تھی مگر ۱۹۱۲ء کے بعد کے زمانے میں سرکار انگلشیہ اپنا دارالحکومت کلکتہ سے منتقل کر کے دلی لے آئی تھی اور اس عمل کی وجہ سے دلی ایک کوسموپولیٹن شہر بن گیا تھا۔ جس میں سارا ہندوستان جمع تھا جس میں بنگالی بھی تھے اور مدراسی بھی، پنجابی بھی تھے اور پٹھان بھی، سندھی بھی تھے اور گجراتی بھی، مرہٹے بھی تھے اور کرناٹکی بھی۔ غرض یہ کہ دلی ایک ایسا گلدستہ بن گیا تھا جس میں سارے ہندوستان کے پھول سجے ہوئے تھے اور یہ رنگ برنگ گل دستہ خوب بہار دیتا تھا۔ اس خوش رنگی کا اندازہ آپ دلی کی تعلیمی درسگاہوں سے لگائیے۔ دلی میں سینٹ اسٹیفنز کالج تھا۔ جس میں ہمارے صدر صاحب بھی زیر تعلیم رہے ہیں۔ اس کے پرنسپل رائے بہادر مکرجی تھے۔ وہ بنگالی تھے، دوسرا کالج ہندو کالج تھا جس کے پرنسپل ڈاکٹر تھڈوانی تھے۔ جو سندھی تھے تیسرا کالج رامجس کالج تھا جس کے پرنسپل گورمکھ نہال سنگھ تھے جو سکھ تھے۔ چوتھا کالج کمرشیل کالج تھا جس کے پرنسپل ڈاکٹر پیلانی تھے۔ جو سندھی تھے۔ پانچواں کالج اینگلو عربک کالج تھا جس کے پرنسپل واکر صاحب تھے جو انگریز تھے۔ چھٹی درسگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ تھی جس کے پرنسپل (جو شیخ الجامعہ کہلاتے تھے) ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تھے جو قائم گنج (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ لاء کالج تھا۔ اس کے پرنسپل شاہانی تھے جو سندھی تھے، یونیورسٹی تھی۔ اس کے چانسلر سر موری گوائر تھے جو فیڈرل کورٹ کے

چیف جج تھے۔

خدا آپ کو خوش رکھے ذکر ہو رہا تھا مولانا احمد سعید صاحب کا۔ تو بھائی میاں مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز جمعیت علمائے ہند سے وابستگی سے کیا۔ اس کے پہلے صدر مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مقرر ہوئے اور سحبان الہند مولانا احمد سعید اس کے پہلے ناظم اعلیٰ یا جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے اور پھر ساری عمر اسی تنظیم سے وابستہ رہے۔ ان بزرگوں کا یہ وطیرہ نہیں تھا کہ آج یونینسٹ پارٹی میں شامل ہیں تو کل مسلم لیگ میں براجمان ہیں۔ پھر تقاضے بدل گئے تو ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد ضرورتیں بدلیں تو فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی کنونشن مسلم لیگ میں نظر آنے لگے اور جب نعرہ بازی کے پرکالے نے پیپلز پارٹی کی بنیاد ڈالی تو اس میں پہنچ گئے۔ ہمارا عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ حضرات بے اصولے نہ تھے۔ ان حضرات نے ایک راستہ نہایت سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا اور اس پر ساری عمر نہایت استقامت سے رواں دواں رہے اور یہ راستہ کوئی پھولوں کی سیج نہ تھا بلکہ خاردار راستہ تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اپنی معروف کتاب ''یارانِ کہن'' میں تحریر فرمایا ہے کہ ہم سب تحریک خلافت کے سلسلے میں میانوالی جیل میں مقید تھے کہ ہمیں معلوم ہوا کہ مولانا احمد سعید صاحب بھی اسی جیل میں ہیں اور سی کلاس کے قیدی ہیں اور ان سے نہایت جان لیوا مشقت لی جا رہی ہے۔ دوسری اطلاعات کے بموجب مولانا پر جو بیتی وہ یہ تھی کہ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے بیل استعمال کرنے کے بجائے ان کو جوت دیا گیا ہے اور ان سے بان (مونج) بٹنے کا کام بھی لیا جا رہا ہے جس سے مولانا کے ہاتھ سخت زخمی ہو گئے ہیں۔

مولانا سالک نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے کہا کہ بھائی مولانا احمد سعید صاحب نہایت ممتاز سیاسی رہنما ہیں اور جمعیت العلمائے ہند کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ جمعیت العلمائے ہند اثر و رسوخ کے اعتبار سے خلافت کمیٹی سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لہٰذا آپ ان کو بی کلاس میں منتقل کر دیجیے۔ چنانچہ سالک صاحب کے اصرار پر مولانا کو بی کلاس میں منتقل کیا گیا۔ ان بزرگوں کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس قسم کی جان لیوا تکلیف اُٹھانے کے باوجود یہ نہ تو کبھی شکایت کرتے تھے اور نہ ہی غیر ضروری غلو کرتے تھے۔ ہماری موجودہ سیاسی زندگی میں ہر شخص

رائی کو پہاڑ بنانے کے مرض میں مبتلا ہے۔ چار دن تھانے رہ آئیں گے تو وہ زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے کہ الامان الحفیظ صورتِ حال یہ تھی کہ جمعیت العلماے ہند برمغیر کے مسلمانوں کی وہ واحد کل ہند تنظیم تھی جو سامراج دشمن تھی اور اس راستے سے اس نے کبھی منہ نہیں موڑا اور مولانا اس میں جنرل سیکرٹری، نائب صدر کے عہدوں پر فائز رہے اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے انتقال کے بعد صدر بنا دیے گئے۔ مولانا خاص خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک طرف تو سارے ہندوستان کے دورے کرتے تھے۔ تقریریں کرتے تھے۔ جمعیت العلمائے ہند کی تنظیمیں قائم کرتے اور خدا جانے کس وقت بیٹھ کر تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے۔ مولانا کی یوں تو متعدد تصانیف ہیں مگر چند کتابیں ہیں جن کو بہت شہرت ملی وہ ہیں۔ جنت کی کنجی، دوزخ کا کھٹکا، تقریر سیرت اور ان کی معروف تفسیر قرآن کشف الرحمٰن۔ یہ سب کتابیں پاکستان میں بھی دستیاب ہیں جو یہاں مختلف اداروں نے غیر قانونی طور پر چھاپ لی ہیں۔ کشف الرحمٰن کے سلسلے میں مولانا نے ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے سلسلے میں اپنی نظر بندی سے رہائی کے بعد کام شروع کر دیا تھا اور ۱۹۵۹ء میں جب مولانا کا انتقال ہوا اس وقت تک اس کارِ خیر میں مصروف رہے۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں جب کشف الرحمٰن کا نسخہ چھپ کر تیار ہوا تو مولانا کے بڑے بیٹے مولانا محمد سعید مرحوم اپنے والد کو نسخہ دکھانے لائے تو مولانا نے اس نسخہ کو غور سے دیکھا۔ یہ عصر کا وقت تھا اور مولانا نماز عصر سے فارغ ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی روز مغرب کے بعد مولانا اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ گویا مولانا کو صرف اس بات کا انتظار تھا کہ کشف الرحمٰن کا تیار شدہ نسخہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور وہ خدا نے انھیں دکھا دیا۔ کشف الرحمٰن کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا نے جب تفسیر کا کام مکمل کر لیا تو اس کی طباعت کے لیے پیسے نہ تھے۔ چنانچہ اپنے چند دوستوں کو نزسوال (جنوبی افریقہ) خط تحریر کیے جس میں ایک صاحب نے مولانا کو ۲۵ ہزار روپیہ قرض حسنہ کے طور پر روانہ کیا اور مولانا کی تفسیر نے حقیقت کی شکل اختیار کی۔ ہمیں مولانا کے ایک دوست نے چند سال پیشتر ایک قصہ سنایا کہ مولانا نے اپنے ان دوست سے (جو دلی کے ایک سینما گھر کے مالک تھے) پوچھا کہ بھائی میاں کوئی مسلمان صاحب بھی فلم ڈائریکٹر ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو ان سے ہم کو

ملا ئیے۔ چنانچہ اس ملاقات کا بندوبست کر لیا گیا۔ مولانا نے معروف ڈائریکٹر محبوب صاحب سے کہا کہ بھائی میاں لوگ ہماری بات نہیں سنتے اور سینما دیکھتے ہیں۔ اس لیے بھائی میاں کچھ ایسی فلمیں ہی بنائیں جس میں مسلمانوں کی معاشرت کی عکاس ہوتی ہو۔ انگریز فلمیں بناتا ہے غیر مسلم ہندوستانی فلمیں بناتے ہیں اور اپنے کلچر کا پروپیگنڈا کرتے ہیں تو کم از کم آپ ایسی فلمیں ہی بنائیے جس میں مسلمانوں کے کلچر کا اظہار ہوتا ہو۔ مولانا نہایت ہی بذلہ سنج، خوش خلق اور ٹھنڈے دل و دماغ رکھنے والے آدمی تھے۔ مولانا کے بچپن کے دوستوں میں آصف علی بیرسٹر اور ملا واحدی وغیرہ شامل ہیں۔

یادگارِ رونق محفل......

(سید ضمیر حسن دہلوی)

دلی کا لال قلعہ اُجڑا اور وہاں کے رہنے والوں کو آزمائشِ دار و رسن سے گزرنا پڑا تو گویا دلی ہی مٹ گئی۔

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

دلی والوں کو قلعہ اور قلعے کی تہذیب جان سے زیادہ عزیز تھی۔ قلعے کو دوبارہ بسانا یا قلعے کی تہذیب کو سیاسی شکست و ریخت کے بعد بھی محفوظ رکھنا تو اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ البتہ اپنے دیوان خانوں میں دلی کے شرفاء نے قلعہ معلّٰی کے آداب کو زندہ رکھنے کے لیے خونِ دل کا ایک ایک قطرہ صرف کر دیا۔ بقولِ غالب گندھی سے گلاب اور بھٹی سے شراب قرض آتی رہی اور کسی نے نہ سوچا کہ یہ فاقہ مستی کیا رنگ لائے گی۔ تہذیبی قدروں کا پختہ شعور حالات کے بدل جانے پر ہمیشہ ظاہری زندگی میں اپنا اظہار کیا کرتا ہے دلی والوں نے دیوان خانوں پر ہزار ہا روپے ماہوار خرچ کیے، قلعہ کی تہذیب، جو قصہ پارینہ ہو چکی تھی زندہ رکھنے کے لیے تمام تر آداب اور وضعداریوں کو برقرار رکھا۔ مہمان نوازیاں اور غربا پروریاں ہوتی رہیں خواہ گھر کی چار دیواری میں بیوی اور بچوں کے ساتھ اُبلی ہوئی شکر قند اور بھنے ہوئے چنے کھا کھا کر گزارے کیے۔ یہ کہاوت کہ ''دلی کی دل والی منہ چکنا پیٹ خالی'' دلی والوں کی انہیں ظاہر داریوں اور رکھ رکھاؤ کا پتہ دیتی ہے۔

دلی اُجڑی تھی سو اُجڑی تھی رفتہ رفتہ دلی والے بھی اُجڑنے لگے اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو دہلوی تہذیب سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی۔ محض چند گھرانے ایسے تھے جہاں اس تہذیب کے نقوش شام کے سائے کی طرح دھندلے دھندلے دکھائی دیتے تھے۔

مولانا احمد سعید کا گھرانا اُن چند گھرانوں میں سے ایک تھا۔ ناہر خاں کے کوچے میں کٹرہ

مہر پرور ہے۔ اس کٹرے میں ذرا دور چل کے ان کا مکان تھا۔ مکان تو آج بھی ہے اور مدت تک رہے گا مگر میرے نزدیک مولانا کی وفات کے بعد اس مکان کا وجود بھی ختم ہوا۔

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

آج دلی شہر دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ چپہ چپہ آباد ہے۔ ہر طرف انسانوں کا اژدہام نظر آتا ہے مگر وہ جنھیں اہل دل اور نگاہ والوں کی نظریں ڈھونڈتی ہیں، معدوم ہو گئے:

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

مولانا کی آمدنی کے ذرائع تو محدود تھے مگر ان کے اخراجات کا میدان بڑا وسیع تھا۔ گھر میں ہر وقت دو چار کا پڑاؤ رہتا تھا۔ سب کے لیے طرح طرح کے کھانے پکتے، ناشتے تیار ہوتے اور گھڑی گھڑی کشمیری چائے کے دور چلتے تھے۔ البتہ خود انھوں نے ایک شانِ فقیرانہ بنائی تھی کہ مرتے دم تک اسی کو نبھایا۔ دلی والوں کا قاعدہ تھا کہ ہمیشہ وہ طریقہ اختیار کرتے جو سدا رہ سکے۔ چال ڈھال، وضع قطع، کھان پینا، سب اول سے آخر تک یکساں رہے اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ میاں کل تک پھٹے پرانوں میں رہتے تھے آج کم خواب وسنجاب نصیب ہوئی تو مزاج ہی بدل گئے۔ دلی والوں کے پیٹ بڑے ہوتے تھے۔ قارون کی دولت ہو تو ان میں سما جائے مگر دیکھنے والوں کو ذرا اندازہ نہ ہو اور اگر غریبی، مفلسی ہے تو پھر وہی پرانا سرانا گاڑھا گزی تن پہ ہے۔ نہ امیر کی امارت نہ غریب کی غریبی، کوئی چیز ظاہر نہ ہونے پاتی تھی۔ مولانا نے فراغت کے دن بھی دیکھے اور ان پہ کڑے وقت بھی آئے۔ انگریزی اقتدار کے وقت برسوں جیل میں رہے مگر ان کے پیچھے بھی گھر داری یونہی چلتی رہی جیسے ان کے سامنے چلتی تھی۔ مولانا کی بیگم بھی بڑی سلیقہ شعار عورت ہیں۔ سلیقے سے میری مراد یہ نہیں کہ کاڑھنا، سینا پرونا اور پکانا اچھا جانتی ہیں بلکہ یہ اصطلاح میرے لیے بڑا وسیع مفہوم رکھتی ہے کچھ ایسا ہی جیسا میرؔ نے اپنے شعر میں بیان کیا ہے:

خوش ہیں دیوانگی میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

مولانا کی اہلیہ میری والدہ کی سگی پھوپی ہیں۔ میں نے انہیں بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ وہ کاڑھتی، بنتی اور سیتی تو مجھے کبھی نظر نہ آئیں البتہ کھانا پکاتے محض دیکھا ہی نہیں بلکہ بارہا اُن کے ہاتھ کا پکا ہوا کھایا بھی ہے۔ دل لگا کے پکاتی ہیں تو خاصا مزے کا ہوتا ہے مگر کھانا پکانے یا کھانے میں دل لگانا ان کا شعار ہی نہیں۔ وہ خود دنیا میں ہیں دنیا کی طلبگار نہیں ہیں۔ نیا کپڑا نہیں پہنتیں، تازہ کھانا نہیں کھاتیں اور بے نیازانہ زیست کرتی ہیں۔ مولانا کے مزاج اور اُن کے مزاج میں درویشی اور قلندری کا فرق ہے۔ مولانا کی فقیری تو حضرت امیر خسرو کی فقیری تھی۔ وہ بڑی شان سے رہتے تھے۔ صفائی، ستھرائی اور نفاست ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کا اظہار زندگی کے ہر شعبے میں از خود ہو جاتا تھا۔

مولانا بڑے وجیہ، خوش شکل اور خوش مزاج تھے سنا ہے جوانی میں اُن کے حسن کا تمام شہر میں چرچا تھا۔ بحیثیت واعظ کے وہ مردوں سے زیادہ عورتوں میں مقبول تھے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مردوں میں ان کے مداح اور معتقد کم تھے۔ مرد بھی ان کی تقریروں اور وعظوں میں پروانہ وار گرتے تھے:

پیغمبر کنعانی عشق پسرے دارد

مولانا کو میں نے ان کے بڑھاپے میں دیکھا۔ میدہ شہاب رنگت تھی پان کھاتے تھے تو گلے میں پیک جھلکتی تھی۔ لانبا قد اور چھریرا بدن تھا۔ خوب لمبے لمبے ہاتھ تھے۔ جو چلتے وقت آگے کم اور پیچھے زیادہ جھولتے تھے۔ خوبصورت سی اُنگلیاں تھیں جو عموماً سیدھی یا ہتھیلی کی جانب مڑی رہتی تھیں۔ چہرے پہ خوب بھرواں داڑھی تھی جو بڑھاپے میں برف کی طرح سفید ہونے کی بجائے گندم گوں ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں دو چار روپہلی تار بھی چمکتے تھے۔ مولانا پان خوب کھاتے تھے۔ پان کی سرخی سے ان کے ہونٹوں پر ہر وقت لاکھا جما رہتا مگر اس میں کلونس نہیں آتی تھی۔ پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ بات کرتے وقت افشاں سی بکھیر دیتے تھے اور مزا یہ ہے کہ سامنے والا اسے آنکھوں سے چن لیتا تھا:

ہر کہ از دوست می رسد نیکوست

مولانا دلی کی ٹکسالی زبان بولتے تھے۔ وعظ کہتے تو روزمرہ اور محاورے کا مزا آ جاتا۔ اُن

ی آواز میں بڑا خلوص تھا۔ خطاب کرتے تو سننے والا اپنائیت سی محسوس کرتا تھا۔ میر کی طرح میاں اور بھائی کہہ کہہ کے بات دلوں پہ نقش کر دیتے تھے۔ واعظ اور خطیب اکثر بڑے خشک ہوتے ہیں۔ نصیحت کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے۔ مگر مولانا پند و موعظت میں بھی اپنی شگفتگی طبع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ وہ اس کے قایل نہ تھے کہ

سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

بلکہ ان کی تقریروں سے مجھے تو ایسا گمان ہوتا تھا کہ وہ گناہگاروں کی شوخیوں کو طرح دے رہے ہیں کبھی ذرا سا خدا کے قہر سے ڈراتے اور توبہ تلا کی تلقین اس طرح فرماتے تھے کہ بندہ شرمسار ہو کر بارگاہ ایزدی میں گڑگڑانے لگتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک متمول تعیش پسند سے مسکرا کے فرمایا ''میاں تم ہمارے کہنے سے وہ سب کچھ تو چھوڑو گے نہیں جو کرتے ہو۔ البتہ ایک کام اور کر لیا کرو اس اللہ کے دیے میں سے کسی یتیم یا بیوہ کی شادی بیاہ پہ کچھ لگا دیا کرو'' یہ نصیحت سننے والے نے ایسی گرہ میں باندھی کہ پھر تو وہ سارے شہر میں یتیموں اور بیوہ کی شادی کرانے والے مشہور ہو گئے۔ مولانا شب قدر میں وعظ کہتے تو سارے سال کی بداعمالیوں کا ذکر تک نہ کرتے تھے بس اس شب کی فضیلت کچھ اس طرح بیان کرتے کہ مغفرت کی دعا کرتے وقت لوگ دھاڑیں مار مار کے روتے تھے۔ ان کے پاس کوئی حساب تھا جس سے وہ رمضان میں شب قدر کا قیاس کرتے تھے اور اس رات مچھلی والوں کی مسجد میں پچھلے پہر اندھیرا کر کے بڑے روح پرور انداز میں دعا کراتے تھے۔ بلاشبہ ہزاروں اس رات نجات پاتے ہوں گے۔

ہر چند حکما نے فرمایا ہے کہ انسان اپنے تئیں سب سے برا جانے مگر ایسا عملی طور پر بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ دو چار سجدے ریاکارانہ بھی کر لیے تو آدمی سمجھتا ہے کہ تمام نوعِ بشر میں اسے فضیلت حاصل ہو گئی۔

ترکِ بتاں سے مائل پندار ہو گئے

اس قبیح اور مذموم عادت کا شکار سب سے زیادہ برگزیدہ طبقہ ہی ہوتا ہے ہما شما کس بوتے پر غرور کرے گا۔ اکثر مولوی اور متقی اس عیب کے باعث عوام سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ خدا جانے حشر میں ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ البتہ دنیا میں اُن کی ذات گرامی سے کسی کو

فائدہ پہنچنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے۔ مولانا کا مزاج اس کے برخلاف تھا ان کے خلوت خانے میں نام نہاد گناہگاروں کو آنے کی کھلی اجازت تھی۔ آدمی بھلے کے پاس بیٹھتا ہے تو بھلائی لے کر اُٹھتا ہے۔ مولانا کے قرب نے بہت سے لوگوں کو لہو ولعب سے تائب کرا دیا۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ مولانا جواری، ڈھنڈاری، سٹے باز اور اسی قبیل کے دوسرے لوگوں سے بھی بڑی شفقت سے پیش آتے تھے اور باتوں باتوں میں انہیں سیدھی راہ پر لگا دیتے تھے۔ مولانا نے محبت کرنا سیکھی تھی وہ انسان میں اعمال کے اعتبار سے تفریق کے قائل نہ تھے۔ ان کا ذہن بڑا کشادہ اور ظرف بڑا وسیع تھا۔ ان کی نظر آدمی کے عیب سے زیادہ اس کے ہنر پر جاتی تھی۔

مغرب کے بعد خاص طور پر مولانا کے مکان پر ایک عام نشست ہوتی تھی۔ اس میں علماء، صلحاء سے لے کر اجہل اور اسفل تک بار پاتا تھا۔ مولانا کچھ اس طرح بیٹھے رہتے کہ سب پر اُن کی شخصیت برابر کی نوازش کرتی۔ فقیری کی اس شان پر ممکن ہے اہل نخوت چیں بجبیں ہوتے ہوں مگر مولانا کسی کی مطلق پروا نہ کرتے اور ہنس ہنس کے ان لوگوں سے باتیں کیے جاتے جو سچ پوچھئے تو مولانا کی بلیغ اور پر کنایہ گفتگو سمجھنے کے بھی اہل نہ تھے۔ سورج کی روشنی جہاں اپنی کرنوں سے پھولوں کو نکہت اور تازگی بخشتی ہے وہاں خس و خاشاک کو بھی محروم نہیں رہنے دیتی۔ مولانا کی مثال کچھ ایسی ہی تھی۔ ہر طبقے اور ہر ذہن کا آدمی مولانا کی بارگاہ سے فیض پاتا تھا۔

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

مولانا کی باتیں بڑی مزے دار ہوتی تھیں۔ وہ محفل میں شگفتگی کے پھول بکھیرتے تھے۔ زیادہ بولنا اور بحث مباحثے کرنا ان کا شعار نہ تھا پان منہ میں لیے خاموش بیٹھے رہتے اور اُن کے روبرو لوگ مختلف مسائل پہ گفتگو کیے جاتے تھے۔ وہ اس طرح سنتے رہتے جیسے بڑے متوجہ ہوں مگر دخل بہت کم دیتے تھے۔ البتہ درمیان میں دو چار چٹکلے ایسے چھوڑتے کہ تمام محفل زعفران زار ہو جاتی تھی۔ مولانا کے جملے بڑے تیکھے ہوتے تھے۔ لطیف طنز اور مزاح ان کے مزاج کا جزو تھا۔ ایک بزرگ روز شام کو بے بنیاد خبریں لاتے اور ان میں نمک مرچ لگا لگا کے بیان

کرتے تھے۔ مولانا اس طرح سنتے جیسے بڑے پتے کی بات بتائی جارہی ہو۔ اوّل حیرت اور استعجاب کا اظہار کرتے اور جب وہ بزرگوار طرح طرح سے یقین دلاتے تو مولانا قایل سے ہو جاتے تھے۔ ایک دن یہ لن ترانی جاری تھی مولانا کے ایک سنجیدہ دوست برابر بیٹھے تھے صاحب تقریر انہیں بھی بار بار مخاطب کرتے تھے۔ مولانا نے بڑے شگفتہ انداز میں فرمایا ''میاں ان کی باتیں سن تو لو مگر للہ یقین نہ کرنا'' اور پھر خود بھی ایسی توجہ سے سننے لگے جیسے یہ جملہ محض مذاقاً کہا تھا۔

مولانا بڑے صاف گو اور بے باک تھے جو کچھ دل میں ہوتا تھا منہ پر رکھ دیتے تھے۔ ان سے کسی کام کو کہیے تو چھوٹتے ہی انکار کرتے تھے مگر اس انکار میں سو سو اقرار پنہاں ہوتے تھے۔ جو لوگ مولانا کے مزاج سے ناواقف تھے وہ اس انکار سے برگشتہ خاطر ہوتے تھے مگر مولانا بہت جلد اپنے پرخلوص اور مشفقانہ رویے سے اس بدمزگی کو دور کر دیتے تھے۔ میں نے ایک بار طالب علمی کے زمانے میں ایک وظیفہ کے لیے سفارش کو کہا۔ مولانا نے ٹالنے کے لیے اندھیرے میں تیر پھینکا ''میاں تم پڑھتے لکھتے تو ہو نہیں وظیفہ لے کے کھا جاؤ گے'' پھر جب میں نے بتایا کہ میں یونیورسٹی کے اچھے طالب علموں میں سے ایک ہوں تو انھوں نے میری بڑی تعریف کی اور تعریف کا یہ سلسلہ بعد کی ہر ملاقات میں جاری رہا۔ بات یہ تھی کہ مولانا کے پاس آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ مولانا کسی کو جانتے تھے کسی کو نہیں، اس لیے جب کوئی ان سے کسی کام کو کہتا تو مولانا کو سو طرح کے شک گزرتے اور مولانا دل میں نہ رکھتے تھے۔ جھٹ منہ پہ لے آتے۔ کوئی برا مانے یا بھلا، مولانا کی یہ عادت تھی۔

ایک صاحب کی نوکرانی ذرا ہاتھ کی چالاک تھیں۔ آخر رسوا ہو کے نکال دی گئیں۔ بڑی بی مولانا کے پاس فریاد لے کے پہنچیں تو مولانا نے صاحب معاملہ سے استفسار کیا اور بڑھیا سے صاف کہہ دیا کہ ''بوا تم چوٹی ہو تمہیں رکھ کے کوئی کیا کرے گا'' اس صاف گوئی کے باعث مولانا کے مداحوں کی طرح مولانا کے مخالفین کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ ان کی زبان کے چٹخارے کو ہر ایک کیسے سمجھ لیتا۔ بادی النظر میں تو یہ شوخی کلام تیزی اور تندی معلوم ہوتی تھی۔

مر چک کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بری طرح

منبر پہ ہوتے تو مولانا رسوم پرستی کے خلاف دھواں دار تقریریں کرتے تھے مگر خود بہت سی رسموں کے دلدادہ تھے۔ رسموں سے بے اعتنائی برتنا یوں بھی مہذب آدمی کا شیوہ نہیں۔ ہاں اگر یہ رسمیں عقاید اور ایمان پر بوجھ بننے لگیں تو ان کا ترک کرنا ہی بہتر ہے۔ اصلاح الرسوم کی تحریک کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ مسلمانوں کے عقیدے رسموں کی بھینٹ چڑھنے لگے تھے اور رفتہ رفتہ زندگی کے خارجی تقاضے زندگی کے باطنی یا روحانی عناصر پر غالب آ گئے تھے۔ ناسمجھ عوام ظاہر اور باطن کو جدا جدا دیکھنے کی صلاحیت کم رکھتے ہیں۔ مولانا عوام سے خطاب کرتے تو ہر رسم کو مذموم قرار دیتے مگر تنہائی میں کسی باشعور سے گفتگو کرتے تو ان کا انداز جدا ہوتا تھا۔ سلطان جی کی سترہویں میں رات کے پچھلے پہر اپنے مقربین کے ساتھ ایک چکر لگائے بغیر انہیں چین نہیں آتا تھا۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

بزرگوں کے مزارات اور صوفیہ کے برگزیدہ طبقے سے مولانا کو بڑی عقیدت تھی اور ان کے مزاج میں جو رنگا رنگی تھی وہ غالباً اسی راستے سے آئی تھی۔

مولانا کا سیاسی کردار بھی زیر بحث آنا چاہیے۔ مگر میں تو انہیں سیاسی شخصیت ہی نہیں مانتا۔ جو شخص آزادی کے لیے جیلوں میں چکیاں پیسے اور آزادی کے بعد ملکی سیاست سے دست بردار ہو جائے اسے سیاست داں کہنا ہی درست نہیں۔ سیاست تو راہ سے زیادہ منزل پہ نظر رکھنا سکھاتی ہے۔ یہ کیا کہ دُکھ سہیں بی فاختہ اور انڈے کوے کھائیں۔ مولانا آزاد مزاج تھے۔ ان کی طبیعت غلامی کی حد بندیوں سے نباہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ حریت پسندوں میں پیش پیش رہے مگر جب ملک آزاد ہو گیا تو گھر کی چار دیواری میں مقید ہو گئے:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا!

کتنی بار ایسا ہوا کہ مولانا محکمہ کسٹوڈین یا کسی اور دفتر میں لوگوں کے ساتھ گئے اور قافلے والوں کی بے نیازی دیکھئے کہ قافلہ سالار کو پہنچانے سے انکار کر دیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس جانکاہ صدمے سے جان دے دیتا مگر مولانا ہنس کے فرماتے تھے:

انقلابات ہیں زمانے کے!

مولانا چاہتے تو اربابِ حل وعقد کے توسط سے بہت کچھ کر سکتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو ان کے قریبی دوست تھے مگر ان کی غیور طبیعت کبھی کسی کے وسیلے سے کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ انھوں نے جو کچھ کیا اپنے بازوؤں کے بل پہ کیا۔ ہزاروں مکان کسٹوڈین سے واگزار کرائے اور ہر برے وقت میں قوم کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو کے سیکڑوں مسائل حل کیے مگر سوائے خدا کے کسی کی مدد کے طلبگار نہ ہوئے۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

ایک مزے دار بات سنیے۔ مولانا کے دلی میں دو چار مکان تھے۔ ان میں سے ایک دو کسٹوڈین نے ہتھیا لیے۔ میری والدہ جس مکان میں رہتی ہیں اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ میں خود مولانا کے پاس یہ قضیہ لے کے پہنچا۔ انہوں نے سارا ماجرا سن کر کہا ''میاں چھوڑو کرایہ دینے لگو اب کہاں پیروی کرتے پھرو گے'' پھر والدہ کے اصرار پر مولانا نے ایک حلف نامہ اس مضمون کا داخل کیا کہ وہ ہندوستان کے شہری ہیں اور کبھی پاکستان نہیں گئے۔ آج خیال آتا ہے کہ مولانا کو اس کاغذ کی تکمیل میں کیسی اذیت برداشت کرنا پڑی ہوگی۔

مولانا کا تحمل اور قوتِ برداشت تو میں نے ان دنوں دیکھی جب اسماعیل چوئی نے ان کے چاقو مارا۔ اس واقعے کا تذکرہ انھوں نے جس سے بھی کیا اس انداز سے کیا گویا وہ کسی بچے کی شرارت کا ذکر کرتے ہوں، ذرا غم وغصہ کا اظہار نہیں تھا۔ لوگ تفصیل معلوم کرنے کے لیے کرید کرید کر پوچھتے تو مولانا سیدھے سبھاؤ جواب دیتے ''میاں وہ اسماعیل چوئی جو ہمارے ملنے جلنے والوں میں سے ہے، اس نے کسی کے بہکائے سکھائے میں آ کے یہ حرکت کی ہے'' گویا نہ اس سے کچھ شکایت ہے اور نہ بہکانے سکھا۔نے والوں کا رونا ہے:

تو مرے خون کو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

مولانا قلب کے مریض تھے اور ان کی عام صحت بھی اچھی نہ تھی۔ مگر نہ تو ان کے مزاج میں بیماروں کی سی چڑچڑاہٹ تھی اور نہ مایوسی۔ بڑی زندہ دلی سے جیتے تھے۔ سنا ہے ڈاکٹر حکیم حیران تھے کہ قلب اتنا ضعیف ہونے پر وہ زندہ کیسے ہیں۔ مگر مولانا تو کلت علی اللہ کے قائل

تھے۔ ایک دن پرہیز نہیں پایا قاعدہ علاج کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ان کی اولادیں ڈاکٹری علاج پہ بضد تھیں۔ جب اُن کے ہاتھوں میں پڑتے تو علاج معالجے کی پابندیاں بادلِ ناخواستہ برداشت کر لیتے تھے۔ ورنہ وہ تو چٹکی پٹکی میں کام چلاتے تھے۔ بڑے تیقن سے جیتے تھے۔ تیس سال سے قرآن شریف کا ترجمہ کر رہے تھے بڑی محنت پڑ رہی اور جگر کاوی کی تھی اسی لیے اس کی تکمیل تک جینے کی آرزو تھی۔ اللہ نے ان کی دعا سن لی ترجمہ مکمل ہوا اور ابھی چھپنے کا پروگرام بن رہا تھا کہ مولانا یکا یک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

خدا انھیں غریق رحمت کرے، ان کے ساتھ دلی کی وضعداریاں، بولیاں، ٹھٹھولیاں، توکل شعاریاں اور محفلیں سب ختم ہوئیں۔ اللہ بس باقی ہوس۔

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونق محفل تھی پروانے کی خاک

مولانا احمد سعید دہلویؒ

(ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری)

مولانا احمد سعید دہلویؒ کا علمی تبحر بے مثال تھا۔ وہ فاضل اجل تھے، بہترین خطیب تھے، انتہائی خوش گفتار تھے۔ جب خالص دہلی کی ٹکسالی زبان میں گفتگو فرماتے تو معلوم ہوتا کہ دہن مبارک سے گل پاشی فرما رہے ہیں۔ جب تقریر فرماتے تو سامعین اتنے دم بخود اور ہمہ تن گوش ہو جاتے کہ معلوم ہوتا جیسے ان پر کسی نے سحر کر دیا ہو۔ مولانا شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ ان کی تحریریں شگفتگی اور چاشنی سے لبریز ہوتیں، ان میں اختصار اور جامعیت بھی پائی جاتی۔ ہر لفظ ناپ تول کر استعمال کرتے۔ جملوں کی بندش ایسی کہ ان میں نہ کسی لفظ کے اضافے کی گنجائش ہوتی نہ تخفیف کی۔

مولانا کی فصاحت و بلاغت اور خوش گفتاری و شیریں مقالی ضرب المثل تھی۔ اسی لیے ان کو 'سحبان الہند' کے لقب سے یاد کیا جاتا۔ اس نسبت کی صحیح قدر و قیمت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ 'سحبان' کے بارے میں کچھ بتا دیا جائے۔ سحبان حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں مشہور شاعر گزرا ہے۔ وہ فصاحت و بلاغت میں بے نظیر و بے عدیل تھا۔ اس کے باپ کا نام وائل تھا۔ اس لیے 'سحبان وائل' مشہور ہوا۔ اس کی فصاحت نے ضرب المثل کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

مولانا کی صحیح تاریخ ولادت کا علم نہ ہو سکا۔ عام خیال ہے کہ وہ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ خود مولانا کو بھی اس کا صحیح علم نہیں تھا۔ محض قیاس کی بنیاد پر انہوں نے ۱۸۸۸ء متعین فرما لیا تھا۔ چنانچہ اپنے مخلص دوست جناب ملا واحدی کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''میں نے اپنی ولادت کا حساب ۱۸۸۲ء لگایا تھا۔ میونسپلٹی کا ریکارڈ پچھلے ہنگاموں میں تلف ہو چکا ہے۔ اس لیے باضابطہ کوئی ثبوت میرے پاس نہیں تھا۔ البتہ مدار کا چاند یعنی جمادی الاوّل مجھے یاد تھا اور یہ بھی یاد تھا کہ قاضی لطیف الحق حقی اور میں ایک مہینہ میں پیدا ہوئے

ہیں۔ بالآخر میں نے ۱۸۸۸ء پر پختہ رائے کر لی اور مظہر اللہ تاریخی نام بھی نکال کر بیٹھ گیا ہوں لیکن آپ کے خط نے مجھے پھر شک میں ڈال دیا۔ (بحوالہ دلی والے، مرتبہ صلاح الدین دہلی، اُردو اکاڈمی ۱۹۸۶ء ص ۴۴-۴۵)

مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ان کے والد حافظ محمد نواب مرزا (متوفی ۱۹۰۸ء) کی زیر نگرانی ہوئی۔ انؒ ہی کی نگرانی میں کلام پاک حفظ کیا۔ اعلیٰ تعلیم اور علوم دینیہ کی تکمیل مدرسہ امینیہ اسلامیہ دلی سے مفتی محمد کفایت اللہ کی زیر سرپرستی کی۔ مدرسہ امینیہ کو ہندوستان کے اسلامی مدارس میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ اسے ۱۸۸۶ء میں مولانا امین الدین اورنگ آبادی نے قائم کیا تھا جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اس مدرسہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس سے مولانا انور شاہ کشمیری، مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا ضیاء الحق دیوبندی جیسی نابغہ روزگار شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ مولانا احمد سعید صاحب اس مدرسہ کے بہت ممتاز اور مفتخر طالب علم تھے۔

حضرت سحبان الہند صحیح معنی میں دلی والے تھے۔ اس کی مخصوص اسلامی تہذیب کے دلدادہ اس کی ٹکسالی زبان اور محاوروں کے گرویدہ، مخصوص شیریں اور شگفتہ لہجہ کے حامل۔ ان کی سکونت دہلی کے مشہور کوچہ چیلان میں تھی اور زندگی بھر اسی کوچہ سے وابستہ رہے۔ اس کوچہ کو تاریخی اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ، خواجہ محمد میر دردؔ، خواجہ محمد میر اثرؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مفتی محمد کفایت اللہ، ملا واحدی اور بیرسٹر آصف علی جیسی نامور ہستیاں اسی کوچہ میں رہائش پذیر رہیں۔

مولانا احمد سعید صاحب نے بڑی فعال زندگی بسر کی۔ وہ مذہبی تحریکوں سے بھی متعلق رہے اور سیاسی تحریکوں سے بھی۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دیگر اکابر ملت اور زعمائے قوم کے ساتھ متعدد بار در زنداں پر دستک دی اور اس کی کال کوٹھریوں کو اپنے وجود سے منور کیا۔ انہوں نے ۱۹۲۱، ۱۹۳۰، ۱۹۳۲، ۱۹۴۰ اور ۱۹۴۲ میں جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کی اسارت کی مجموعی مدت تقریباً دس سال ہوتی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں جب وہ

میانوالی جیل میں اسیر تھے تو ان سے چکی پینے کی مشقت بھی لی گئی۔ مولانا شاعر بھی تھے جیل میں عالم تنہائی میں تفنن طبع کی خاطر مشق سخن بھی کرتے تھے۔ اس لیے مولانا حسرت موہانی کا یہ مشہور شعر:

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

ان کے اوپر بھی پوری طرح صادق آتا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا کے ساتھ ان کے دو صاحب زادے حافظ محمد سعید (متوفی ۱۵؍دسمبر ۱۹۶۵ء) اور مولوی مظہر سعید (متوفی ۱۹؍جنوری ۱۹۶۸ء) بھی قید کیے گئے تھے۔

۱۹۱۹ء کے آخری دنوں میں جمعیۃ علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا تاسیسی اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے فرمائی تھی۔ اسی دن سہ پہر میں اس کا دوسرا اجلاس مفتی محمد کفایت اللہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اسی تاسیسی جلسہ میں مولانا احمد سعید صاحب کو جمعیۃ علماء کا ناظم عمومی مقرر کیا گیا۔ ۱۹۴۰ء تک وہ مسلسل اس منصب پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ کل ہند جمعیۃ کے نائب صدر اور اسکی دہلی شاخ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے وصال کے بعد وہ اس کے صدر بنائے گئے اور اپنی وفات (۴ دسمبر ۱۹۵۹ء) تک اس عہدے پر فائز رہے۔

مولانا سیاسی خیالات کے لحاظ سے نیشنلسٹ مسلمان تھے۔ آخر وقت تک کانگریس پارٹی سے وابستہ رہے اور اسی کے ٹکٹ پر ۱۹۵۷ء میں پارلیمنٹ کا الیکشن بھی لڑے۔ وہ مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کے شدید مخالف تھے اور اسے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے مہلک تصور کرتے تھے۔ اسی طرح تقسیم ملک کے بعد مسلمانوں کا ہندوستان سے ترکِ سکونت کر کے پاکستان کو چلا جانا بھی انہیں سخت ناپسند تھا۔ اس کا اندازہ ان کے ان خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے پاکستان میں اپنے احباب کو لکھے۔ مثلاً ایک خط میں اپنے مخلص دوست اور اُردو کی مشہور شخصیت ملا واحدی کو ان کے پاکستان چلے جانے پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میاں میں تو تمہاری تلاش میں تھا۔ پتہ کوئی نہیں بتا تا تھا۔ تمہیں خبر بھی ہے تم نے کتنا گناہِ عظیم کیا ہے۔ اللہ کے ہاں اس کی باز پرس ہوگی۔ تب پتہ چلے گا تمہارے بھاگنے سے سارا محلّہ بھاگ پڑا۔ (بحوالہ دلی والے، حصہ اول، ص ۴۹)

۱۹۴۷ء کی رستاخیز میں مولانا دہلی میں ہی رہے اور دہلی والوں کی ہر طرح سے خدمت کرتے رہے۔ اس قیامتِ صغریٰ میں جن حضرات نے مسلمانانِ دہلی کی پشت پناہی کی، آڑے وقت میں ان کی ڈھارس بندھائی، مشکلات میں ان کی دستگیری کی اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر ان کی جانیں بچائیں۔ ان میں سحبان الہند کے علاوہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن، رفیع احمد قدوائی، میر مشتاق احمد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی خدمات جدید ہندوستان کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ مولانا کی بے لوثی، بے غرضی، قناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ تنگ دستی اور عسرت کے زمانے میں بھی آپ نے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ انہوں نے نہ کبھی کسی منصب کی خواہش کی، نہ کسی عہدے کے لیے کوشش کی اور نہ مالی منفعت کے لیے جدو جہد کی۔ اس کا ثبوت صرف اس ایک واقعہ سے پیش کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۲ء سے ان کو ریاست حیدر آباد سے مبلغ تین سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا لیکن جب انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا تو انگریز حکومت کے اشارے پر ریاستِ حیدر آباد کے اربابِ اقتدار نے انہیں سیاست میں حصہ نہ لینے کا مشورہ دیا اور اشارتاً یہ بھی کہا کہ بہ صورت دیگر وظیفہ سے محروم ہونا پڑے گا۔ یہ بات مولانا کی حریت پسندی اور جذبہ خودداری کے منافی تھی اس لیے انہوں نے نہ صرف اس مشورے کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا بلکہ وظیفے کو بھی ٹھکرا دیا اور اقبالؔ کے اس شعر کی عملی تفسیر بن گئے۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مزید یہ کہ بعد میں ریاست کے بار بار اصرار پر بھی وظیفہ کو دوبارہ جاری نہیں کرایا۔ مولانا

اگر چاہتے تو حصولِ آزادی کے بعد اپنے اور دیگر افراد خاندان کے لیے بہت سی مراعات حاصل کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ آزاد ہندوستان کے تمام ارباب اقتدار بشمول صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے بے حد اچھے مراسم تھے اور یہ حضرات مولانا کا بہت احترام کرتے تھے۔ یہ بات بھی اب کسی سے پوشیدہ نہیں کہ آزادی کے بعد پنڈت نہرو نے ہمارے اکابر کو جنھوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اور وطن عزیز کی آزادی کی خاطر بے مثال قربانیاں پیش کی تھیں مختلف انداز سے نوازنا چاہا، کسی کو عہدے پیش کیے کسی کو اعزازات اور کسی کو وظیفے۔ حضرت سحبان الہند کے لیے تین سو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کرنا چاہا اور اپنے سیکرٹری جان متھائی کو ایک فارم لے کر ان کی خدمت میں بھیجا کہ اس پر وہ دستخط کر دیں تو حکومت کی جانب سے ان کے لیے وظیفہ جاری ہو جائے لیکن انہوں نے وزیر اعظم کی اس درخواست کو شرف قبولیت نہیں بخشا۔ دراصل ان تمام اکابر نے یہ موقف اپنایا کہ اپنے وطن عزیز کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا ان کا مذہبی فریضہ تھا اور مذہبی فریضہ کی ادائیگی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

مولانا انتہائی بے باک اور نڈر انسان تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب دہلی کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا تھا اور ان کے آثار و معابد کو ختم کر کے ان کے نشانات تک مٹا دینے کی کوششیں کی جا رہی تھیں، اس وقت دیگر اکابر کے ساتھ مولانا بھی سینہ سپر ہو کر میدان میں آ گئے۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو اور دوسرے ارباب اقتدار سے مسلسل ربط قائم رکھا اور انہیں مجبور کیا کہ حالات پر قابو پانے اور امن و امان بحال کرنے کے لیے موثر اقدامات کریں۔ انہیں حضرات کی کوششوں سے امن قائم کرنے کی غرض سے گاندھی جی نے دہلی شہر کا دورہ کیا۔ اسی دورے میں وہ خصوصی طور پر حضرت سحبان الہند سے ملاقات کرنے ان کے مکان پر بھی تشریف لے گئے۔ مولانا ان کو حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ پر بھی لے گئے اور اس کی حالت زار سے واقف کرایا اور پھر گاندھی جی کے ہی اصرار پر اس کی صفائی اور مرمت اپنی نگرانی میں کرائی۔

علمائے دین سے خاص تعلق:

مولانا کو علماء سے بڑا گہرا اور قلبی تعلق تھا۔ مفتی محمد کفایت اللہ کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ مفتی صاحب ان کے استاد بھی تھے اور زمانہ طالب علمی میں نگراں اور سرپرست بھی رہے تھے۔ ان کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بھی خصوصی تعلق تھا۔ ۵؍دسمبر ۱۹۵۷ء کو حضرت مدنی کی وفات پر انہوں نے جو تعزیتی مضمون سپردِ قلم کیا تھا اس کے ایک ایک لفظ سے عقیدت و احترام کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

''ان کی وہ تعلیمی خدمات جو انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں انجام دی ہیں اور اس اندرونی خلفشار کے زمانے میں جب کہ دارالعلوم کی حیات خطرہ میں تھی دارالعلوم کی سرپرستی فرما کر اس کو سنبھالا اور بچایا ہے۔ حضرت شیخ کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی عظمت و صداقت کا صلہ دربارِ رسالت سے تو مولانا مدنی کو ملے گا ہی لیکن دارالعلوم کے در و دیوار اور وہاں کی خاک کے پاک ذرے بھی مولانا مدنی کے خلوص پر قیامت کے دن شہادت دیں گے۔ اس تمام دینی اور وطنی خدمت کے باوجود ان کی ریاضت اور عبادت اور کشف و کرامات کے حالات وہ حضرات بخوبی جانتے ہیں جنھوں نے رمضان شریف کی راتیں حضرت اقدس کی خدمت میں رہ کر گزاری ہیں یا جن کو جیل خانے کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں ان کے ہمراہ رات بسر کرنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ میں ایک دور افتادہ اور علم و عمل کی روشنی سے محروم اس پر کیا لب کشائی کر سکتا ہوں۔ صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ حضرت شیخ الاسلام آزادی وطن کے ایک جانباز جرنیل تھے اور بین الاقوامی شخصیت اور علم و عمل اور زہد و تقویٰ اور ایثار قربانی کے مجسم پیکر اور اخلاق و انسانیت کے سب سے بلند و بالا مظہر اور سلف صالحین کی ایک زندہ یادگار تھے جن کا سایہ ہم قسمتوں کے سر سے اُٹھ گیا اور ہم کو یتیم و

لاوارث کر گیا جس کا ہمسر اور مثل و عدیل صدیوں میں بھی میسر آنا
مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو مقام صدق میں ایک مقتدر کے قرب سے
نوازے اور ہم کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(الجمعیۃ۔ دہلی (شیخ الاسلام نمبر ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء) ص ۵)

اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ان کو مخصوص لگاؤ اور قلبی تعلق تھا۔ امام الہند بھی ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے جس زمانے میں مولانا آزاد کلکتہ میں رہائش پذیر تھے اس زمانے میں سحبان الہند کئی بار ان کے مہمان رہے تھے۔ اس کی یادیں آخر وقت تک ان کے حافظے میں محفوظ ہیں۔ اس کا تذکرہ انہوں نے مولانا آزاد کے انتقال کے بعد ایک تعزیتی مضمون میں بھی کیا ہے۔ اس میں انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو جن الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی گوناگوں صفات کا تذکرہ کیا ہے ان سے مولانا کے صحیح مقام و مرتبہ کا علم تو ہوتا ہی ہے اسی کے ساتھ دونوں کے مراسم کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد صرف علوم مذہبی کے متبحر اور ایک جلیل القدر، بلند پایہ عالم ہی نہ تھے بلکہ میدانِ سیاست کے بھی وہ بہترین شہسوار تھے اور سیاست میں وہ نہایت مدبر اور انتہائی دور اندیش مفکر اور معاملہ فہم واقع ہوئے تھے۔ ان کو تمام ایشیا کی سیاست سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ان کو قدرت نے بڑی بصیرت اور فہم صحیح عطا فرمایا تھا۔

ہندوستان کی حکومت میں ان کا بڑا پایہ تھا۔ وہ اس حکومت کے وزیر تعلیم ہی نہ تھے بلکہ وزیر اعظم کے دست راست اور ان کے بازوؤں کی قوت تھے۔ ان کے مفید مشورے پوری حکومت کے لیے رہنمائی کا کام کرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے اُلجھے ہوئے معاملات کو اپنے خداداد تدبر سے ہوشمندی و دانش وری کے ساتھ سلجھا دیا کرتے تھے۔ وہ سیاسی سوجھ بوجھ میں بے مثل اور بے نظیر تھے۔ وہ ادب میں ایسے بے مثل ادیب

تھے کہ ان کی تقریر و تحریر کا جواب ان کی زندگی میں کسی دوسرے انسان سے بن نہ آ سکا۔ ان کے کلام میں ایسی جدید اور انوکھی بندشیں ہوتی تھیں جو صرف ان ہی کا حصہ تھا اور قدرت نے اس انوکھے طرزِ تعبیر کو ان کے لیے مخصوص فرما دیا تھا۔ بہر حال وہ ادب، سیاست اور مذہب کے بہترین اور بے مثل شناور تھے۔ اب دنیا اس شہ سوار علم و فن کو مدتوں روتی رہے گی اور اس کا کوئی دوسرا ہمسر نہ پا سکے گی۔ میدانِ جنگ میں ان کی جنگی تھپڑوں نے لارڈ ہیول اور لارڈ اِرون کو عاجز اور درماندہ کر دیا تھا۔

وہ ان تمام علمی، ادبی اور سیاسی خوبیوں کے ساتھ انتہائی خوش طبع اور انتہائی خوددار تھے۔ خوش طبعی بھی ان کی ادب اور جدید بندشوں سے لبریز ہوتی تھی۔ وہ اپنی رائے ظاہر کرنے میں کبھی جھجکتے نہ تھے۔

(الجمعیۃ دہلی (آزاد نمبر ۔ ۴؍ دسمبر ۱۹۵۸ء) ص ۵۳)

اس کے بعد اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

''خلافت کے دور میں ایک جلسہ کی جب وہ صدارت فرما رہے تھے، میں نے تقریر کی تھی۔ یہ جلسہ شاید کلکتہ میں ہوا تھا۔ کلکتہ میں کئی مرتبہ ان کی مہمان نوازی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ان پر مختلف دور گزرتے رہے اور میں نے ان کو ہر حال میں صابر اور شاکر پایا۔ (۲)

ان دونوں حضرات کے خیالات اور افکار کی ہم آہنگی اور یک جہتی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ۲۰؍ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جمعہ کی نماز کے بعد دہلی کی تاریخی جامع مسجد میں مسلمانوں کا جو عام جلسہ ہوا تھا اور جس میں مولانا آزاد نے تاریخ ساز تقریر فرمائی تھی اور مسلمانوں کو ملک کی تقسیم کے نتیجہ میں پیدا شدہ نامساعد حالات سے مغلوب ہو کر ہندوستان سے ترک سکونت کر کے پاکستان جانے کے ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس جلسہ کی صدارت حضرت سحبان الہند نے ہی فرمائی تھی۔ اسے ہم ان کی عالی ظرفی ہی قرار دے سکتے ہیں کہ مولانا آزاد کی

وفات پر جو تعزیتی مضمون تحریر فرمایا تھا اور جس کے دو اقتباسات گزشتہ صفحات پر پیش کی گئے اس میں انہوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ مولانا کی صدارت میں منعقد ہونے والے جلسہ میں انہوں نے تقریر کی تھی لیکن اس بات کا تذکرہ نہیں فرمایا کہ خود ان کے زیر صدارت منعقدہ جلسہ میں مولانا آزاد نے تقریر فرمائی تھی اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مولانا آزاد کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) پر ان کے جنازے کی نماز حضرت سحبان الہند نے پڑھائی تھی۔ مولانا آزاد جیسے بے مثال عالم دین، مفسر قرآن، فصیح اللسان خطیب، جادو بیان مقرر اور بہترین نثر نگار کے لیے یہ بات انتہائی موزوں تھی کہ مولانا احمد سعید صاحب جیسے جید عالم، عظیم المرتبت مفسر، عارف اسرار شریعت و طریقت، آفتابِ فصاحت و بلاغت اور شہنشاہِ خطابت اور سحبان الہند کو ان کی نماز جنازہ کی امامت کا شرف حاصل ہو۔

مولانا نے ۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء بروز جمعہ ساڑھے سات بجے شب اچانک داعی اجل کو لبیک کہا، اگلے دن درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے باہری حصہ ظفر محل کے قریب خود ان کی وصیت کے مطابق مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی دائیں جانب تدفین عمل میں آئی۔ نمازِ جنازہ مولانا محمد یوسف صاحبؒ امیر جماعت تبلیغ نے پڑھائی۔ غالبؔ نے شاید ایسے ہی سانحات کے لیے کہا تھا:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

حضرت سحبان الہند تحریر و تقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان کی خطابت پر جوش، مواعظ پر مغز و دل نشین اور تقاریر شگفتہ اور اثر آفریں ہوتی تھیں۔ آواز میں سوز تھا اس لیے حاضرین ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سنتے اور اثر قبول کرتے۔ اسی طرح ان کی تحریریں بھی فصاحت سے لبریز اور دل آویز ہوتی تھیں۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ تصانیف کی تعداد بیس تک پہنچتی ہے۔ ان کے نام حسبِ ذیل ہیں:

(۱) جنت کی کنجی (۲) دوزخ کا کھٹکا (۳) مشکل کشا (۴) خدا کی باتیں (۵) رسول کی باتیں (۶) دین کی باتیں (۷) پردہ کی باتیں (۸) شوکت آرا بیگم (۹) از بلا (۱۰) جنت کی

ضمانت (۱۱) ماہِ رمضان (۱۲) صلوٰۃ و سلام (۱۳) عرشِ الٰہی کا سایہ (۱۴) تفسیر کشف الرحمٰن (۱۵) تقاریر احمد سعید (۱۶) پہلی تقریر سیرت (۱۷) دوسری تقریر سیرت (۱۸) رسول اللہؐ کے تیس معجزات (۱۹) مکاتیب احمد سعید (۲۰) ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں۔

یہ تمام تصانیف اصلاحی اور تبلیغی نوعیت کی ہیں۔

مولانا کی شاعری:

مولانا شاعری بھی کرتے تھے۔ اسیر تخلص تھا۔ افسوس کہ اب ان کا کلام دستیاب نہیں۔ ذوقِ سخن بہت اعلیٰ اور پاکیزہ تھا۔ ان کو ادبی محفلوں اور شعری نشستوں سے بڑی رغبت تھی۔ آج کل یومِ جمہوریہ کے موقع پر لال قلعے میں جو کل ہند مشاعرہ ہوتا ہے اس کی ابتدا ۱۹۵۲ء میں ہوئی تھی۔ اس عظیم ادبی روایت کو قائم کرنے کا سہرا حضرت سحبان الہند ہی کے سر ہے۔ ان ہی کے مساعی جمیلہ سے اس کی بنیاد پڑی۔ ان ہی نے اس سلسلہ کے پہلے مشاعرے منعقدہ ۱۹۵۲ء کی صدارت فرمائی تھی۔ انہی کی کوششوں سے پنڈت جواہر لال نہرو نے بطور خاص اس میں شرکت کی تھی۔ اس میں مولانا نے جو غزل پیش کی تھی اس کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

لوگ جب میت مری لے کر چلے — میرے ارماں نوحہ گر بن کر چلے
زندگی سے اپنی گھبرا کر چلے — گھر سے آئے تھے پلٹ کر گھر چلے
ایسے آنے سے نہ آنا خوب تھا — شام آئے شب سے پہلے گھر چلے
تیرے صدقے اے شہِ لطف و کرم — ہاتھ خالی آئے دامن بھر چلے
ساقیا ظاہر ہو یوں شانِ کرم — میکدے سے جو چلے پی کر چلے

مقصد اپنا ہو گیا پورا اسیر
مرنے آئے تھے کسی پر مر چلے

افسوس ہے مولانا نے یہ غزل خود نہیں پڑھی تھی بلکہ مشہور شاعر جناب بسمل شاہجہاں پوری سے پڑھوائی تھی۔ بسمل صاحب کی آواز بہت بلند اور پاٹ دار تھی اور بڑے والہانہ انداز میں شعر پڑھتے تھے۔

جناب انیس دہلوی نے مولانا سے متعلق ایک مضمون میں ان کی ایک مناجات بھی نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ ''شبِ قدر میں اس رات کی فضیلت کچھ اس طرح بیان کرتے کہ مغفرت کی دعا کرتے وقت لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے تھے''۔

مولانا کے پاس کوئی حساب تھا جس سے وہ رمضان میں شبِ قدر کا قیاس کرتے تھے اور رات کے پچھلے پہر اندھیرا کر کے بڑے جذباتی انداز میں دعا کرتے تھے اور اپنی لکھی ہوئی یہ مناجات بھی پڑھتے تھے۔

منتظر ہیں آنے کی آنکھیں ہماری دیر سے ——— آنے والے آ، یہ مجمع طالبِ دیدار ہے

جلوہ دکھلا کر تمنا پوری کر دے دید کی ——— اپنی چشم شوق پورے سال سے بیدار ہے

کچھ سنے تو عرض کر دیں دردِ دل کا مدعا ——— گرچہ قابو میں نہیں دل اور زباں بیکار ہے

سخت طوفاں ہے، ہوائیں ہیں خلاف ——— اس پہ آفت یہ کہ کشتی برسرِ منجدھار ہے

تنگ جینے سے ہوئے ہیں جینے والے اے کریم ——— زندگی سے اپنی ہر اِک باحیا بیزار ہے

بخشنے سے گر گناہوں کے تجھے کچھ عذر ہے ——— پھر بتا جائیں کہاں وہ کون سی سرکار ہے

پھیر جا، اپنی معافی کا قلم بس پھیر جا
کہنے والا کہہ گیا ہے تو مرا ستار ہے

ایک ٹوٹا ہوا تارا

مولانا احمد سعید مرحوم دہلوی

(شاہ محمد عثمان)

مولانا ان اہم شخصیتوں میں سے ہیں جن سے بہت سے دوسروں کی طرح میں نے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تو تہہ نہیں کیا لیکن ان کے مواعظ کثرت سے سنے اور ان کی کتابیں بھی پڑھیں۔ مولانا نے ۷۵ برس کی عمر میں ۱۹۵۹ء میں انتقال فرمایا۔ مولانا کے اسلاف عرب سے آ کر دہلی میں رہ رہے تھے۔ مولانا نے جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس میں حصہ لیا اور ۱۹۴۰ء تک اس کے ناظم رہے اور اس کو ایسے اہم مقام پر پہنچایا کہ مسلم لیگ کا طوفان بھی اس کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکا۔ وہ جنگ آزادی کے پیشواؤں میں تھے۔ ہندوستان کے علماء نے دینی تقاضہ سمجھ کر آزادی کی جنگ میں شرکت کی تھی۔ ان کی قربانیاں بھی اس میدان میں کسی سے کم نہ تھیں۔

مولانا ابتداء علم دین کے حصول کے بعد آریوں سے مناظرے کرتے رہے۔ اس کے بعد سیاسی میدان میں آئے، خلافت تحریک میں حصہ لیا، شدھی سنگھٹن کا مقابلہ کیا۔ فتنہ ارتداد کے استیصال میں، شاردا ایکٹ کی مخالفت میں، نہرو رپورٹ کے ہنگاموں میں ہر جگہ قائدانہ حصہ لیا۔

مولانا کے مواعظ عجیب وغریب قسم کے ہوتے تھے، کسی وعظ میں کوئی موضع نہیں چھوٹتا تھا۔ تفسیر بھی، حدیث بھی، فقہ بھی، منطق وفلسفہ وکلام بھی، تاریخ بھی، سیاست بھی، معاشیات بھی، ادب وشاعری بھی، لطائف وظرافت بھی، سماجی مطالعہ بھی اور بیان بھی۔ اس طرح کرتے کہ لوگ بے حس وحرکت سنتے، بقول عطاء اللہ شاہ بخاری ایسا معلوم ہوتا جیسے وحی اتر رہی ہے۔

مولانا نے جمعیۃ کی نظامت چھوڑی تو اس کے قائم مقام صدر ہوئے اور مولانا حسین احمدؒ

انتقال کے بعد جمعیۃ علماء کے صدر ہوئے۔ دہلی میں فساد پھوٹ پڑا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ساتھ فساد کو دبانے اور مسلمانوں کو بچانے میں دن رات ایک کر دیا۔ مولانا نے حکومت سے کوئی عہدہ نہیں لیا اور لکھنؤ کانگریس میں کہا کہ ''میں ہندوستان چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ جیوں گا اور یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ مروں گا۔ ہاں! جب سب مسلمان چلے جائیں گے تو میں آخری آدمی ہندوستان سے جاؤں گا''۔

مولانا سجادؒ سے بے حد قریبی دوستانہ تعلقات تھے اور ان کے انتقال پر مولانا احمد سعید نے اپنے شدید صدمہ اور غم کا اظہار کیا۔ مولانا سجادؒ کی حمایت اور تقویت کے لیے صوبہ بہار کے تقریباً ہر علاقہ میں پہنچے اور اپنی پر جوش تقریروں سے مسلمانوں کو آمادہ کیا کہ وہ امارت شرعیہ کا ساتھ دیں۔ مولانا سجادؒ نے انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی تو اس کے اجلاس کی صدارت مولانا احمد سعید صاحب نے کی۔

مولانا نے متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں ان کی کتابیں ''جنت کی کنجی'' اور ''دوزخ کا کھٹکا'' کافی مقبول ہو چکی ہیں۔ انھوں نے قرآن کا ترجمہ اور اس کا مفصل حاشیہ بھی لکھا۔ اگر مولانا یہ سب کتابیں نہ لکھتے تو ان کے مواعظ ہی کتابی شکل میں ان کی سنہری یادگار ہوتے، جو آج بھی جاندار ہیں اور ہمیشہ جاندار رہیں گے۔ ایک جگہ آپ نے مسلم لیگیوں کو مخاطب کر کے جو تقریر کی تھی اس کا ایک ٹکڑا نمونہ کے طور پر درج ذیل ہے:

> ''یوسف علیہ السلام کا سابقہ جس بادشاہ سے پڑا تھا وہ کافر تھا۔ آپ نے اس کافر بادشاہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ تو پہلے حکومت سے دستبردار ہو جا، تب میں آنے والے قحط کی روک تھام کروں گا بلکہ جب آپ نے قحط سے بچنے کی تدبیر بتائی تو بادشاہ نے کہا یوسف! یہ ساری تدبیریں کون کرے گا، کون اتنا ہوشیار اور دیانت دار ہے۔ تو اس کے جواب میں حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ یہ خدمت میرے سپرد کر دیجیے، میں اس کی دیکھ بھال کرلوں گا، میں اس کا پورا علم رکھتا ہوں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر حکومت کا نظام اسلامی طرز کا نہ بھی ہو اور کوئی

مسلمان دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ اس حکومت میں شریک ہو کر میں بندگانِ الٰہی کی صحیح خدمت انجام دے سکتا ہوں۔ اگر میں نے اس حکومت سے عدم تعاون کیا تو اس سے فائدہ کی جگہ بڑا نقصان ہوگا تو ایسی صورت میں غیر اسلامی حکومت کے ساتھ تعاون کرنا نہ صرف مباح ہوگا بلکہ ایک نبی کی سنت پر عمل ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس تعاون کے درست اور نادرست ہونے کا دارومدار خلوص نیت پر ہوگا اور ایسی صورت میں ہوگا کہ اس تعاون سے مسلمان اور اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو تعاون جائز نہیں ہوگا۔
جس طرح کافر کے ہر فعل کو کفر نہیں کہہ سکتے اسی طرح کافر حکومت کے ہر فعل کو غیر اسلامی نہیں کہہ سکتے۔ آخر اس آیت کا مطلب کیا ہوگا۔
''تعاونوا علی البر والتقویٰ'' (نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تعاون کرو) کیا ایک غیر مسلم نیکی کا کوئی کام نہیں کر سکتا، کیا کوئی غیر مسلم آگ بجھانے کے لیے تمہیں آواز دے گا تو اس کی امداد کرنے کے لیے تم کھڑے نہیں ہو جائے گے؟ آگ لگنے دو گے؟ خواہ سارا محلہ پھنک جائے؟''
ارے بھائی! اسلام تو عالمگیر صداقت ہے۔ ہر صورتحال کے لیے اس میں ہدایت موجود ہے۔ خالص اسلامی اقتدار کی کوشش سے کون روکتا ہے۔ یہ آرزو کس کے دل میں نہیں ہے کہ زمین کے ہر کونے میں اسلامی اقتدار قائم ہو، لیکن اس جمہوری دور میں اسلامی اقتدار قائم کرنے کی شکل زور زبردستی اور جہاد تو نہیں ہو سکتی اور نہ کبھی کسی دور میں ایسا ہوا ہے۔ یہی ہو سکتا ہے کہ اسلام کی صداقت کا سکہ عوام کے دلوں پر قائم کرو تا کہ وہ اسلام کی برکتوں کے قائل ہوں اور اسلامی قانون کو اپنے لیے وسیلۂ نجات سمجھنے لگیں اور خود مسلمان بھی اسلامی قانون کو نافذ

کرنے کے قابل ہوں جو معمولی بات نہیں ہے۔

ایسی صورت میں بھائی تم نے بھی غور کیا کہ اگر اسلامی قانون نافذ کرنے پر ملک میں رائے شماری کرائی جائے تو غیر مسلموں کو جانے دو، خود مسلمان بھی کتنے ہوں گے جو اسلامی قانون کے حق میں ووٹ دیں گے۔ اگر جوش میں آ کر ووٹ دے بھی دیے تو کتنے دن اس نظام کو چلنے دیں گے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ پہلے مسلمانوں کی انفرادی زندگی ٹھیک کرو اور ایک دو مسلم ملکوں میں اسلامی قانون نافذ کر کے ساری دنیا کو اس خیر و برکت کا مشاہدہ کراؤ۔ تب ہندوستان جیسے ملک میں ایسے نعرے لگاؤ۔''

مولانا کی یہ تقریریں اگر مسلمان غور سے سنتے تو ان کی حالت بدل جاتی لیکن افسوس انھوں نے توجہ نہیں کی۔ مولانا سے میری ملاقاتیں گیا، کلکتہ اور دہلی میں رہیں۔ میں نے ان میں سمجھنے اور سمجھانے دونوں کی صلاحیتیں پائیں لیکن جنھوں نے کانوں میں اُنگلیاں ڈالیں اور اپنی آنکھیں بند کرلیں وہ نہ بجلی کا کڑکا سن سکتے تھے، نہ سورج کی روشنی دیکھ سکتے تھے۔ بہرحال مولانا نے اور ان کے رفقاء نے اپنا فرض ادا کر دیا اور وہ عنداللہ انشاءاللہ ماجور ہوں گے۔

حضرت مولانا احمد سعید صاحب

نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے قیام کے بعد جن علمائے کرام نے اس کو روز اوّل سے ہی اپنایا، ان میں حضرت مولانا احمد سعید کا نام نامی شامل ہے۔ اس کے یوم تاسیس سے مولانا ۱۹۴۰ء تک مستقل ناظم عمومی رہے۔ صدر حضرت مفتی کفایت اللہ تھے۔ ان حضرات کی کوششوں سے جمعیۃ علمائے ہند نہ صرف ہندوستان اور برما میں بلکہ پوری عالم اسلام میں روشناس ہوگئی۔

مولانا احمد سعید دلی کے رہنے والے تھے کشمیر نژاد تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد کو مغل دربار میں رسوخ حاصل تھا اور اس خاندان کے بزرگوں کو خواجہ محل زادہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مولانا احمد سعید نے ابتدا میں قرآن شریف حفظ کیا اور ٹیا محل کے مدرسے میں قرآن پاک حفظ مکمل کیا ۱۳۲۸ھ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں داخل ہوئے اور ۱۳۳۶ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

مولانا احمد سعید صاحب کے والد بزرگوار کا اسم گرامی حافظ نواب مرزا تھا جو زینت المساجد میں امام تھے اور مکتب میں بھی پڑھاتے تھے۔ مولانا احمد سعید کے بچپن میں اگرچہ تعلیم پر پوری توجہ نہ دی جاسکتی تھی مگر جودتِ طبع سے واعظوں اور تقریر کرنے والوں کی تقریر اور بیان سننے کا بے حد شوق تھا۔ چنانچہ اسی شوق کے تحت انہوں نے تقریر کرنے میں بھی دلچسپی لینی شروع کردی اور یہ فن پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ ۲۲ برس کی عمر ہوگی کہ ۱۹۱۰ء میں مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم کی نظر ان پر پڑی اور انہوں نے اپنی نگرانی میں ان کی تعلیم کا سلسلہ قائم کیا۔ چنانچہ مولانا احمد سعید فارغ التحصیل ہوگئے اور اصحاب علم کی طرح مذہبی مناظروں میں حصہ لینے لگے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب ان کے معاون ہوا کرتے تھے۔ تقریر کے میدان میں بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کرسکتے تھے۔ سرگرم سیاست میں حصہ لیا۔ یہ وہ دور تھا جب کہ عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی۔ آپ نے اس تحریک میں حصہ لیا اور پہلی بار گرفتار ہوکر جیل میں رہے۔ وہ اپنی

زندگی میں آٹھ بار جیل گئے اور زندگی کے پندرہ برس جیل میں گزارے۔ زیادہ تر ملتان، گجرات اور میانوالی کی جیلوں میں ہی رہے۔

جمعیۃ علمائے ہند کے قیام کے بعد ملک میں سیاسی تحریکات نے زور پکڑا۔ رولٹ بل کے خلاف تحریک خلافت کے واسطے سے بہت شور و غوغا ہوا۔ مسلمانوں نے جمعیۃ علمائے ہند کی قیادت میں تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ ہندو مسلمانوں کا اتحاد اس وقت نقطۂ عروج پر تھا۔ جمعیۃ علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے عوام بے دھڑک جیل جا رہے تھے۔ مولانا احمد سعید صاحب ان تحریکات کے سلسلے میں سب سے پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں گرفتار ہو کر میاں والی جیل رہے۔ ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۲ء کو رہائی ہوئی۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک میں اور پھر ۱۹۳۲ء کی تحریک میں حضرت مفتی مولانا کفایت اللہ کے ساتھ گجرات جیل میں اور پھر ملتان جیل میں رہے۔

جمعیۃ علمائے ہند کے قیام و تنظیم و ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔ صبح کی نماز کے بعد کسی نہ کسی مسجد میں قرآن کریم کا ترجمہ فرماتے اور زیادہ تر وقت جمعیۃ علمائے ہند کے کاموں میں مصروف رہتے۔ جس دور میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے وعظ سننے کے لیے لوگ بے چین رہتے تھے، اس دور میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب بھی ایک مقبول ترین واعظ بن گئے تھے۔ آپ کو دلی کی ٹکسالی زبان پر عبور تھا اور سادہ اور بامحاورہ زبان میں اپنی تقریر کو بے حد دلکش اور دل پذیر بنا دیتے تھے۔ اسی لیے آپ کو اصحاب علم نے سحبان الہند کے لقب سے یاد کیا۔ ایک انفرادی شان یہ تھی کہ وعظ و تقریر میں جو کچھ بیان فرماتے تھے تقریر کے بعد وہ پورا بیان تحریر فرمایا کرتے تھے۔ ایک دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وعظ میں قرآن مجید کی کوئی ایک آیت پڑھتے تو شروع سے آخر تک اُسی مفہوم و مطلب کی آیات پڑھتے اور اسی پر بیان ختم فرما دیتے۔

۱۹۴۰ء میں جونپور (اتر پردیش) میں جمعیۃ علمائے ہند کا جو سالانہ اجلاس عام ہوا اس کی مجلس استقبالیہ کے سربراہ جناب مولانا علی اعلیٰ صاحب رکن جماعت اہل حدیث تھے۔ یہ مولانا احمد سعید کے دوستوں میں بھی تھے۔ اجلاس ختم ہو جانے کے بعد اجلاس کے بل پورے

ادا نہیں ہو سکے تھے۔ باقی رہ گئے بلوں کے بارے میں مولانا علی اعلیٰ نے حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی توجہ مبذول کرائی۔ اس وقت جمعیۃ علمائے ہند کے فنڈ میں کمی چل رہی تھی۔ مولانا احمد سعید صاحب نے اپنی اہلیہ کے زیورات کی ایک دو چیزیں ضمانت رکھ کر استقبالیہ کے بل ادا کرائے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں پر جو مصیبتیں ٹوٹیں، خاص کر دلی اور پنجاب کے مسلمانوں کو تباہی، بربادی اور قتل و غارت گری کا جو عذاب سہنا پڑا اس خطرناک دور میں آپ نے اپنے رفقائے کار کے ساتھ جان ہتھیلی پر رکھ کر مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا اور دلی میں مسلمانوں کے قدم جمانے میں اہم رول ادا کیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ان فسادات کی روک تھام کے سلسلے میں مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن، حافظ عزیز حسن بقائی اور سید محمد جعفری صاحب کا وفد روزانہ مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی کے پاس جایا کرتا تھا جو تینوں کو بتایا کرتا تھا کہ مسلمانوں پر کل کیا گزری۔ ایک دن گاندھی جی مسلمانوں کے پاس تشریف لائے، کونے کونے کے مسلمان سمٹ کر مولانا احمد سعید کے علاقے میں جمع ہو چکے تھے۔ دلی کے اور محلے مسلمانوں سے تقریباً خالی ہو چکے تھے۔ مہاتما گاندھی کا جلسہ مسٹر آصف علی والے مکان کوچہ چیلان میں منعقد کیا گیا۔ مولانا احمد سعید صاحب نے تقریر کرنی شروع کی اور دو چار لفظ ہی بول پائے تھے کہ لفظوں کی جگہ آنسو بہنے لگے۔ مولانا تقریر نہ کر سکے اور مولانا حفظ الرحمٰن نے تقریر کی۔ مولانا روزانہ مہاتما گاندھی سے شکایت کرتے، وزیر داخلہ سردار پٹیل کی ناراضگی بھی مول لی مگر آپ نے کلمہ حق کہنے سے بھی کبھی گریز نہیں کیا۔ حکومت خود فساد کرانے والوں کے نرغے میں تھی۔ تقسیم وطن کے نتیجے میں خوف و ہراس اور دل شکستگی کا دور دورہ تھا۔ امن کمیٹی کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ ٹاؤن ہال جو امن کمیٹی کا مرکز تھا اس کے چاروں طرف روزانہ ہی لاوارث لاشیں ملتی تھیں۔ ہندو دوستوں نے از راہِ ہمدردی بار بار اشارہ دیا کہ مسلمانوں کو لے کر اوکھلا منتقل ہوا جائے جہاں ان کی حفاظت اور آسایش کا پورا پورا انتظام کر دینے کا وعدہ بھی کیا گیا۔ انھوں نے اپنی بے بسی یہاں تک ظاہر کی کہ وہ اس بحرانی دور میں اپنے قوم پرور مسلمانوں کی

حفاظت کرنے سے قاصر ہیں اور شرمساری کے داغ سے بچنا چاہتے ہیں۔ اس لیے خدارا آپ کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ مگر ان حضرات نے یہ پیش کش ٹھکرا دی اور خود کو عوام سے الگ نہیں ہونے دیا۔

مولانا احمد سعید صاحب چونکہ تقریریں بہت کرتے تھے اور اس دور میں چونکہ لاؤڈ اسپیکر نہیں آیا تھا۔ اس لیے زور لگا کر اپنی بات سامعین تک پہنچانی ہوتی تھی، اس لیے آپ کو عہد جوانی میں مرض سل لاحق ہو گیا تھا ڈاکٹروں نے آپ کو تقریر کرنے سے منع کیا مگر عوام کے اصرار پر وہ تقریریں کرتے ہی رہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد سے آپ کو کمزوری نے گھیر لیا تھا۔

۴؍دسمبر ۱۹۵۹ء مطابق ۳؍جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ بروز جمعہ بعد مغرب حرکت قلب بند ہو گئی اور وہ بلبل ہزار داستان سات بج کر دس منٹ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اگلے روز جنازہ مہرولی لے جایا گیا اور حضرت مفتی کفایت اللہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

(ماخوذ ہفت روزہ الجمعیۃ۔ نئی دہلی (یادگار مجلہ) ۱۳؍مئی ۲۰۰۰ء، ص ۱۶-۱۱۴)

مولانا احمد سعید دہلوی

(عبدالمجید سالک)

۱۹۲۲ء کے اواخر میں جب میں مدیر زمیندار کی حیثیت سے تحریک خلافت میں سزایاب ہو کر میانوالی جیل میں پہنچا تو چند ہی روز میں معلوم ہو گیا کہ مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلمائے ہند بھی اسی جیل کے کسی دوسرے حصے میں موجود ہیں۔ وارڈوں سے کرید کرید کر جو پوچھا تو انکشاف ہوا کہ مولانا قیدیوں کے لباس میں ہیں اور مونج بٹنے کی مشقت کر رہے ہیں۔ یہ سن کر بہت صدمہ ہوا۔ جب دوسرے دن شام کو ڈاکٹر راجمیداس سپرنٹنڈنٹ جیل دریافت حال کے لیے ہمارے وارڈ میں آئے تو میں نے اور اختر علی خاں نے ان سے کہا کہ مولانا احمد سعید دہلوی ہمارے نہایت ہی محترم عالم دین بلکہ ہندوستان بھر کی جمعیت علماء کے سیکرٹری ہیں اور مسلمانوں میں جمعیۃ علماء کانگرس اور مجلس خلافت سے کہیں زیادہ اثر ونفوذ رکھتی ہے۔ ایسی شخصیت کو عام قیدیوں کی طرح رکھنا کسی اعتبار سے قرین انصاف نہیں۔ ہم درجۂ خاص کے قیدی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی آسائشیں میسر ہیں لیکن ہم میں سے ہر شخص اس امر پر آمادہ ہے کہ اس کو درجہ خاص کی رعایات سے محروم کر کے مولانا کو اس کی جگہ اس درجے میں شامل کر دیا جائے۔ ڈاکٹر راجمیداس نے کہا کہ حکومت کی طرف سے مولانا کے متعلق کوئی ہدایات موصول نہیں ہوئیں۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ مولانا کو بھی اسپیشل کلاس دے دی جائے۔

مولانا کا ورود:

چند روز بعد مولانا احمد سعید ہمارے وارڈ میں تشریف لائے اور مجھے پہلی دفعہ اسی دن نیاز حاصل ہوا۔ عام قیدیوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھے، لشاش بشرہ، چھدری سی داڑھی، توند کسی قدر نکلی ہوئی۔ بلند قامت، آنکھوں میں شفقت اور شوخی کا عجب سا امتزاج۔ بات بات پر قہقہے لگاتے اور جیل کے لطیفے سنا کر ہمیں ہنساتے رہے۔ معلوم ہوا کہ مولانا کو اسپیشل کلاس مل گئی ہے اور وہ مستقل طور پر ہمارے وارڈ میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ بے حد خوشی ہوئی مولانا نے غسل

کر کے اپنا اصلی لباس پہنا۔ سر پر دہلی دال کڑھی ہوئی ٹوپی۔ شیروانی اور آڑا پاجامہ چونکہ وہ ہم سب میں بزرگ اور واجب الاحترام تھے اور ان کی شخصیت میں جاذبیت بدرجہ اتم تھی۔ اس لیے ہم دن بھر انہی کے گرد جمع رہتے تھے۔

درس و تدریس:

کچھ مدت کے بعد جب میانوالی جیل میں قیدیوں کی ایک اور بڑی کھیپ آن پہنچی تو ہم لوگ ایک چھوٹے وارڈ میں منتقل کر دیے گئے جو معمولاً قید محض کے اسیروں اور کم عمر قیدیوں کے لیے مخصوص تھا لیکن اب بلا امتیاز سالک، سیماب، اختر علی خاں، صوفی اقبال، مولوی نقاء اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا داؤد غزنوی، عبدالعزیز انصاری، سید عطاء اللہ شاہ وغیرہ اسی وارڈ میں یکجا کر دیے گئے اور یہاں ہماری زندگی کا ایک خاص انداز شروع ہوا۔ میں نے اور عبدالعزیز انصاری نے مولانا احمد سعید سے عربی، صرف ونحو، ادب اور منطق کا سبق لینا شروع کیا۔ ایک آدھ گھنٹہ پڑھ لیتے۔ پھر ایک دو گھنٹے آموختہ دہراتے اور اُردو سے عربی میں ترجمہ کر کے مولانا کو دکھاتے۔ مولانا کا انداز تدریس اگرچہ وہی اساتذۂ قدیم کا سا تھا لیکن وہ اس میں خاص دلآویزی پیدا کر دیتے تھے جس میں بیزاری و ناگواری کا شائبہ بھی نہ ہوتا تھا اور ہم بے تکان کتابیں پڑھتے چلے جاتے تھے۔

اِک بارہ ہے کہ دوبارہ:

جیل کی دنیا عجیب دنیا ہے۔ وہاں قدیوں کو بیرونی دنیا کے واقعات و حوادث کا بہت کم علم ہوتا ہے۔ خصوصاً عام اخلاقی قیدی تو اپنی جہالت کی وجہ سے بالکل ہی بے خبر ہوتے ہیں۔ قیدیوں کی دو قسمیں ہیں۔ ''اکبارہ'' اور ''دوبارہ'' جن کو انگریزی میں (Casual) اور (Habitual) کہتے ہیں۔ اکبارہ وہ قیدی ہے جس کو پہلی مرتبہ جیل میں آنے کا اتفاق ہوا ہو۔ ''دوبارہ'' وہ جو عادی مجرم ہو اور ایک سے زیادہ بار قید ہو چکا ہو۔ مولانا نے لطیفہ سنایا کہ جب میں نیا نیا میانوالی جیل میں آیا تو ایک پرانے اور طویل المیعاد قیدی نے مجھے نماز و تلاوت میں مصروف دیکھ کر سمجھ لیا کہ مولوی ہوں۔ ایک دن اس نے پوچھا ''مولبی جی! تم نے کیا جرم

کیا تھا کہ بندھ گئے؟'' میں نے کہا بھئی ہم تو تحریک خلافت میں سزایاب ہو کر آئے ہیں۔ قیدی کچھ نہ سمجھا۔ پھر میں نے اس کو ترک موالات، عدم تعاون، نان ورتن اور خدا جانے کس کس لفظ اور اصطلاح کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی۔ نتیجہ صفر۔ میں نے پوچھا'' گاندھی کو جانتے ہو؟'' کہنے لگا ہاں۔ ہمارے گاؤں میں ایک گاندھی ہے جو شادی بیاہ کے موقعہ پر عطر لگایا کرتا ہے (یعنی گندھی) آخر میں نے عاجز آ کر کہا'' خلیفۃ المسلمین کو جانتے ہو؟'' قیدی نے کچھ دیر سوچ کر پوچھا کہ وہ اکبارہ ہے کہ دوبارہ؟ میں بے اختیار ہنس دیا اور تفہیم کی کوشش سے دست بردار ہو گیا۔

شیخ مجلس:

مولانا احمد سعید ایک عالی پایہ عالم دین اور شیوا بیان خطیب ہونے کے باوجود یبوستِ طبع اور تعبس سے بالکل خالی تھے اور ہم نوجوانوں میں بیٹھ کر دن بھر لطیفہ بازی کیا کرتے تھے بلکہ جب ہم لوگ رات کو وقت گزاری اور تفریح کے لیے قوالی کرتے تو مولانا اس میں شیخ مجلس کی حیثیت سے متمکن ہوتے اور مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری بعض اوقات'' حال کھیلتے کھیلتے'' مولانا کی توند پر جا پڑتے۔ مولانا ہنستے بھی جاتے اور برا بھلا بھی کہتے جاتے۔ ایک دفعہ ہم نے مولانا کو ایک گیت سنانے پر بھی مجبور کر لیا۔ مولانا نے بہت مزے لے کر گیت گایا۔ وہ گیت کیا تھا۔ کسی وقت تخلیہ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے سن لیجیے۔ انہیں ضرور یاد ہوگا۔

ڈاڑھی کا مسئلہ اور علمائے مصر:

مولانا سے اکثر دینی مسائل پر مذاکرات بھی ہوتے اور وہ اپنے علم و فضل اور بیان کے سلجھاؤ کی وجہ سے دقیق سے دقیق چیز کو بآسانی سننے والوں کے ذہن نشین کر دیتے۔ ایک دفعہ ڈاڑھی کے مسئلے پر بات چیت ہوئی۔ مولانا نے اپنا مسلک واضح کیا اور حدیث رسول'' قصوا الشوارب واعفوا اللحی'' کو دلیل پیش کیا لیکن اس کے ساتھ ہی فرمانے لگے کہ دنیائے اسلام کے دوسرے ملکوں کے علماء اس معاملے میں اتنے شدید و متشدد نہیں ہیں جتنے ہمارے علماء ہیں۔ پھر فرمایا میں چند ماہ پیشتر مصر گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ نماز کے لیے

ایک مسجد میں گیا۔ ابھی وضو ہی کیا تھا کہ محسوس کیا بعض لوگ بڑے غور سے مجھے گھور رہے ہیں۔ سوچا کہ غیر ملکی ہوں اس لیے دیکھ رہے ہوں گے لیکن ایک دومنٹ کے بعد ہی ایک پوچھ بیٹھا أنت یهودی؟ میں نے جواب دیا لا واللہ انا مسلم الحمدللہ۔ پھر اس نے کہا کہ تمہاری پھیلی ہوئی اور غیر مرتب ڈاڑھی بالکل یہودیوں کی سی ہے۔ یہ درست نہیں۔ من تشبه بقومٍ فهو منهم قرآن مجید کہتا ہے کہ جو شخص کسی قوم سے تشبہ پیدا کرتا ہے وہ اسی قوم میں سے ہے۔ میں یہ سن کر بے حد پریشان ہوا کہ ہم تو ہندوستان میں ڈاڑھی منڈانے والوں کو یہ آیت (قول) سنایا کرتے ہیں۔ یہاں اُلٹا یہی آیت ہماری ڈاڑھیوں پر منطبق کی جارہی ہے۔

نماز پڑھنے کے بعد میں سیدھا جامعہ ازہر چلا گیا کیونکہ حضرت شیخ الازہر سے ملاقات کا وقت مقرر ہو چکا تھا۔ جامعہ کے اندر جا کر جس کمرے میں جھانکتا ہوں یہی نظر آتا ہے کہ ایک فرنچ کٹ یا خشخشی ڈاڑھی والے معلم طلبہ کے سامنے کھڑے ہیں اور حدیث بخاری پر لکچر دے رہے ہیں۔ ایک قریب قریب ڈاڑھی منڈا آدمی فقہ حنفیہ کے غوامض ونکات نہایت فصیح وبلیغ عربی میں بیان کر رہا ہے۔ خیر جب میں رہبر کی مدد سے حضرت شیخ الازہر کے فیشن ایبل ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ان کے چہرے پر میں نے پوری ڈاڑھی دیکھی۔ علیک سلیک کے بعد پہلے تو مسئلہ خلافت اور سیاست عالم اسلامی پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد میں نے پوچھا حضرت ڈاڑھی کے متعلق آپ لوگوں کا مسلک کیا ہے۔ میں نے تو یہاں آکر دیکھا کہ رسول اللہ کی اس سنت پر بہت ہی کم عمل ہوتا ہے اور خود علماء بھی اس کے تارک ہیں۔

واجب نہیں مستحب:

شیخ الازہر مسکرائے اور کہا ہندوستان میں لوگ اس قسم کے غیر اہم مسائل پر تضیع اوقات کیا کرتے ہیں۔ حال آں کہ اوضاع ظاہری کا معاملہ امور شرعیہ میں شامل نہیں ہے۔ میں نے گزارش کی کہ آپ بھی تو فقہ حنفی پر عامل ہیں۔ اصول فقہ میں ہے۔ الامر للوجوب خدا اور رسول نے جن امور کے متعلق حکم دیا ہے اس کی تعمیل واجب ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ ہر کلیہ کا استثنا ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اوضاع ظاہری میں یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ ہم اس کو استحباب کا درجہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان بہ نیت اتباع رسولؐ ڈاڑھی رکھتا ہے تو اس کو یقیناً ثواب ہوگا۔

اگر منڈاتا یا ترشواتا ہے تو اس پر کوئی عذاب نہ ہوگا۔ میں خود حکم رسولؐ کی تعمیل میں ڈاڑھی رکھتا ہوں اور ثواب کا متوقع ہوں۔ میرے رفقاء نہیں رکھتے میں انہیں نہ گمراہ سمجھتا ہوں نہ مستوجب عذاب خیال کرتا ہوں۔

جیل میں پان:

مولانا احمد سعید دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی مدرسے کے رئیس اعلیٰ کی یہ بحث سن کر خاموش ہوگئے اور سلام و دعا کے بعد واپس چلے آئے۔

مولانا احمد سعید پان کھانے کے عادی تھے لیکن جیل میں پان کہاں! قریب قریب ہر درجہ خاص کے قیدی کو اس کے اعزہ باہر سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھیج دیا کرتے تھے۔ ایک دو دفعہ دہلی سے مولانا کی چیزوں میں ایک تھیلا گٹکے کا بھی آیا (پان بنا کر اور چھالیا اور زردہ شامل کر کے سکھا لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کو تھیلے میں بند کر رکھتے ہیں۔ یہ گٹکا کہلاتا ہے) جس کی ایک آدھ چٹکی کھانے کے بعد مجھے بھی مل جایا کرتی تھی اور پان کھانے کی طلب کسی حد تک پوری ہو جاتی تھی۔

طباخی میں کمال:

دہلی کے مولانا عبداللہ چوڑی والے بھی ہمارے ہی وارڈ میں آ گئے تھے اور ہمارے باورچی خانے کے انچارج تھے لیکن ان کے آنے سے پہلے پختِ طعام کی نگرانی ہم نے مولانا احمد سعید کو سپرد کر رکھی تھی۔ کیونکہ وہ اس معاملے میں بڑے ماہر تھے اور ہمیشہ اپنے کمالاتِ طباخی کا ثبوت دیتے رہتے تھے۔ وہ ہم سب سے پہلے اپنی ایک سالہ میعاد قید ختم کر کے رہا ہو گئے۔ ہماری مجلس شیخ مجلس کے جانے کے بعد سونی ہوگئی اور میری اور عبدالعزیز انصاری کی تعلیم عربی بھی ادھوری رہ گئی۔

دلکش خطابت:

عام گفتگو میں مولانا کا انداز بیان نہایت ہی دلکش معصومانہ اور خندہ آور تھا اور انکے پاس بیٹھنے والے گھنٹوں ان کی باتیں سنتے اور اکتاہٹ کے بجائے دم بدم دلچسپی میں اضافہ ہی ہوتا

چلا جاتا۔ یہی حالت خطابت و تقریر کی تھی۔ مولانا نہایت ٹھیٹھ دہلوی روزمرے میں جس میں کرخنداروں کے مخصوص محاورات کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ گھنٹوں تقریر فرماتے اور ہزارہا کا مجمع نقش بہ دیوار ہو کر ان کے ارشادات سنتا رہتا۔ جہاں کہیں ان کے وعظ کا اعلان ہوتا خلقت ہر طرف سے ٹوٹ پڑتی۔ میں عمر بھر بہت ہی کم جلسوں میں شامل ہوا ہوں لیکن جس زمانے میں اہل بدعت نے سلطان ابن سعود کے خلاف ملک میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اور یہ الزام عاید کیا تھا کہ وہابی سپاہیوں نے روضہ اطہر پر گولیاں چلائی ہیں۔ اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے مولانا محمد علی اور مولانا احمد سعید دہلی سے لاہور تشریف لائے تو میں صرف مولانا احمد سعید کی تقریر سننے کے لیے باغ بیرون دہلی دروازے کے عظیم الشان جلسے میں شامل ہوا اور مولانا کی شیوا بیانی کی یاد اب تک اپنے دماغ میں محفوظ پاتا ہوں۔

تصانیف:

مولانا کے کمالات صرف تقریر تک محدود نہیں ہیں بلکہ آپ نے متعدد سلیس و مفید کتابیں بھی لکھی ہیں۔ دوزخ کا کھٹکا، جنت کی کنجی، رسول کی باتیں، مضامین احمد سعید، تقاریر احمد سعید، شوکت آرا بیگم اور متعدد دیگر رسائل جو چھپ کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ اگر چہ مولانا کی عمر اسّی کے قریب ہو چکی ہے لیکن تصنیف و تالیف کا مشغلہ برابر جاری ہے۔ آج کل ''عام فہم اُردو'' میں تفسیر قرآن لکھ رہے ہیں۔ جس کی چند سورتیں شائع ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تکمیل کی مہلت عطا فرمائے۔

آپ نے تقسیم کے انتہائی ابتلا و آزمائش کے کوائف کے باوجود دہلی ہی میں مقیم رہنا پسند فرمایا اور وہیں مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ہوئے۔ مجھے تقسیم کے بعد دو دفعہ دہلی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ دونوں موقعوں پر میں حصول نیاز کے لیے حاضر خدمت ہوا۔ حسب عادت نہایت محبت اور بے تکلفی سے پیش آئے۔ پہلی دفعہ پنڈت رام ناتھ (سابق منیجر انقلاب) ساتھ تھے۔ دوسری بار پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی معیت میں حاضر ہوا۔ کہن سالی کے باوجود مولانا کی صحت بہت اچھی ہے۔ چہرے پر بدستور سرخی اور بشاشت کا نور نمایاں ہے۔

مولانا احمد سعید

(ضیاءالدین احمد برنی)

مولوی احمد سعید میرے بچپن کے دوست تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی ایک مزدور کی طرح بسر ہوئی۔ وہ زینت المساجد کے ایک دالان میں تارکشی کیا کرتے تھے۔ یہ اس صدی کے پہلے عشرے کی بات ہے۔ اس کے بعد ان کی زندگی نے پلٹا کھایا اور وہ مدرسۂ امینیہ میں داخل ہو گئے جہاں وہ ذاتی محنت سے تھوڑے ہی عرصہ میں مذہبی علوم میں منتہی ہو گئے۔ پھر تو وہ اتنے مشہور ہوئے کہ ان کی سی شہرت بہت کم مولویوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔

اُن دنوں دہلی میں ''خلاق المعانی مولوی محمد راسخ'' ایک شیریں مقال اور فصیح البیان واعظ تھے جو اُردو بازار والی مسجد میں جمعہ کے جمعہ وعظ فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ وہ دلکش خطیب تھے اور ان کے مواعظ میں تصوف اور شاعری کی چاشنی بھی ہوتی تھی اس لیے لوگ دور دور سے کھچے چلے آتے تھے۔ جب ۱۹۰۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا تو شہر والوں کی نظر انتخاب مولوی صاحب پر پڑی اور انہوں نے مولانا راسخ کی مسند پر بیٹھنا منظور کر لیا۔ ان کی فصاحت و بلاغت کے پیش نظر لوگوں نے انہیں ''سحبان الہند'' کا خطاب دیا تھا۔ دہلی والے یہ دیکھ کر خوش تھے کہ راسخ صاحب کا جانشین پیدا ہو گیا ہے۔

مدتوں وہ جمعیت العلماء کے سیکرٹری رہے۔ صدر مفتی کفایت اللہ تھے۔ صدر اور سیکرٹری میں جو باہمی اتحاد میں نے دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آئے گا۔ وہ دو قالب اور ایک جان تھے۔ مفتی صاحب سے انہیں اس قدر محبت تھی کہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں مفتی صاحب کی قبر کے بائیں جانب اپنی آخری آرام گاہ تیار کرا لی تھی۔ اگر وہ اپنی جگہ متعین نہ کر گئے ہوتے تو انہیں مولانا آزاد کے پہلو میں دفن کیا جاتا۔

۱۹۳۱ء میں جب گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے اس وقت مفتی کفایت اللہ اور مولوی احمد سعید ان سے ملنے کے لیے بمبئی تشریف لائے اور مذہب، زبان

اور ثقافت کی حفاظت کے سلسلہ میں انہوں نے ان کے سامنے مسلمانوں کے اقل مطالبات پیش کر دیے اور گاندھی جی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کے بغیر مسلمانوں کو کوئی دستور قابل قبول نہ ہوگا۔ اس وقت ملک کی تقسیم کا سوال ہی نہ اٹھا تھا بلکہ ہر مطالبہ متحدہ ہندوستان کے نظریہ کی بنا پر کیا جا رہا تھا۔

مولوی صاحب اپنی خطابت اور لسانی کے لیے سارے ہندوستان میں مشہور تھے۔ ان کی تقریر اس قدر لچھے دار ہوتی تھی کہ سننے والے عش عش کرتے تھے۔ وہ قصہ میں قصہ بیان کرنے کے عادی تھی اور پھر اپنی تقریر کو اس طرح سے مربوط کرتے اور سمیٹتے چلے جاتے تھے کہ سننے والے دم بخود رہ جاتے تھے۔ چونکہ وہ دہلی کے روڑے تھے اس لیے ان کی زبان بے حد شیریں، شستہ اور سلیس تھی۔ ان کی شان کا دوسرا خطیب میں نے نہیں دیکھا۔ وہ پنجاب کے مشہور خطیب عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولوی ثناء اللہ امرتسری کی طرح گھنٹوں بول سکتے تھے۔ ان میں غضب کی آمد تھی۔

گاندھی جی کی کوئی تحریک چل رہی تھی کہ مولوی احمد سعید بمبئی آئے اور ڈاکٹر گور کے یہاں ٹھہرے جو مولوی عبدالقادر قصوری کے ہاتھ پر ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ رات کو کسی وعظ سے دو بجے کے قریب گھر لوٹ رہے تھے کہ راستہ میں ان پر چند موالیوں (غنڈوں) نے حملہ کر دیا۔ شروع شروع میں انہی کو تاک کر نشانہ بنایا گیا مگر دوسرے ساتھیوں نے جن میں ڈاکٹر صاحب کے برادر نسبتی ڈاکٹر شکری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں انہیں آڑ میں لے لیا۔ وہ خود ڈنڈے کھاتے رہے مگر مولوی صاحب کو بچاتے رہے۔ اگر وہ اس طرح سے نہ بچا لیے جاتے تو شاید مخالفین ان کا دم ہی نکال دیتے۔ اس واقعہ کے دوسرے دن میں ان کی خدمت میں پہنچا۔ فرمانے لگے کہ "اتنا یاد رہے کہ مجھ پر یہ حملہ آپ کے شہر میں کیا گیا ہے"۔ چونکہ مجھے پولیس سے واقعات کا علم ہو چکا تھا اور حملہ آوروں کے نام بھی معلوم ہو گئے تھے اس لیے میں نے سازش کا پورا حال کہہ سنایا۔ وہ یہ معلوم کر کے خوش ہوئے کہ عوام کا اس حملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ حملہ حکومت کے مخصوص گرگوں کے ذریعہ کرایا گیا تھا تا کہ قوم پرست مسلمان ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس

منعقدہ بمبئی میں پیش آیا تھا جب کہ پولیس کمشنر (ایس ایم ایڈورڈز) نے اپنے مخصوص آدمیوں کے ذریعے پنڈال میں زبردست ہنگامہ کرایا تھا، جس کے نتیجہ میں بقیہ اجلاس پنڈال کی بجائے تاج محل ہوٹل میں منعقد ہوئے۔ حملہ آور بعد کو مولوی صاحب کی خدمت میں اظہار معذرت کے لیے پہنچے تھے اور انہوں نے انتہائی فراخدلی سے ان کا قصور معاف بھی کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ جب پولیس ان کا بیان لینے کے لیے پہنچی تو انہوں نے بیان دینے سے صاف انکار کر دیا۔

مولوی صاحب نے ۱۲ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ ہر سال کسی نہ کسی مسجد میں ختم قرآن کرتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۵۸ء تک قرآن مجید سنایا۔ وہ نہایت خوش الحان قاری تھے۔ یوں تو دنیا میں ہزاروں حافظ قرآن ہیں لیکن ان میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ فوراً بتا سکتے تھے کہ فلاں آیت فلاں پارے کے فلاں رکوع میں ہے۔ قرآن میں انھیں پوری طرح عبور تھا۔

مولوی صاحب کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وفات سے پیشتر انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ مع تفسیر مکمل کر لیا تھا۔ وہ ابھی منظر عام پر نہیں آیا لیکن چونکہ وہ متعدد خصوصیات کا حامل ہے اس لیے یقین ہے کہ وہ قبولیت عامہ حاصل کر لے گا۔ انہوں نے یہ ترجمہ اور تفسیر تن تنہا تیار کی تھی۔ اسے ان کی زندگی کا شاہکار سمجھنا چاہیے۔

اپنی ابتدائی زندگی میں مولوی صاحب لال کوئیں، فوارہ اور ملکہ کے باغ میں مذہبی مناظرے کیا کرتے تھے۔ جیت ہمیشہ انہی کی ہوتی تھی اس لیے کہ وہ اپنی حاضر جوابیوں سے اپنے مخالفین کو چپ کرا دیا کرتے تھے۔ ان کے زمانہ میں آریا سماجی رام چندر اور پادری احمد مسیح کا بہت زور تھا، مگر ان دونوں پر مولوی صاحب کی علمیت، لسانی اور حاضر جوابی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا:

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول

سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

ان کی سیاسی زندگی تحریک خلافت سے شروع ہوئی جو جمعیۃ العلماء کے اشتراک عمل کی

وجہ سے بہت جلد ہمہ گیر بن گئی۔ کانگریس کی کوئی تحریک ایسی نہ تھی جس میں وہ شامل نہ ہوئے ہوں۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا یہ فرمانا صداقت پر مبنی ہے کہ ''مولوی احمد سعید تمام تحریکات ملت و وطن کے بانیوں میں سے تھے اور تاریخ کے اس پورے سفر میں وہ اپنا اہم پارٹ ادا کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے۔

وہ آخر وقت تک کانگریس سے وابستہ رہے۔ وہ تقسیم ملک کے خلاف تھے اس بنا پر کہ وہ سارے ہندوستان پر مسلمانوں کا حق سمجھتے تھے اور ملک کے صرف ایک حصہ پر قانع رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملک تقسیم ہو گیا تو وہ ہندوستان ہی میں جمے رہے۔ ان کے وہاں سے نہ ہٹنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کو بے سہارا چھوڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس تخیل کے ماتحت انہوں نے تقسیم کے بعد جان کی بازی لگا کر ہندوستانی مسلمانوں کی پشت پناہی کی اور مولانا آزاد اور گاندھی جی کے ساتھ مل کر دہلی کے مسلمانوں کو جن سنگھیوں سے نجات دلوائی وہ ہر نازک موقع پر اپنی ملت کے کام آئے۔

ہمارے گھر کے سب افراد کے ساتھ اُن کے گہرے روابط تھے۔ کبھی کبھار وہ والد سے ملنے کے لیے آتے۔ بڑے بھائی منشی عبدالقدیر تو خیر ان کے ہم مشرب ہی تھے اور جیلوں میں ساتھ رہ چکے تھے لیکن میرے چھوٹے بھائی محمد یوسف کی خطاطی کے وہ عاشق تھے۔ مجھ میں اور ان میں ایک رشتہ یہ بھی تھا کہ ہم دونوں ایک ہی وحید العصر استاد مولوی محمد اسحاق رامپوری کے شاگرد تھے۔

مولوی صاحب متعدد دفعہ جیل گئے اور حسرت موہانی کی طرح انہیں بھی چکی پیسنی پڑی اور بان بٹنے پڑے۔ وہیں حالت قید میں انہیں شاعری کا شوق ہوا اور اسی مناسبت سے انہوں نے اپنا تخلص ''اسیر'' رکھا تھا۔ ان کی ایک نظم کے کچھ شعر دیے جاتے ہیں جس میں انہوں نے بعض دوستوں کی رہائی پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ وھو ھذا:

زندہ کرتے ہوئے اسلاف کا تم نام چلے
ہو مبارک تمہیں تم جیل سے خوش کام چلے

سختیاں قید کی جھیلی ہیں خوشی سے تم نے
کون کہتا ہے کہ تم قید سے ناکام چلے

تم چلے خانۂ صیاد کو ویراں کر کے
شکر اللہ کا تم جیل سے خوش کام چلے

سیٹھ نورنگ چلے اور چلے گوبند سرن　　گوری شنکر چلے اور عارف خوش کام چلے
چھوڑ کر چل دیے زنداں میں ہمیں اسماعیل　　پر خوشی ہے ہمیں اس کی کہ وہ باکام چلے
منشی عبدالقدیر اور گلاب اور امیر　　باغ میں جتنے تھے چوٹی کے وہ سب آم چلے
چھوڑ کر مجھ کو چلے جیل میں تنہا عارف　　چھوڑ کر ہائے مجھے گوری گلفام چلے

قیدیوں میں ہوا جانے سے تمہارے شیون
ڈال کر جیل میں تم کیسا یہ کہرام چلے

مولوی صاحب بیک وقت ایک جید عالم، ایک متوازن سیاست دان، ایک بے مثال خطیب، ایک شیریں بیان واعظ اور ایک جادو اثر مقرر تھے۔ مولوی حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ کے بعد اس مخصوص طبقہ کے علماء میں بس ایک احمد سعید باقی رہ گئے تھے سو وہ بھی ۴ دسمبر ۱۹۵۹ء کی شام کو ساڑھے سات بجے ہم سے جدا ہو گئے اور اب......

افسوس از قبیلۂ مجنوں کسے نماند!

مولانا دہلوی کی تفسیر کشف الرحمٰن خصوصیات کے آئینے میں

(ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری)

مولانا کی سب سے اہم اور وقیع علمی و دینی خدمت ان کی تفسیر قرآن ہے جسے اٹھارہ برس کی مسلسل محنت اور جاں فانی کے بعد مکمل کیا۔ اس کی ابتدا ۱۹۳۸ء میں ہوئی تھی اور ۱۹۵۶ء میں یہ پایہ تکمیل کو پہنچی۔ ۱۴ شعبان ۱۳۷۵ھ (مارچ ۱۹۵۶ء) تاریخ تکمیل ہے۔ افسوس کہ اس کی اشاعت مولانا کی حیات میں نہ ہوسکی۔ وفات کے پانچ سال بعد ۱۳۸۲/۱۹۶۲ء میں ان کے خلف رشید حافظ محمد سعید نے اسے 'کشف الرحمٰن' کے عنوان سے ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع کرایا۔ اس کے سرورق پر حسب ذیل عبارت درج ہے جس سے اس ترجمہ و تفسیر کی بڑی حد تک وضاحت ہو جاتی ہے:

> "یہ وہ ترجمہ ہے جس کو سحبان الہند حضرت الحاج حافظ مولانا احمد سعید صاحب نے علماء کی ایک موقر جماعت کے مشورے سے کیا ہے اور اس کو مفتی اعظم علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب کی سرپرستی اور نگرانی حاصل رہی ہے۔ قرآن شریف کے ترجمے اور تیسیر القرآن و تسہیل القرآن کی ترتیب و تالیف حضرت سحبان الہند کی اٹھارہ سالہ محنت اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے"۔

یہ تفسیر ہندوستان کے علاوہ پاکستان سے بھی شایع ہوئی ہے۔ ندوۃ المصنفین والے ایڈیشن کی کتابت اور طباعت دونوں نہایت شاندار اور دیدہ زیب ہیں۔ اس کی ضخامت کو مناسب حد تک محدود رکھنے کی غرض سے اسے دو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی صفحات میں ترجمہ اور تفسیر سے متعلق علمائے کرام کی آرا بھی درج ہیں اور تمام حضرات نے ہی

یک زبان ہوکراس کی زبان، اندازِ بیان، حواشی کی جامعیت و معنویت اور علمیت کی دل کھول کر داد دی ہے۔ ان علماء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا حافظ سید حمید اللہ (امام جامع مسجد دہلی) مولانا مفتی سید مہدی حسن (مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند) مولانا عبدالوہاب آروی (صدر آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس) مولانا محمد فخر الدین (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) مولانا محمد سعید مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔ سورت، مفتی محمد صالح سورتی (خطیب جامع مسجد رنگون) مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا سید اعزاز علی (شیخ الحدیث و الادب دارالعلوم دیوبند) مولانا عبدالصمد رحمانی (نائب امیر شریعت، صوبہ بہار) کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعد کلامی معجزہ کے عنوان سے قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) کی ایک طویل تقریظ بھی شامل کی گئی ہے۔ اس ترجمہ کے بارے میں قاری صاحب کا یہ فرمانا بڑی اہمیت و وقعت رکھتا ہے کہ

> ''مجھے تمام تراجم میں بوجہ بلاغت حضرت تھانوی قدس سرہ کا ترجمہ پسند تھا لیکن یہ ترجمہ شگفتگی میں اس سے بھی کچھ سواہی نظر آتا ہے۔ ارادہ کرتا ہوں کہ اپنی تحریرات میں جہاں آیات کے ترجمے درکار ہوں گے تو اس ترجمے کی نقل پر قناعت کرسکوں گا''۔

ابتدا میں اظہار تشکر کے عنوان سے حافظ محمد سعید صاحب کی تحریر ہے جس میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا گیا ہے جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے اس ترجمہ وتفسیر کی تسوید اور بعد ازاں اس کی اشاعت میں معاونت کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس طریق کار کی وضاحت بھی کی ہے جو حضرت سحبان الہند نے اس کی تالیف کے سلسلہ میں اختیار کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے کام لیا اور علماء وفقہاء سے ہر ہر قدم پر صلاح و مشورہ جاری رکھا۔ اس طرح اس عظیم تفسیری خدمت کو ہر لحاظ سے مستند اور معیاری بنانے کی سعی بلیغ کی۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''روزانہ کام کرنے کا معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز پڑھ کر فراش خانہ میں کڑہ ہدو کی مسجد میں تشریف لے جاتے۔ وہاں ڈیڑھ، دو گھنٹے قرآن

شریف کا ترجمہ بیان فرماتے۔ اس مسجد میں کم و بیش تیس بتیس سال آپ نے ترجمہ قرآن کریم فرمایا۔ ترجمے سے فارغ ہو کر مکان تشریف لے جاتے اور ترجمہ قرآن کریم لکھنے میں مشغول ہو جاتے۔ قرآن کریم کے اس ترجمے میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ بھی وقتاً فوقتاً شرکت فرمایا کرتے تھے۔ علمائے کرام کی ایک مختصر جماعت مولانا کے سامنے مختلف ترجمہ کے قرآن کریم اور تفسیریں کھولے بیٹھے رہتی۔ کبھی آپ ایک سے ترجمہ سنتے، پھر دوسرے کو ارشاد فرماتے اور پھر تفسیروں کو پڑھواتے۔ اخیر میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے کو سنتے۔ سب کچھ سننے کے بعد آپ ایک ایک آیت کا ترجمہ لکھتے تھے۔ پھر دوسری آیت لیتے۔ اس کا بھی اسی طرح چکر چلتا تھا...... ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر صبح کے لکھے ہوئے ترجمے پر نظر ثانی فرماتے۔ کبھی حضرت مولانا سلطان محمود، شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ فتح پوری مولانا صاحب سے ملنے تشریف لاتے تو ان کو ملاحظہ کراتے۔ کبھی مولانا اللہ بخش صاحب و مولانا ضیاء الحق صاحب دیوبندی مرحوم، جو مدرسہ امینیہ میں صدر مدرس تھے اور مولانا مرحوم کے استاد تھے۔ آتے تو ان کو سناتے۔ کبھی حضرت مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی، نائب امیر شریعت تشریف لے آتے تو ان کو ملاحظہ فرماتے۔ کبھی کوئی اور صاحب دیوبند سے تشریف لاتے تو ان کو دکھاتے۔ کوئی صاحب پاکستان سے ملنے آتے تو ان کو بھی دکھاتے۔ غرض اہل علم میں جو حضرات بھی کہیں سے تشریف لاتے تو ان کو ضرور ملاحظہ کراتے تھے“۔

اس طرح انتہائی محنت و جاں فشانی، عرق ریزی اور ژرف نگاہی سے قرآن کریم کے ترجمے کشف الرحمٰن اور تفسیر الرحمٰن تیسیر القرآن و تسہیل القرآن کی تالیف کا کام کیا گیا۔ مولانا نے ترجمہ کا عنوان کشف الرحمٰن اس کی مختصر تشریح کا عنوان تیسیر القرآن اور اس کے حواشی جو

کافی جامع اور مفصل ہیں ان کا عنوان تسہیل القرآن متعین فرمایا ہے۔اس کام میں متعدد عربی، فارسی اور اُردو تفاسیر سے بھی مدد لی ہے۔ان کی فہرست بھی سرورق پر دے دی گئی ہے۔ان میں جلالین، روح البیان، تفسیر کبیر، تفسیر مظہری، مدارک، خازن، ابن کثیر، فتح البیان، بیضاوی، کشاف، تفسیر ابن جریر، بیان القرآن، تفسیر حسینی، اعظم التفاسیر، تفسیر درمنثور اور جامع التفاسیر شامل ہیں۔

حضرت سحبان الہند کے ترجمہ کشف الرحمٰن، تفسیر تیسیر القرآن اور حواشی تسہیل القرآن کے طرز بیان، اسلوب نگارش اور انداز توضیح وتشریح کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان سے چند اقتباسات پیش کر دیے جائیں۔نمونہ ملاحظہ ہو:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''شروع اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان، نہایت رحم والا ہے''۔

تیسیر: اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں جو بے حد مہربان ہے اور بے انتہا رحم کرنے والا ہے۔

تسہیل: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس بڑی رحمت والی ہے اور اس کی رحمت و مہربانی بڑی عام ہے۔میں اس سورۃ کو اسی کے نام کی برکت حاصل کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں تا کہ آدابِ تلاوت میں کوئی کوتاہی یا سہو ہو جائے یا کسی آیت کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہو جائے تو خدائے تعالیٰ اپنی عام رحمت و مہربانی سے اس کو درگزر فرماوے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس اہم اور ذیشان کام کو شروع کرتے وقت بسم اللہ نہ پڑھی جائے اس کام میں کامیابی اور برکت نہیں ہوتی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

سب تعریفیں اس خدا کو لائق ہیں جو تمام عالموں کا رب ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

جو روز جزا کا مالک ہے۔

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ

اور ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡم

ہم کو سیدھی راہ چلا۔

صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ۔

ان لوگوں کی جن پر تو نے اپنا فضل کیا۔

غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ۔

وہ لوگ وہ ہیں جن پر نہ غضب نازل کیا گیا۔

وَلَا الضَّآلِّیۡنَ

اور نہ وہ جو راہ سے بے راہ ہوئے۔

تیسیر: سب تعریفیں اور حمد وثنا اسی اللہ تعالیٰ کو سزاوار اور لایق ہے جو ہر ایک عالم کا مربی اور تربیت کرنے والا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ بے حد مہربان اور بے انتہا مہربانی کرنے والا ہے وہ جزا و سزا کے دن کا مالک ہے۔

تسہیل: حاصل یہ ہے کہ جو تعریفیں اب تک ہو چکیں یا آیندہ ہوں گی ان سب کا حقیقی مستحق اللہ تعالیٰ ہے کیوں کہ مخلوق میں سے جس چیز کی بھی تعریف کی جائے وہ درحقیقت خدا ہی کی ہے اس لیے کہ مخلوق کی تمام خوبیاں حضرت حق ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ وہی ہر ایک عالم کا خواہ عالم ملائکہ یا عالم جنات و انسان ہو یا عالم نباتات و جمادات ہو، سب کا وہی خالق اور وہی پرورش کنندہ ہے۔ رب کے بہت سے معنی ہیں۔ ہم نے یہاں کی مناسبت سے خالق و مربی کر دیا ہے۔

جزا و سزا کا دن قیامت کا دن ہے کیونکہ اس دن ہر برے اور بھلے کو اس کے کیے کا بدلہ

ملنے والا ہے۔ اگر چہ ہر چیز کے حق تعالیٰ ہی مالک ہیں لیکن چوں کہ وہ دن نہایت ہی اہم اور خوفناک ہوگا اور اس دن ہر قسم کی حکومتیں اور بادشاہتیں فنا ہو چکی ہوں گی اس لیے اس کی ملکیت وخودمختاری کا ذکر فرمایا کہ اس دن کوئی ظاہری اور مجازی مالک بھی نہ ہوگا۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا سب پر مالکانہ تصرف ہوگا۔

سورۃ بقرہ آیت ۳۰:

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ط قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

کشف الرحمٰن: اور وہ واقعہ قابل ذکر ہے جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ یقیناً میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کیا آپ زمین میں ایسے شخص کو پیدا کریں گے جو اس میں فساد اور خوں ریزی کرے یعنی اس کی اولاد اور ہم آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح کرتے اور آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے فرمایا میں اس بات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے۔

تیسیر القرآن: وہ واقعہ قابل ذکر ہے جب اے پیغمبر آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ یقیناً میں زمین پر ایک نائب بنانے والا ہوں۔ اس پر فرشتوں نے عرض کیا۔ کیا آپ زمین پر ایسے لوگوں کو پیدا کریں گے جو اس میں فساد کریں گے اور خوں ریزی کے مرتکب ہوں گے۔ حالانکہ ہم آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح کرتے اور آپ کی تنزیہ وتقدیس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اس کے پیدا کرنے کی جو حکمت ومصلحت میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔

تسہیل القرآن: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب زمین میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا چاہا اور ملائکہ اور جنات کی موجودگی کے باوجود ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا جو دونوں قسم کی استعداد سے متصف ہو اور اس کی طبیعت اصلاح اور فساد دونوں کی جانب مائل ہونے والی ہو کیوں کہ ملائکہ میں تو نافرمانی اور فساد کی صلاحیت ہی نہ تھی اور جنات میں اگر چہ اصلاح

کی استعداد موجود تھی لیکن وہ بہت ضعیف تھے۔ اس لیے حضرت حق جل مجدہ کو فجور اور تقویٰ دونوں کی استعداد رکھنے والی مخلوق کو نائب اور خلیفہ بنانا تھا تاکہ وہ زمین میں احکامِ شرعیہ کا نفاذ اور اجراء کرے اور حدود الٰہی کو قائم کرے۔

حضرت سحبان الہند نے بعض امور سے بہت تفصیلی گفتگو فرمائی ہے۔ اسی طرح بہت سی آیات کے معانی ومفاہیم بھی بڑی شرح وبسط سے بیان کیے ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳ کا ترجمہ، تشریح اور معانی ومطالب پیش کیے جاتے ہیں:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○

ترجمہ: اور اگر واقعی تم اس کتاب کی نسبت جو ہم نے اپنے خاص بندے یعنی محمدؐ پر نازل کی ہے کچھ شک ہو تو تم اس جیسی ایک چھوٹی سی سورۃ ہی بنا کر لے آؤ اور تم اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلالو اگر تم سچے ہو۔

(ف ا) اور اگر تم کو اس کتاب کے بارے میں جو ہم نے اپنے خاص بندے محمدؐ پر نازل فرمائی ہے کچھ شک وشبہ ہو کہ یہ ہم نے نازل نہیں کی بلکہ اس کتاب کو ہمارے بندے نے بنایا ہے تو تم اس کی مثل ایک چھوٹی سی سورۃ ہی بنا کر لے آؤ اور تم اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں اور حمایتوں کو بلالو، اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو۔ پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اس کتاب کی مثل کوئی چھوٹی سی سورۃ باوجود اپنے حمایتیوں کے بنا کر نہ لائے اور ہم کہتے ہیں کہ تم اس قرآن کا جواب بنا کر لا بھی نہ سکو گے، تو پھر اس آگ سے بچنے کی کوشش کرو جس آگ کا ایندھن بجائے لکڑی اور کوئلے کے آدمی اور پتھر ہیں اور وہ آگ کافروں اور دین حق کے منکروں کے لیے تیار کی جا چکی ہے۔

تیسیر القرآن: ریب اصل میں نفس کے اضطراب اور قلق کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب دل میں اضطراب اور قلق ہوتا ہے تو طبیعت کسی ایک بات پر نہیں ٹھکتی اور اسی کو شک کہتے ہیں۔ ہم نے ابتدا میں بتایا تھا کہ کسی چیز میں شک کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ اس چیز میں واقعتاً شک ہو اور دوسرے یہ کہ کوئی شخص اپنی عقل کی کوتاہی اور ضد سے شک کرے۔ چنانچہ

لاریب فیہ میں پہلی صورت کی نفی تھی۔ اب اس دوسری صورت کی نفی فرماتے ہیں کہ اگر تم کو واقعی اس کتاب کے من جانب اللہ ہونے میں شک ہے اور تم اس قرآن کو محمدؐ کا خود ساختہ کلام سمجھتے ہو تو تم بھی اس قرآن کی مثل ایک محدود ٹکڑا اور چھوٹی سی سورۃ بنالاؤ ۃ جو فصاحت و بلاغت اور پند و نصائح اور تاریخ امم ماضیہ اور غیب کی خبروں وغیرہ میں اس قرآن جیسی ہو۔ آخر تم لوگ بھی عربی ہو، عرب کے رہنے والے ہو، عربی زبان سے واقف ہو۔ پھر بھی ہم تمہارے ساتھ اتنی رعایت اور کرتے ہیں کہ تم اپنے مددگاروں کو بھی بلالو اور تم سب مل کر ہمارے اس مطالبے اور تحدی کا جواب دو''۔

قرآنِ کریم میں جو حروفِ مقطعات استعمال ہوئے ہیں ان کے بارے میں مختلف مفسرین اور مترجمین نے الگ الگ نقطہ نظر اپنایا ہے۔ کچھ حضرات نے ان کے معانی و مفاہیم متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن زیادہ تر مفسرین نے محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔ ان حضرات کا فرمانا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے درمیان راز ہیں اور چوں کہ کسی مصلحت سے ان کے معانی ظاہر نہیں کیے گئے ہیں اس لیے ہمیں بھی اس سلسلہ میں اشہب فکر کو دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت سحبان الہند نے بھی یہی موقف اپنایا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''الف۔ لام۔ میم۔ حروف ہیں۔ ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں۔ تمام قرآن میں یہ حروف ۲۹ سورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں۔ کسی سورت کی ابتدا میں صرف ایک ایک حرف ہے جیسے قاف، نون، صاد اور کسی سورت کی ابتدا میں حرف دو ہیں جیسے طٰہٰ، یاسین اور کسی سورت کی ابتدا میں تین ہیں جیسے الف لام میم اور الف لام را اور کسی سورت کی ابتدا میں ان حروف مقطعات کی تعداد چار ہے جیسے الف لام میم صاد اور کسی سورت کی ابتدا میں ان کی تعداد پانچ ہے جیسے کاف ہا، یا عین، صاد اور حا میم، عین سین، قاف۔ بہرحال یہ حروف اللہ تعالیٰ کے اسرار اور اس کے بھیدوں میں سے کچھ ایسے بھید ہیں جن کو وہی خوب جانتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ان حروف کے معنی اور ان کے حقیقی مراد سے اور

اس بھید سے جو ان حروف میں پنہاں ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ کر دیا ہو۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اس کے معنی سوائے اللہ تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی نہیں جانتا تو پھر علمائے مفسرین نے ان کے معنی کیوں بیان کیے ہیں۔ جواباً گذارش ہے کہ جن حضرات نے ان کے معنی بیان کیے ہیں وہ تخمین ہیں جو محض تمثیل وتشنیہ کے طور پر بیان فرماتے ہیں اور جو لوگ معنی کی نفی کرتے ہیں اور کچھ کہنے سے انکار کرتے ہیں وہ حقیقی معنی اور حقیقی مراد کا انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا بیان کرنے والوں اور خدا کے سپرد کرنے والوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے اپنی تفسیر میں ان حروف کی تحقیق کے بارے میں قدمائے مفسرین کے سولہ اقوال نقل کیے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس ترجمہ وتفسیر اور حواشی میں گو عام مفسرین کے طرز کی بڑی حد تک پیروی کی گئی ہے تاہم طرزِ نگاوش اور اسلوب بیان عام فہم، سلیس اور شگفتہ ہے۔

مفتی اعظم اور سحبان الہند

استاذ اور تلمیذ

(مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؔ)

حلیہ اور اخلاق و عادات:

دلی کی خاک سے جو چند باکمال ہستیاں اُٹھیں مولانا کی ہستی ان میں سے ایک باکمال ہستی تھی۔ صورت شکل کے لحاظ سے بھی مردانہ حسن کا عمدہ نمونہ اور علم و فضل کے لحاظ سے بھی جوہر قابل۔

میدہ شہاب رنگ۔ طوطے کی چونچ کی سی کھڑی ناک۔ چوڑا چکلا وجیہ اور مسکراتا ہوا چہرہ۔ پیشانی اُونچی اور روشن، قد و قامت بلند اور بھاری بھرکم، ہر مجلس و محفل میں ممتاز اور جاذب توجہ، شیرینیٔ گفتار، انداز کلام اور علم مجلسی سے مجمع پر چھا جانے والے۔

خدا بخشے! مولانا بہت سی متضاد صفات اپنے اندر رکھتے تھے۔ پرائیویٹ محفلوں میں ٹھیٹھ کرخنداری انداز کی ظرافت بھی تھی اور اوراد و وظائف کا شغل بھی تھا۔ سیاسی مجلس میں عالمی سیاست پر سیر حاصل بحث بھی تھی۔ علمی مجلس میں قرآنی نکات کا بیان اور اسرار و حکم کا انکشاف بھی تھا۔ صوفیہ کی محفل میں دقائق تصوف کی تحقیق اور عالم جذب و کیف بھی تھا۔ ادبی محفل میں سخن سنجی اور سخن فہمی بھی تھی۔ شاعر بھی تھے۔ شعر کی داد بھی خوب دیتے تھے۔ جنگ آزادی کے میدان میں قید و بند کی مشقت بھی جاری تھی۔ ملکی سیاست کے میدان میں الیکشن بازی کی گھوڑ دوڑ بھی تھی۔ اگرچہ اپنی شیریں بیانی کی دھاک تمام ہندوستان میں بٹھا دی اور اپنی ٹھوس خطابت کا لوہا دشمنوں سے بھی منوالیا۔ مگر الیکشن بازی کی گھوڑ دوڑ میں ٹھوکر بھی کھا جاتے تھے۔ عجیب و غریب ہستی تھی مولانا کی۔ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ کہتے نہیں بنتی غم الفت کا فسانہ۔

ابتدائی تعلیم:

مولانا نے ہوش سنبھالتے ہی بولنا اور چہچہانا شروع کر دیا تھا۔ کچھ زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا کہ وعظ کہنے لگے تھے۔ ان پڑھ آدمی کا وعظ اور تقریر ہی کیا۔ جن لوگوں کے اندر ذاتی جوہر اور دماغی صلاحیت موجود ہوتی ہے ان کو کسی استاد کامل کا انتساب اور رہبری حاصل نہ ہو تو اکثر وہ بھٹک جاتے ہیں۔ ان کا حوصلہ بے لگام ہو جاتا ہے۔ کس قدر عظیم الشان برکت و سعادت ہے اس انتساب میں اور یہی انتساب تو ہے جس کے بغیر سلسلہ سند مکمل نہیں۔ رسول عربی فداہ امی وابی سے ہم تک دین کے پہنچنے کا ذریعہ یہی انتساب تو ہے۔

اس منظر کے دیکھنے والے اب بھی یقیناً موجود ہیں۔ جبکہ ایک نوجوان واعظ چاندنی چوک میں فوارے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جواب دے رہا ہے۔ تقریر میں بڑا زور ہے ایسا زور کہ علماء پر بھی حیرانی چھا جاتی ہے۔

ایک مرد حق آگاہ نے اس بلبل ہزار داستان پر اپنی دور رس نگاہیں ڈالیں، بھانپ لیا، کھینچ لیا، کندن بنا کر چھوڑا۔ فوارے کے سامنے سنہری مسجد میں مدرسۂ امینیہ تھا۔ اس کے صدر مدرس مولانا مفتی کفایت اللہ تھے۔ ان کے ایک شاگرد مولانا حافظ قاری محمد یاسین سکندر آبادی مولانا کو ابتدائی کتابیں پڑھانے پر مامور ہوئے۔ پھر باضابطہ داخلہ ہو گیا۔ تعلیم کے دوران میں ہی حضرت مفتی صاحب کی توجہ و تربیت شروع ہو گئی تھی۔

علم مجلسی:

اب سے کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے جبکہ مولانا ایک طالب علم کی حیثیت سے مدرسہ امینیہ میں پڑھتے تھے۔ طلبائے مدرسہ کی ''انجمن اصلاح الکلام'' کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ باڑہ ہندو راؤ میں منعقد ہوا۔ بڑا بھاری پنڈال بنایا گیا۔ راقم الحروف کے استاد مرحوم جناب ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی ایک قصیدہ لکھ کر لائے تھے۔ مولانا احمد سعید نے کھڑے ہو کر رسمی تعارف کرایا۔ رسمی اس لیے کہا کہ جلسوں میں دستور ایسا ہی ہے۔ ورنہ سائل صاحب اور ان کے خاندان سے تو دہلی کا بچہ بچہ واقف تھا۔ تعارف کے ساتھ

مولانا نے کہا:

''شاہی زمانہ ہوتا تو نواب صاحب جیسے قادر الکلام اور فصیح و بلیغ شعرا کو
خلعت ملتے، انعامات سے نوازے جاتے، ہم غریب طالب علم آپ کو
سوائے دعا کے اور کیا دے سکتے ہیں''۔

اس کے بعد نواب صاحب نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ نواب صاحب کا رُخ مجمع کی طرف تھا اور مولانا اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا نے ہر شعر پر داد دینی شروع کی۔ نواب صاحب نے مجمع کی طرف سے پیٹھ موڑلی۔ اب مولانا ہیں اور نواب صاحب ہیں۔ وہ داد دے رہے ہیں وہ سنائے چلے جارہے ہیں۔ پنڈال بھرا ہوا تھا۔ مجمع میں سے آوازیں آنے لگیں۔ نواب صاحب! نواب صاحب! ادھر بھی! مجمع چیختے چیختے تھک گیا۔ مگر نواب صاحب نے ادھر رخ نہ کیا۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ اپنے دل میں سوچ رہے تھے کہ کہیں مجمع بے ساختہ نہ ہو جائے۔ مگر ایک تو یہ کہ نواب صاحب کے علم و فضل اور ان کی خاندانی عظمت سے کون واقف نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ مجمع آج کل کا مہذب اور تعلیم یافتہ مجمع نہیں تھا کہ بے قابو ہو جاتا یا ہوٹنگ کرتا۔

نواب صاحب نے اپنا قصیدہ اسی طرح پورا مولانا کو سنادیا اور مولانا نے بھی داد و تحسین کا حق ادا کر دیا۔ کیسا اخلاص و محبت سے بھرا ہوا تھا وہ زمانہ!

شاگردی اور تربیت:

حضرت مفتی اعظمؒ اور مولانا احمد سعید کی رفاقت کا زمانہ معمولی زمانہ نہیں ہے۔ یہ پچاس برس کا طویل زمانہ ہے۔ ایک طرف تعلیم و تربیت بھی جاری تھی۔ دوسری طرف تقریر و مناظرہ بھی۔ وہ مناظروں کا دور تھا۔ حضرت مفتی صاحب اپنے ساتھ لے جا کر مولانا کو مناظرے کی مشق بھی کراتے تھے۔ خود معاون بنتے تھے شاگرد مناظرہ کرتا تھا۔ بڑے بڑے معرکے کے مناظرے ہوئے۔ یہ مناظرے اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثال مناظرے تھے۔ حضرت مفتی اعظمؒ کی قوت استدلال اور مولانا کی قوت تقریر۔ یہ ایک ایسا عمدہ امتزاج تھا جس کا جواب مناظروں کے دور کی پوری تاریخ میں مشکل ہی سے کہیں دستیاب ہو سکے گا۔

سیاسی دور کی رفاقت:

مناظروں کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان کی سیاست کا دور شروع ہوا۔ حضرت مفتی صاحب نے جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد ڈالی۔ یہ رفاقت استوار تر ہوتی چلی گئی۔ مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند بنائے گئے۔ ہر لمحے کے رفیق، ہر کام میں شریک، سفر و حضر کے ساتھی، زنداں میں غمگسار، جلسوں میں ترجمان، جلوت میں ہم جلیس، خلوت میں ہمراز، غرضکہ زندگی کا کوئی پہلو اور گوشہ نہیں تھا جس میں ان دونوں کی رفاقت نہ پائی گئی ہو۔ عیدین میں عیدگاہ بھی دونوں ساتھ ہی جایا کرتے تھے۔

مرقع رفاقت:

ابھی چند روز ہوئے مولوی مشہود حسن صاحب مدرس مدرسہ امینیہ نے مجھ سے اپنا خواب بیان کیا:

> ''میں خواب دیکھ رہا ہوں کہ حضرت مفتی صاحب مولانا احمد سعید کا ہاتھ پکڑے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب بہت تندرست اور تنومند معلوم ہو رہے ہیں۔ مولانا کچھ کمزور اور لاغر ہیں۔ راستے میں جہاں نالیاں آتی ہیں حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں دیکھو نالی ہے۔ مولانا کا قدم نالیوں پر اس طرح پڑتا ہے کہ ایک کنارے پر ایڑی اور دوسرے کنارے پر پنجہ۔ غرضکہ اسی طرح سہارا دیتے ہوئے اور ٹوکتے ہوئے حضرت مفتی صاحب مولانا کو لے جا رہے ہیں''۔

مولوی صاحب موصوف کا خواب سن کر میں پھڑک اُٹھا اور بیساختہ زبان سے نکلا ''کھینچ کر لے ہی گئے''۔ خواب کیا ہے دونوں کی رفاقت کا ایک مکمل اور سچا مرقع ہے۔ رہبر صادق اور استاذ کامل ہو تو ایسا ہو۔ یہ رہنمائی مولانا کے لیے زندگی میں بھی شمع راہ بنی رہی اور اب عالم برزخ میں بھی منارۂ منزل ثابت ہوئی اور عالم ظاہر میں دونوں کی قبروں کے درمیان بھی کوئی فاصلہ نہیں۔
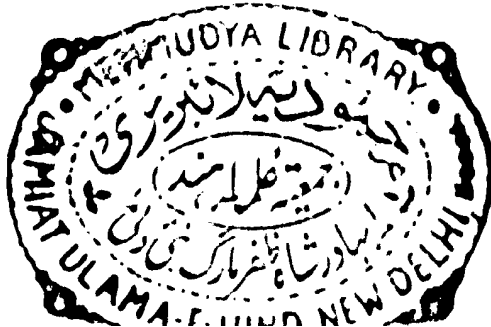
کردار کی رہنمائی:

حضرت مفتی اعظمؒ کے کردار سے مولانا کی زندگی کس حد تک متاثر ہوئی؟ اس کا جائزہ لینا تو میرے موقف سے بالاتر ہے۔ البتہ قدم قدم پر ان کی رہنمائی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے۔ ابوالغیاث شیخ کریم الدین صاحب میرٹھی جو ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۵-۱۶ برس تک جنوبی ہند میں بطور سفارت جمعیۃ علمائے ہند کی خدمات انجام دیتے رہے۔ بیان فرماتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء کی تحریک سول نافرمانی کے موقع پر جمعیۃ علماء پر ایسا تنگی کا وقت آیا کہ فنڈ میں روپیہ بالکل نہ تھا۔ کئی ماہ کی تنخواہیں چڑھ گئیں اور تحریک کو جاری رکھنا ناممکن ہوگیا۔ پنڈت موتی لال نہرو جو دہلی آئے ہوئے تھے اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں قیام پذیر تھے ان کا پیغام آیا کہ لاکھ دو لاکھ جس قدر روپے کی ضرورت ہو ہم کانگریس کے فنڈ سے دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ تحریک کو جاری رکھیے۔ مولانا اُس وقت ناظم اعلیٰ تھے۔ یہ پیشکش قبول کرنے پر آمادہ تھے اور اس میں بظاہر کوئی حرج بھی نہیں تھا کیونکہ کانگریس کا فنڈ تمام فرقوں کا مشترک فنڈ تھا۔ حضرت مفتی اعظمؒ گرفتار ہو چکے تھے اور اُس وقت تک دہلی جیل میں ہی تھے۔ اس سلسلے میں جب آپ سے مشورہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

> ''جنگ آزادی کے میدان میں ہم کسی دوسرے کے سہارے پر نہیں کھڑے ہوئے ہیں۔ استخلاص وطن کی جدوجہد ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ اگر ہم جماعت کو نہیں چلا سکیں گے تو دفتر کو بند کر دیں گے''۔

کیا ہے کردار؟ اور کیا چیز ہے کردار کی بلندی؟ آؤ دیکھو! یہ ہیں ہمارے اسلاف جن کی مثال زمانہ کبھی پیش نہیں کر سکے گا۔

میاں سر فضل حسین وزیر تعلیم پنجاب جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر بھی تھے۔ انھوں نے حکومت برطانیہ کی طرف سے حضرت مفتی اعظم کو یہ پیغام پہنچایا کہ

> ''حکومت برطانیہ یہ درخواست کرتی ہے کہ آپ سیاسی تحریکات سے کنارہ کش ہو جائیں اس کے صلے میں حکومت آپ کو بطور ہدیہ مدرسہ صفدر جنگ کی شاہی عمارت اور اس کا ملحقہ میدان پیش کرے گی اور

آپ کی ذات خاص کے لیے ہبہ کردے گی۔ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ آپ
حکومت برطانیہ کی حمایت یا پروپیگنڈہ کریں۔ نہیں بلکہ آپ صرف اتنا
کریں کہ خاموش رہیں اور سیاست سے الگ رہیں''۔

یہ ایک رازدارانہ پیغام تھا جو والد مرحوم نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے بیان کیا تھا اور آج پہلی مرتبہ صفحہ قرطاس پر آرہا ہے۔ حضرت نے جواب دیا:

میں آزادیٔ وطن کی تحریک میں اپنی ذاتی منفعت کے لیے شریک نہیں
ہوا ہوں۔ آپ کی پیشکش کا شکریہ! کوئی لالچ میرے ضمیر کی آواز کو نہیں
دبا سکتا''۔

ابوالغیاث صاحب فرماتے ہیں کہ جنگ آزادی کے پورے دور میں صرف تین آدمی ایسے دیکھے جنھوں نے تحریکات کے سلسلے میں سیکڑوں سفر کیے۔ مگر مصارف سفر ہمیشہ اپنی جیب سے ادا کیے۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ۔ فرق یہ ہے کہ حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب دولت منداور غنی تھے۔ حضرت مفتی اعظم فقیر مستغنی۔ جمعیۃ علمائے ہند سے حضرت نے اپنی صدارت کے پورے دور میں اپنا سفر خرچ کبھی نہیں لیا۔ اگر کبھی ہاتھ تنگ ہوتا تو سفر کو ملتوی فرما دیتے تھے۔ مگر التواء کا سبب کچھ اور ظاہر فرماتے تھے۔

پس اے مسلمانو! یاد کرو وہ وقت جبکہ تم جامع مسجد شاہجہانی کے صحن میں کھڑے ہو کر ایسی اولوالعزم ہستیوں پر ''کانگریس کے تنخواہ دار'' ہونے کا الزام لگایا کرتے تھے۔

اور اے آدمیو! یاد رہے گا یہ وقت جبکہ تم اُن بے لوث مجاہدین کی قربانیوں کو بھول چکے ہو اور ان کا نام صفحہ تاریخ سے مٹا دینا چاہتے ہو۔ جنھوں نے اپنی ضروریات کے لیے بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور آزادی کی جنگ میں ان کا قدم آگے ہی بڑھتا ہے۔ اپنے سر کٹا کر ہمارے سر اُونچے کر گئے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

تری کوتاہ بینی دوسروں کی قدر کیا جانے
بانداز نظر ہوتا ہے اوج آسماں پیدا
(واصف)

خدمات جمعیۃ علمائے ہند:

قیام جمعیۃ کے وقت سے ۱۹۳۹ء تک پورے بیس برس حضرت مفتی اعظمؒ اس کے صدر اور مولانا احمد سعید ناظم اعلیٰ رہے۔ شروع شروع میں جب تک اس کا دفتر مدرسۂ امینیہ میں رہا دونوں حضرات ہر وقت شریک کار رہے۔ جب اس کے لیے مستقل دفتر علیحدہ قائم ہوا تو مولانا ہی اس کے انچارج رہے۔ مفتی صاحب شام کو مدرسے سے فارغ ہو کر کبھی کبھی دفتر تشریف لے جاتے تھے اور مولانا دن بھر دفتر میں ہی رہتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات رات کو بھی دفتر میں سوتے تھے۔

مولانا اگر چہ حضرت مفتی صاحب کے شاگرد تھے مگر حضرت کا برتاؤ مولانا کے ساتھ ایسا تھا کہ دیکھنے والے ان کو آپس میں دوست اور ہم عصر خیال کرتے تھے۔ تعلیم و تعلم کا مشغلہ ۱۹۳۲ء میں ملتان جیل میں بھی رہا۔ یعنی وہاں مولانا نے مفتی صاحب سے فتح الباری کا آخری پارہ پڑھا۔

مولانا کو قرآن مجید کے معانی و مطالب اور ربط آیات پر بے انتہا عبور تھا اور یہ مولانا کا خاص امتیاز اور ملکہ تھا۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

آنسو رہ وفا میں گراتے گزر گئے ۔۔۔ لوٹو! کہ ہم خزانے لٹاتے گزر گئے
دامن کو اُلجھنوں سے بچاتے گزر گئے ۔۔۔ اچھے رہے جو ہنستے ہنساتے گزر گئے
ہستی کے رہگذار میں کس کو قیام ہے ۔۔۔ آئے ادھر تو ملتے ملاتے گزر گئے
یہ بھی تری نگاہ کی توفیق تھی کہ ہم ۔۔۔ اس رہگذر سے ٹھوکریں کھاتے گزر گئے
آئی بہار غنچۂ خاطر نہیں کھلا ۔۔۔ یہ دن بھی یونہی اشک بہاتے گزر گئے
ملتی نہیں ہر ایک کو یہ دولت جنوں ۔۔۔ کتنے ہی آئے خاک اُڑاتے گزر گئے

واصف سے ہم ملے جو سرِ رہگذارِ عشق
باہم دلوں کے داغ دکھاتے گزر گئے

مرقع کی تکمیل:

ایک روز کسی کام سے جمعیۃ علمائے ہند کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے فرمایا۔ آیئے واصف صاحب! آپ کی بڑی عمر ہے۔ میں آپ کو یاد ہی کررہا تھا۔ رات کو میں نے ایک خواب دیکھا ہے وہ سنانا چاہتا تھا۔

> ''میں نے دیکھا کہ ایک عالی شان مکان میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے میں اور آپ اور آپ کے بھائی خلیل الرحمٰن صاحب بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ مختلف قسم کی بات چیت ہورہی ہے۔ اتنے میں مولانا احمد سعید مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور اپنی عادت کے مطابق بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ میں نے کہا کہ آپ دونوں حضرات دنیا میں بھی ساتھ تھے اور یہاں بھی ساتھ ہیں۔ مولانا احمد سعید ہنسے۔ حضرت مفتی صاحب اپنی عادت کے مطابق سنجیدگی سے مسکرائے''۔

لیجیے تکمیل ہوگئی اس مرقع کی جس کا خاکہ مولوی شہود حسن کو دکھایا گیا تھا۔ رنگ بھرنے والے نے رنگ بھر کر اس کو قصر علیین میں سجادیا۔

تدفین:

مولانا کے دل میں ہمیشہ سے حضرت مفتی اعظمؒ کے قریب دفن ہونے کی آرزو تھی اور زندگی میں اس کا انتظام بھی کرلیا تھا۔ مہرولی میں دو قبروں کی جگہ محفوظ کر رکھی تھی۔ یہ آرزو پوری ہوگئی اور آج درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ظفر محل کی دیوار کے نیچے دونوں استاد شاگرد میٹھی نیند سورہے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

مولانا احمد سعید دہلوی کی رحلت

۴؍دسمبر ۱۹۵۹ء جمعیت علمائے ہند کے سابق نائب صدر، نامور خطیب، مصنف اور تفسیر کشف الرحمٰن کے مصنف مولانا احمد سعید دہلوی کا انتقال ہوگیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کے انتقال پر ''صدق جدید'' میں حسب ذیل تعزیتی وتعارفی نوٹ شائع کیا ہے:

مولانا احمد سعید کی رحلت:

دلی سے افسوسناک اطلاع آئی کہ ۴؍دسمبر یوم جمعہ کو شام کے وقت مشہور ومعروف مولانا احمد سعید صاحب نے ۷۵ سال کے سن میں رحلت فرمائی اور نماز جنازہ ایک جم غفیر کے ساتھ مولانا محمد یوسف صاحب (صدر جماعت تبلیغ) نے پڑھائی۔ ابھی گئے دن کی بات ہے کہ انھیں مرحوم نے نماز جنازہ مولانا ابوالکلام کی پڑھائی تھی!

مرحوم تحریک آزادی میں پیش پیش رہنے والوں میں تھے اور بار بار اس کی خاطر جیل گئے اور اور بھی تکلیفیں برداشت کیں۔ یہ سب چیزیں معلوم عوام ہیں۔ مولانا خصوصی شہرت اپنی خوش بیانی کے لیے رکھتے تھے اور گفتگو نج کی صحبتوں میں بھی بڑی دلچسپ کرتے تھے۔ مسلمانوں میں بعد مولانا ابوالکلام کے جو (ہندو پاکستان ملاکر) چار یا پانچ بہترین مقرر تھے۔ ان میں سے ایک وہ بھی تھے بلکہ اگر وہ دہلی کی زبان اور فصاحت بیان کی قید لگا دی جائے تو شاید وہی نمبر اوّل پر تھے۔ مرحوم کا ایک خاص جوہر ان کی خدمت خلق تھی۔ ہر ایک کے کام آنا، ہر ایک کی امداد کو تیار ہو جانا وہ گویا اپنا فرض سمجھے ہوئے تھے اور عجب کیا کہ ان کا یہی ایک وصف ان کی مغفوریت اور قبولیت کے لیے کافی ہو جائے۔ عمر کا آخری حصہ خدمت قرآن میں بسر ہو رہا تھا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

(صدق جدید، لکھنو ۱۸؍دسمبر ۱۹۵۹ء)

اور ستارا ٹوٹ گیا!

(حفیظ الرحمٰن واصف)

حضرت مفتی اعظم نور اللہ مرقدہ، حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ اور مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ کی جدائی کا غم ابھی تازہ تھا کہ دل پر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔

دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

مولانا احمد سعید اُجڑی ہوئی دلی کی ایک عظیم الشان یادگار تھے اور اگر یوں کہا جائے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے وہ دلی کی رہی سہی عظمت کا کھنڈر بن کر رہ گئے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔

ان پر مقالہ لکھنے بیٹھا تھا۔ قلم اُٹھایا اور لکھا اور لکھتا ہی چلا گیا اور معلوم نہیں کیا لکھا؟ اور کتنا لکھا؟ یہ منثور مرثیہ مولانا مرحوم کا ہے؟ یا دہلی مرحوم کا؟ یا ماضی مرحوم کا؟ میں فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ بہر حال جو کچھ قلم کی زبان سے نکلا! وہ جذبات کی ترجمانی اور ایک متاع گم شدہ کی کہانی ہے۔

مولانا احمد سعید کا تذکرہ بغیر حضرت مفتی اعظمؒ کے تذکرے کے مکمل نہیں ہوسکتا۔ میرا اندازِ تحریر میرے قدرتی انتساب کا تقاضا تھا۔ مجھے معذور سمجھا جائے۔

ہائے دلی:

دلی کی ہوا کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ مرطوب ہے۔ مگر اب سے بیتے ہوئے سو برس کی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ مرطوب آب و ہوا میں فولادی آئینہ زنگ آلود ہو جاتا ہے اور اس کے جوہر غائب ہو جاتے ہیں لیکن دلی کی ہوا میں پوشیدہ جوہر اُبھرتے ہیں۔ دلی اپنے اندر بھی بے انتہا جوہر رکھتی ہے اور اس کی ہوا جوہر قابل کو صیقل کر کے اُبھارنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ کہاں تک نام شمار کرو گے۔ سو برس کی تاریخ کو جتنا کھنگالو گے لعل و الماس ہی نکلیں گے اور اس کی خاک کو جتنا رول کر دیکھو گے موتی ہی موتی نظر آئیں گے۔ دلی کی خاک نے جہاں حضرت شاہ عبدالعزیز جیسے علماء، مولانا اسماعیل شہید جیسے

مجاہد، غالب وداغ جیسے شاعر، نواب ضیاء الدین احمد جیسے مؤرخ ونساب، حکیم اجمل خاں جیسے طبیب، منشی ذکاء اللہ جیسے ماہر ریاضی، سرسید احمد خاں جیسے مدبر وایثار پیشہ، مفتی صدر الدین خاں جیسے مفتی۔ شاہ محمد اسحاق جیسے محدث پیدا کیے۔ وہاں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ جیسے جوہر قابل کو صیقل دے کر چمکایا۔ مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ جیسے اکابر کو اپنی آنکھوں کا تارا بنایا۔ جوہر شناسی اور قدر افزائی بھی اس اُجڑی ہوئی دلی کا خاصہ ہے۔

دنیا میں ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو اپنے ماحول کی ناسازگاری کے باوجود کارزار حیات میں قدم بڑھاتے ہیں اور آگے بڑھاتے ہی رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ملک و قوم کے ممتاز اکابر کے صف اوّل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی شدید مجاہدات میں گزرتی ہے۔ ان کو بڑی بڑی اذیتوں اور حوادث سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مگر ان کی ہمت کبھی جواب نہیں دیتی اور وہ اپنی ایک شاندار تاریخ اور عظیم الشان کردار چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

زمانہ حاضرہ پر جب ہم نگاہ ڈال کر تجسس کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دلی کی ان مجاہد ہستیوں میں سے جنھوں نے اپنی ذاتی محنت وکاوش سے ایک عظیم الشان کردار پیدا کیا اور دلی کی تہذیبی معاشرتی خصوصیات کو قائم رکھا۔ مولانا احمد سعید کی ہستی ایک آخری نمونہ تھی۔ اس شمع کے گل ہو جانے کے بعد محفل تاریک ہے، فضا اداس ہے اور جگہ خالی ہے۔ معلوم نہیں یہ جگہ کب تک خالی رہے گی اور دلی کی خاک سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا احمد سعید، مسٹر آصف علی، خواجہ حسن نظامی جیسے فرزند کب پیدا ہوں گے۔

لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا.

ایک تاریخی نظم

الوداع مولانا احمد سعید دہلوی

(مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی)

۱۹۳۲ء کے اواخر میں حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ دہلوی اور مولانا احمد سعید دہلوی جمعیت علمائے ہند کے صدر اور سیکرٹری، دونوں بزرگ تحریک سول نافرمانی کے دوسرے دور میں گرفتار ہو گئے۔ گرفتاری کے واقعات الگ الگ پیش آئے تھے، لیکن ملتان سنٹرل جیل میں دوسرے بہت سے سیاسی قیدیوں کے ساتھ انھیں بھی جمع کر دیا گیا۔ رہائی تقریباً ایک مہینے کے وقفے سے عمل میں آئی۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں مولانا احمد سعید رہا ہوئے اور اپریل میں حضرت مفتی اعظم کو رہائی ملی۔

مولانا احمد سعید دہلوی کی رہائی کے موقع پر حضرت مفتی اعظم نے تہنیت میں جو نظم تحریر فرمائی تھی، وہ صرف ایک تاریخی نظم اور شاعری کا ایک حسین مرقع ہی نہیں، مولانا دہلوی کی سیرت کے خصایص، شخصیت کے کمالات اور حضرت مفتی صاحب کے تعلق خاطر اور بے پایاں محبت وشفقت کا آئینہ بھی ہے۔

اس نظم میں فن کی پختگی، فکر کی بلندی، زبان کی سلاست، اسلوب کی دل نشینی، زبان و بیان پر شاعر کی قدرت کی بے شمار خوبیوں کے علاوہ ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ مولانا کی شخصیت، سیرت، اخلاق کے محاسن اور علم وفکر، تحریر وتقریر، مجلس آرائی وخوش بیانی کی خوبیوں کی تصویر کشی میں بہت باریک بینی اور نکتہ آفرینی سے کام لیا ہے۔

جن حضرات نے مولانا کو دیکھا ہے، ان کی صحبت سے فیض اُٹھایا ہے اورر ان کی تصانیف میں ان کے طرزِ نگارش کی شگفتگی اور دل کشی کا نظارہ کیا ہے، وہ اس نظم کی زبان و بیان اور طرز اسلوب کی طرفگی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ حضرت شاعر نے مولانا سے جس شائستگی و نفاست کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کا اظہار فرمایا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

شاعر نے نظم کے آخر میں اپنا نام، تاریخ، پتا وغیرہ بھی درج فرما دیا ہے۔ نظم یہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

چل دیا وہ حال دل سے بے خبر — جان و دل کا ہے سفر جس کا سفر
جس سے وابستہ تھیں میری راحتیں — جانتا تھا میں جسے قلب و جگر
کنج تنہائی کا میرے تھا رفیق — مونس جاں تھا سفر ہو یا حضر
مولوی احمد سعید خوش لقا — واعظ آتش بیاں جادو اثر
شیر دل کان مروت سیر چشم — پیکر صدق و وفا والا گہر
ناظم جمعیتِ اعلامِ ہند — تجربہ کار و امین و باخبر
چھوڑ کر زنداں میں مجھ کو چل دیا — پھیر لی اُنس و محبت کی نظر
تیری فرقت کا تصور الغیاث — الحذر تیری جدائی الحذر
تیرے دم سے قید خانہ باغ تھا — اور ترے اخلاق تھے اس کے ثمر
چونکہ راضی بالقضا تھا اس لیے — قید کا مطلق نہ تھا تجھ پر اثر
تھی بدولت تیرے بزم عیش گرم — جیل میں دن رات اور شام و سحر
ملک تیری دوستوں پر وقف تھی — جان بھی دیتا کوئی لیتا اگر
رعب و ہیبت سے تری اے مرد حق — فوج باطل ہو گئی زیر و زبر
ہیبت حق تیرے چہرے سے عیاں — لرزہ بر اندام تجھ سے شیر نر
یہ حقیقت ہے کہ کرتی ہے تری — خوش بیانی دل میں پتھر کے اثر
بے شبہ ہے تیری تقریر بلیغ — دل نشینی میں کنقش فی الحجر
باغ جمعیت مساعی سے تری — سبز و شاداب و شگفتہ پر ثمر
تیرا دل ہے مال و زر سے بے نیاز — فضل حق پر رہتی ہے ہر دم نظر
دیکھ کر قربانیاں تیری ہمیں — یاد آتے ہیں خلیل نامور
حق ترا حامی ہو اور طالع سعید — اور قدم چومے ترے فتح و ظفر
ہو تری اولاد تیری جانشین — مثل تیرے بلکہ فائق ہوں پسر

کارناموں کو ترے زندہ رکھیں | اور ہر اِک ان میں ہو بہرِ پدر
اور ہو دارین کی آفات سے | فضل مولیٰ واسطے تیرے سپر
موردِ الطاف باری تو رہے | عمر بھر ہر سال ہر شام و سحر
پھولتے پھلتے رہیں تیرے فیوض | صیت ہو تیرا محیط بحر و بر

لطف سے تیرے ہے امید قبول
پیش کش ہے گرچہ میری مختصر

محمد کفایت اللہ عفا اللہ عنہ

اسیر سیاسی اے کلاس، نیوسنٹرل جیل۔ ملتان
بارک نمبر ۱۱ کمرہ نمبر ۴

مورخہ ۱۱ / مارچ ۱۹۳۳ء مطابق ۱۴ / ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ

آہ! مولانا احمد سعید دہلوی

(مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

حضرت سحبان الہند کی وفاتِ حسرت آیات پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے برہان، دہلی میں یہ اداریہ تحریر فرمایا جو دسمبر ۱۹۵۹ء کے شمارے میں شایع ہوا:

......اچانک مولانا حافظ احمد سعید صاحب دہلوی کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ملی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا جمعیۃ العلمائے ہند کے بانیوں میں سے اور اس کے پہلے جنرل سیکرٹری تھے۔ اس حیثیت سے انھوں نے ملک میں دورے کیے اور جگہ جگہ تقریریں کیں۔ یہ زمانہ تحریکِ خلافت کے شباب کا زمانہ تھا۔ مولانا کی تقریروں نے دھوم مچا دی اور بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام تھا۔ دلی کی ٹکسالی زبان بولتے اور اسی میں گھنٹوں خاص لب ولہجہ کے ساتھ تقریر کرتے تھے۔ اس لیے اُن کی گفتگو اور تقریر دونوں اس قدر شیریں اور شگفتہ ہوتی تھیں کہ بس ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی'' قرآنِ مجید کے بہت اچھے حافظ تھے اور اُس کے ساتھ بڑا شغف رکھتے تھے۔ نہایت آسان زبان میں قرآن کا ترجمہ وتفسیر لکھ رہے تھے جو غالباً پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ دینیات پر متعدد کتابیں بھی ان کی یادگار ہیں۔ متعدد بار حریتِ وطن کی راہ میں جیل گئے۔ طبعاً بے حد خلیق، ملنسار، خوش طبع اور بڑے بذلہ سنج بزرگ تھے۔ اگرچہ ادھر دو برس سے جمعیت علما کے صدر تھے لیکن چند در چند عوارض واسقام کے باعث برسوں سے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ دلی سے باہر کے لوگ اُن کی تقریر سننے کو ترستے تھے مگر انھوں نے سفر کرنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ عجب باغ وبہار انسان تھے۔ ان کا فقرہ فقرہ زبان کی لطافت ونفاست کا مرقع ہوتا تھا۔ دلی وہ دلی ہی نہیں رہی ہے۔ اب ایسے بزرگ کہاں ملیں گے؟ کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب اور صدیقین وشہدا کا مقامِ جلیل عطا فرمائے۔ آمین

حصہ دوم:

آثار و نوادرِ ادبیہ و سیاسیہ

ایک مقبول مناجات:

مناجات

منتظر ہیں آنے کی آنکھیں ہماری دیر سے
آنے والے آ! یہ مجمع طالبِ دیدار ہے
جلوہ دکھلا کر تمنا پوری کر دے دید کی
اپنی چشمِ شوق پورے سال سے بیدار ہے
کچھ سنے تو عرض کر دیں دردِ دل کا مدعا
گرچہ قابو میں نہیں دل اور زباں بیکار ہے
سخت طوفاں ہے ہوائیں ہیں خلاف
اس پہ آفت یہ کہ کشتی برسرِ منجدھار ہے
تنگ جینے سے ہوئے ہیں جینے والے اے کریم!
زندگی سے اپنی ہر اِک با حیا بے زار ہے
بخشنے سے گر گناہوں کے تجھے کچھ عذر ہے
پھر بتا جائیں کہاں وہ کون سی سرکار ہے
پھیر جا اپنی معافی کا قلم بس پھیر جا
کہنے والا کہہ گیا ہے تو مری سرکار ہے!

ایک یادگار نظم

مولانا احمد سعید دہلوی کی ایک تاریخی نظم جس میں انھوں نے اپنے رفقائے زنداں کی رہائی پر اپنے جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔

زندہ کرتے ہوئے اسلاف کا تم نام چلے — ہو مبارک تمھیں تم جیل سے خوش کام چلے
سختیاں قید کی جھیلی ہیں خوشی سے تم نے — کون کہتا ہے کہ تم قید سے ناکام چلے
تم چلے خانۂ صیاد کو ویراں کر کے — شکر اللہ کا تم جیل سے خوش کام چلے
سیٹھ نورنگ چلے اور چلے گوبند سرن — گوری شنکر چلے اور عارف خوش کام چلے
چھوڑ کر چل دیے زنداں میں ہمیں اسماعیل — پر خوشی ہے ہمیں اس کی کہ وہ باکام چلے
منشی عبدالقدیر اور گلاب اور امیر — باغ میں جتنے تھے چوٹی کے وہ سب آم چلے
چھوڑ کر مجھ کو چلے جیل میں تنہا عارف — چھوڑ کر ہائے مجھے گوری گلفام چلے

قیدیوں میں ہوا جانے سے تمہارے شیون
ڈال کر جیل میں تم کیسا یہ کہرام چلے

غزل

زندگی سے اپنی گھبرا کر چلے
گھر سے آئے تھے پلٹ کر گھر چلے

بات میری خاک تم سن کر چلے
سیکڑوں الزام مجھ پر دھر چلے

تھا خلاصہ زندگی کا اس قدر
شام آئے شب سے پہلے گھر چلے

ساقیا! ظاہر ہو یوں شانِ کرم
میکدے سے جو چلے پی کر چلے

خشک لب میرے رہے پیشِ نظر
میکدے میں جب مہ و ساغر چلے

تیرے صدقے اے شہِ لطف و کرم
ہاتھ خالی آئے دامن بھر چلے

لوگ جب میت مری لے کر چلے
میرے ارماں نوحہ گر بن کر چلے

ایسے آنے سے نہ آنا خوب تھا
شام آئے شب سے پہلے گھر چلے

مقصد اپنا ہو گیا پورا اسیر
مرنے آئے تھے کسی پر مر چلے

ایک یادگار مضمون

اُن کی جدائی

تاثرات سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب صدر جمعیت علمائے ہند
(بروفات امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ)

مولانا ابوالکلام آزاد صرف علوم مذہبی کے تبحر اور ایک جلیل القدر بلند پایہ عالم ہی نہ تھے بلکہ میدان سیاست کے بھی وہ ایک بہترین شہ سوار تھے، امور سیاست میں وہ نہایت مدبر اور انتہائی دور اندیش مفکر اور معاملہ فہم واقع ہوئے تھے۔ اُن کو تمام ایشیا کی سیاست سے بڑی گہری دلچسپی تھی۔ ان کو قدرت نے بڑی بصیرت اور فہم صحیح عطا فرمایا تھا۔

ہندوستان کی حکومت میں اُن کا بڑا پایہ تھا وہ اس حکومت کے وزیر تعلیم ہی نہ تھے بلکہ وزیراعظم ہند کے دست راست اور اُن کے بازوؤں کی قوت تھے۔ اُن کے مفید مشورے پوری حکومت کے لیے رہنمائی کا کام کرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے اُلجھے ہوئے معاملات کو اپنے خداداد تدبر اور ہوشمندی و دانشمندی سے سلجھا دیا کرتے تھے۔ وہ سیاسی سوجھ بوجھ میں بے مثل اور بے نظیر تھے۔ وہ ادب میں ایسے بے مثل ادیب تھے کہ اُن کی تقریر و تحریر کا جواب ان کی زندگی میں کسی دوسرے انسان سے بن نہ آ سکا۔ اُن کے کلام میں ایسی جدید اور انوکھی بندشیں تھیں جو صرف ان ہی کا حصہ تھا اور قدرت نے اس انوکھے طرز تعبیر کو اُن کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ بہرحال وہ ادب، سیاست اور مذہب کے بہترین اور بے مثل شناور تھے، اب دنیا اس شہ سوار علم و فن کو مدتوں روتی رہے گی اور اس کا کوئی دوسرا ہمسر نہ پا سکے گی۔ میدان جنگ میں اُن کے جنگی تھپیڑوں نے لارڈ ویول اور لارڈ اردن کو عاجز اور درماندہ کر دیا تھا۔

وہ ان تمام علمی ادبی اور سیاسی خوبیوں کے ساتھ انتہائی خوش طبع اور انتہائی خوددار تھے۔ خوش طبعی بھی اُن کی ادب اور جدید بندشوں سے لبریز ہوتی تھی وہ اپنی رائے ظاہر کرنے میں کبھی جھجکتے نہ تھے۔

وہ ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں صدر مقرر ہوئے جس میں اُنھوں نے ہندوستان کے علماء کو ایک بصیرت افروز اور فصیح و بلیغ خطبہ صدارت دیا۔ میں اس زمانہ میں ایک سال کی قید کاٹ رہا تھا اور میاں والی جیل میں اسیر تھا۔ میرے اُن کے تقریباً بارہ تیرہ سال سے مخلصانہ تعلقات تھے۔ سب سے پہلی ملاقات میری اُن سے خواجہ حسن نظامی مرحوم کے دفتر نظام المشائخ میں ہوئی۔ اس زمانہ میں احقر ملا واحدی صاحب کے مکان پر تھا۔

خلافت کے دور میں ایک جلسے کی جب وہ صدارت فرما رہے تھے میں نے تقریر کی تھی یہ جلسہ شاید بریلی میں ہوا تھا۔ کلکتہ میں کئی مرتبہ اُن کی مہمان نوازی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اُن پر مختلف دور گزرتے رہے اور میں نے اُن کو ہر حال میں صابر اور شاکر پایا۔

اُن کا ذوق ادب اور اُن کی خوش طبعی کسی حال میں فرق محسوس نہیں ہونے دیتی تھی۔ آخری ملاقات اُن کی وفات سے چھ روز پہلے ہوئی تھی۔ جب وہ اُردو کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ اُس دن یہ خیال بھی نہ تھا کہ آج سے ساتویں دن اُن کی میت اسی میدان میں ٹھیک تقریر کے وقت دفن ہوگی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور مقام صدق اور جوار رحمت سے اُن کو نوازے۔ آمین!

(الجمعیۃ۔ دہلی مولانا آزاد نمبر)

ایک تاریخی فتویٰ:

ترک موالات — ایک فتویٰ

ذیل کے استفتاء کا جواب بہ قلم حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ مفتی و شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی اور مولانا محمد شفیع مدرس مدرسہ مولوی عبدالرب صاحب دہلی کی تصدیق کے بعد مولانا احمد سعید دہلوی ناظم جمعیت علمائے ہند کی تحریر و تصدیق سے فتویٰ مزید مدلل و موثق ہوگیا۔ ذیل میں یہ استفتاء اور مولانائے دہلوی کا فتویٰ درج کیا جاتا ہے۔

استفتاء:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ حالات حاضرہ پر نظر کرتے ہوئے گورنمنٹ سے ترک موالات اسلامی حکم ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کے دلائل کے ساتھ بیان فرمادیں۔ نیز یہ کہ کیا ترک موالات کا اثر مسئلہ تعلیم پر بھی پڑتا ہے اور اس کا بائیکاٹ کرنا بھی فرض ہے یا نہیں؟

جواب:

قرآن شریف میں متعدد جگہ موالات کو حرام فرمایا ہے۔ بعض اصحاب موجودہ زمانے میں موالات کا صرف افعال قلب سے تعلق سمجھتے ہیں اور موالات کے معنی میں اتنا عمل کافی جانتے ہیں کہ دل سے محبت نہ کرے لیکن یہ محض لغو اور کورانہ خیال ہے۔ ایک کلمہ گو مسلمان کافر سے دلی محبت اگر کرے تو وہ مسلمان ہی نہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دل سے نفرت کرنے کے علاوہ ترک موالات کا افعال جوارح پر کیا اثر ہونا چاہیے۔ ایک شخص دل سے تو نفرت کرے لیکن ظاہر میں

ایک تاریخی فتویٰ:

ترک موالات ــــ ایک فتویٰ

ذیل کے استفتاء کا جواب بہ قلم حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ مفتی و شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی اور مولانا محمد شفیع مدرس مدرسہ مولوی عبدالرب صاحب دہلی کی تصدیق کے بعد مولانا احمد سعید دہلوی ناظم جمعیت علمائے ہند کی تحریر و تصدیق سے فتویٰ مزید مدلل و موثق ہو گیا۔ ذیل میں یہ استفتاء اور مولانائے دہلوی کا فتویٰ درج کیا جاتا ہے۔

استفتاء:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ حالات حاضرہ پر نظر کرتے ہوئے گورنمنٹ سے ترک موالات اسلامی حکم ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کے دلائل کے ساتھ بیان فرمادیں۔ نیز یہ کہ کیا ترک موالات کا اثر مسئلہ تعلیم پر بھی پڑتا ہے اور اس کا بائیکاٹ کرنا بھی فرض ہے یا نہیں؟

جواب:

قرآن شریف میں متعدد جگہ موالات کو حرام فرمایا ہے۔ بعض اصحاب موجودہ زمانے میں موالات کا صرف افعال قلب سے تعلق سمجھتے ہیں اور موالات کے معنی میں اتنا عمل کافی جانتے ہیں کہ دل سے محبت نہ کرے لیکن یہ محض لغو اور کورانہ خیال ہے۔ ایک کلمہ گو مسلمان کافر سے دلی محبت اگر کرے تو وہ مسلمان ہی نہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دل سے نفرت کرنے کے علاوہ ترک موالات کا افعال جوارح پر کیا اثر ہونا چاہیے۔ ایک شخص دل سے تو نفرت کرے لیکن ظاہر میں

اعداء دین کی معاونت کرے، جس کا نتیجہ تخریب دین وشوکت اسلام ہوتو کیا ایسا شخص معاون اثم وعدوان نہیں اور کیا ایسا شخص مستحق لعنت نہیں۔ اگر آیتوں کو محض جہال کی تاویل پر عمل کیا جائے تو پھر تو وہ مسلمان جنہوں نے کافروں کی طرف سے مسلمانوں کو قتل کیا اور مسلمانوں کے حق کا خون کیا یا حرم اور مقامات مقدسہ پر گولہ باری کی۔ وہ سب مسلمان ہوں گے۔ معاذ اللہ یہ کس قدر کلام ربانی کی تحریف ہے۔ دین کیا ہوا، دین کا مذاق ہو گیا۔ کافروں اور اسلام کے دشمنوں کے ساتھ مل کر سب کچھ کرلیا اور کہہ دیا میں کافروں سے دلی نفرت کرتا ہوں۔ حالانکہ قرآن کریم کا صاف ارشاد ہے۔ الا تقاتلون قوماً نکثوا ایمانهم الخ (سورہ توبہ:۱۳) یعنی ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جو اپنے پختہ وعدوں کو توڑ دیتے ہیں۔ غضب خدا کا یہاں بجائے مقاتلہ کے موالات ہو رہی ہے۔ اسی طرح والمحصنٰت میں ارشاد ہے۔ و مالكم تقاتلون فی سبیل الله والمستضعفین من الرجال والنساء ولوالدان الخ (سورہ نساء:۷۵) یعنی جو لوگ کافروں کی قید میں ہیں ان کی مدد کیوں نہیں کرتے اور کافروں سے لڑکر اُن مجبوروں کو آزاد کیوں نہیں کراتے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ اس وقت معزز ترکی افراد مالٹا میں قید ہیں۔ کون بدنصیب عالم اس سے انکار کرے گا کہ خود ولی عہد خلافت عثمانیہ نگرانی میں ہیں۔ تو کیا اس وقت صرف ہم پر مذہبی فرائض اسی قدر عائد ہوتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے محبت نہ کریں۔ نعوذ بالله من شرور انفسنا۔ اگر موالات کے معنی قلبی دوستی کے ہیں تو ان عالم نما جہلا سے پوچھو کہ قلبی دوستی تو تیرہ سو برس سے حرام ہے۔ قلبی دوستی تو مسلمان کفار حلفاء سے بھی نہیں کرسکتا۔ مسلمان کتنے ہی عروج پر کیوں نہ ہو ہر وقت کافر سے قلبی دوستی حرام ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس تنزل اور تباہی و بربادی کے وقت میں ہم پر کیا فرض زیادہ ہوا۔ موجودہ اعدائے اسلام سے ہمارا برتاؤ کیا ہونا چاہیے۔ خدا کے واسطے آیات قرآنی میں تحریف نہ کرو۔ قرآن کا صاف مطلب یہ ہے کہ اعدائے اسلام سے کوئی تعلق جس میں اعانت وامداد کا شائبہ بھی ہو قطعاً حرام ہے۔

اب رہا تعلیم کو موالات سے مستثنیٰ کرنا یہ سخت ترین حماقت ہے۔ کیونکہ سب سے بڑی معاونت دشمنانِ کالجوں کی دین کی ملازمت ہے اور ملازمت سرکار کا اصلی سبب سکولوں اور

کالجوں کی تعلیم اور یونیورسٹی کی ڈگریاں ہیں۔ پس اگر ملازمت حرام ہے تو یقیناً ذریعۂ ملازمت بھی حرام ہوگا۔ مسلمان سرکاری ملازمت سے جب ہی محفوظ رہ سکتے ہیں کہ ان کو اس تعلیم سے بچالیا جائے کہ جس کی وجہ سے ملازمت کرنے کے قابل ہوں اور یہ مسئلہ بالکل قطعِ ید کی طرح ہے کہ سارق کا ہاتھ ہی کاٹ دو۔ تاکہ وہ چوری نہ کر سکے۔ جراح اس عضو ہی کو قطع کر دے جو تمام بدن میں زہریلا مادہ نہ سرایت کر سکے۔ بس میری رائے میں مسلمانوں پر ترک موالات فرض ہے اور ان کو اس فریضہ پر عمل کرنے کے لیے فوراً سرکاری تعلیم سے علیحدہ ہونا قطعاً فرض ہے۔ واللہ اعلم بالصواب وعندہ علم کتاب۔

(بندہ حقیر احمد سعید ناظم جمعیۃ علماے ہند)

ایک تاریخی رسالہ:

مختصر حالات......انعقاد جمعیت علماے ہند

نومبر ۱۹۱۹ء کی آخری تاریخوں میں خلافت کانفرنس کے جلسے کی تقریب سے تمام اقطار ہند کے علما کی ایک معتد بہ جماعت دہلی میں جمع ہوگئی تھی۔ خلافت کانفرنس کے اجلاسوں سے فارغ ہونے کے بعد تمام علماے موجودین نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ جس میں صرف حضرات علما ہی شریک ہوئے۔ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب کی تحریک اور مولانا منیر الزماں صاحب و دیگر حاضرین کی تائید سے جناب فاضل علامہ حضرت مولانا مولوی محمد عبدالباری صاحب اس جلسے کے صدر قرار پائے اور مولانا کی اجازت سے حسب ذیل کارروائی شروع ہوئی۔

جشن صلح میں شرکت کے متعلق مذہبی نقطہ نظر سے بحث مباحثہ کے بعد متفقہ طور پر وہ فتویٰ مرتب کیا گیا جو انجمن اشاعت اختلاف جشن صلح دہلی کی طرف سے طبع ہوکر شایع ہو چکا ہے۔ تمام علماے حاضرین جلسہ نے بلا اختلاف اس پر اپنے اپنے دستخط فرما دیے اور اس اجتماعی حکم کا جو اثر اہل ملک پر ہونا چاہیے تھا، وہ خدا کے فضل و کرم سے بہ خوبی ظاہر و روشن ہوگیا۔

اسی جلسے میں یہ بات بھی زیر بحث آئی کہ ہندوستان کے مختلف گروہوں اور مختلف اقوام کی متعدد انجمنیں قایم ہو چکی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں جو متفقہ کوشش اور قوت اتحادی سے بہت کچھ ملک و قوم کی خدمت کرتی ہیں اور اتفاق و اتحاد کی برکات سے خود بھی متمتع ہوتی ہیں اور قوم کو بھی فایدہ پہنچاتی ہیں لیکن آج تک علماے ہند کی کوئی متفقہ جماعت یا انجمن قایم نہیں ہوئی اور بعض انجمنوں نے اس کی کوشش بھی کی تو وہ کچھ زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ کیوں کہ خیالات کا اختلاف اوّل تو انسان کی طبعی بات ہے۔ دوسرے مذہبی طبقے میں اختلاف چوں کہ

مذہبی رنگ پکڑ جاتا ہے، اس لیے اس کا دفعیہ اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی غیر مذہبی گروہ کے افراد میں اگر اختلاف ہو تو فریق مغلوب اگر چہ اپنے خیال کو صحیح بھی سمجھتا رہے، لیکن بہ وجہ اس کے کہ اس کے خلاف کثرت رائے سے فیصلہ ہو گیا ہے وہ بغیر کسی پس و پیش کے اس فیصلے پر عمل کر سکتا ہے، لیکن مذہبی گروہ میں اگر ایسا اختلاف ہو تو فریق مغلوب سوائے ایسی صورت کے کہ اس کو اپنے خیال اور رائے کی غلطی کا یقین ہو جائے کسی صورت میں اپنے اعتقاد و یقین کے خلاف عمل کو جائز نہیں سمجھتا۔ اگر چہ اس کے اعتقاد کے خلاف کتنی ہی زیادہ تعداد کے لوگ رائے دیتے ہوں۔ یہ ایک ایسا مرحلہ تھا کہ اس کا حل کوئی آسان کام نہیں تھا۔

تاہم بحث و مباحثہ کے بعد تمام علمائے حاضرین نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ علما کی جماعت بھی ایسے امور میں جو تقریباً تمام مذہبی فرقوں میں متفق علیہ ہیں، متفقہ طور پر شریک ہو کر کام کر سکتی ہے اور بہ اقتضائے زمانہ اسی صورت سے مذہبی وقار اور علمی شوکت قایم رہ سکتی ہے کہ علما اپنی ایک مضبوط اور مقتدر جمعیت قایم کریں اور صرف مشترکہ مذہبی و سیاسی امور میں عامۂ اہل اسلام کی رہنمائی کا فرض ادا کریں۔ ان کی آواز اسی وقت باوقعت آواز ہوگی جب کہ وہ ایک باقاعدہ منظم جماعت کی طرف سے بلند ہو اور ان کی تعلیم و رہنمائی کی تکمیل اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ یہ اسے اتفاق و اتحاد کی قوت سے مؤثر بنائیں۔

یہ ایسے امور تھے کہ ان کی معقولیت میں کسی کو کلام کرنے کی گنجایش نہ تھی۔ اس لیے تمام حاضرین جلسہ نے بہ اتفاق طے کر لیا کہ ایک جمعیت قایم کی جائے اور اس کا نام جمعیت علمائے ہند رکھا جائے۔ اس کے حلقے کو تمام ہندوستان کے لیے وسیع کر دیا جائے اور ہر گوشۂ ملک سے اس کے ارکان و اعضا بہم پہنچائے جائیں اور عامۂ اہل اسلام کی فلاح و بہبود کے ذرائع و وسائل پر غور کر کے سچی مذہبی خیر خواہی اور ہمدردی کے ساتھ ان کی رہنمائی کی جائے۔

چناں چہ اسی وقت تمام حاضرین نے جمعیت کی رکنیت منظور فرمائی اور جمعیت علمائے ہند قایم ہو گئی اور قرار پایا کہ آیندہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں مسلم لیگ کے اجلاس امرتسر میں ہونے والے ہیں اور مسئلہ خلافت و مسایل ٹرکی پر بحث کرنے کے خیال سے علمائے اسلام کی ایک معقول تعداد وہاں جمع ہوگی، اس لیے مناسب ہے کہ اس موقع پر جمعیت علمائے ہند کا جلسہ

بھی کیا جائے اور ابتدائی مراحل طے کر لیے جائیں۔ مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب امرتسری و مولوی سید محمد داؤد صاحب نے جمعیت علمائے ہند کے موجود اراکین کو امرتسر میں تشریف لانے کے لیے اسی وقت دعوت دے دی اور بالاتفاق طے ہو گیا کہ جمعیت کا جلسہ آیندہ دسمبر میں بہ مقام امرتسر منعقد ہوگا۔

مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب نے تحریک کی کہ جمعیت علمائے ہند کے لیے بالفعل کوئی عارضی صدر اور عارضی ناظم مقرر کر لیا جائے تاکہ امور ضروریہ کے انصرام کی ایک آسان سبیل میسر ہو جائے اور صدارت کے لیے میں مولانا مولوی محمد کفایت اللہ صاحب کا نام اور نظامت کے لیے مولانا حافظ احمد سعید صاحب کا نام پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ مولانا مولوی محمد کفایت اللہ صاحب نے قبول صدارت سے بہت کچھ عذر کیا۔ لیکن حضرات حاضرین نے اس تحریک کو، جس کی تائید مولانا سلامت اللہ صاحب، مولانا مظہر الدین صاحب، مولانا محمد اکرم خاں صاحب و دیگر علماء کر چکے تھے منظور کر دیا اور بالآخر مولانا کو بھی منظور کرنا پڑا اور مولانا حافظ احمد سعید صاحب نے بھی نظامت قبول فرمائی۔ اس کے بعد بہ اتفاق حاضرین مولانا محمد اکرم خاں صاحب ایڈیٹر اخبار محمدی، مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اس کام کے لیے منتخب کیے گئے کہ جمعیت کے مقاصد وضوابط کا مسودہ تیار کریں اور جمعیت کے آیندہ دسمبر میں منعقد ہونے والے جلسے میں بہ مقام امرتسر پیش کریں۔ اس کے بعد دعائے خیر و برکت پر جلسہ برخاست ہوا۔

دہلی کے اس جلسے میں علمائے ذیل موجود تھے:

حضرت مولانا عبدالباری صاحب	مولانا سلامت اللہ صاحب
مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب	حضرت پیر محمد امام صاحب سندھی
مولانا اسد اللہ صاحب سندھی	مولانا سید محمد فاخر صاحب
مولانا مولوی محمد انیس صاحب	مولانا خواجہ غلام نظام الدین صاحب
مولانا محمد کفایت اللہ صاحب	مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی
مولانا حافظ احمد سعید صاحب دہلوی	مولانا سیّد کمال الدین صاحب
مولانا قدیر بخش صاحب	مولانا تاج محمود صاحب

مولانا محمد ابراہیم صاحب دربھنگہ
مولانا مولابخش صاحب امرتسری
مولانا محمد اکرم صاحب
مولانا محمد صادق صاحب
مولانا سیّد محمد اسماعیل صاحب
مولانا آزاد سبحانی صاحب

مولانا خدابخش صاحب مظفر پوری
مولانا عبدالحکیم صاحب گیاوی
مولانا منیرالزماں صاحب
مولانا سید محمد داؤد صاحب
مولانا محمد عبداللہ صاحب

چند منتخب مکاتیب

(۱)

چودھری خلیق الزماں (لکھنؤ)

(یوپی میں لیگ کانگریس اختلاف اور وزارت سازی کے پس منظر میں ایک تاریخی خط)

بازار بلی ماران۔ دہلی

۹/اگست ۱۹۳۷ء

محترم چودھری صاحب!

السلام علیکم! آپ کے مفصل گرامی نامے کا شکریہ۔ مجھے تو اپنے دوستوں سے یہ شکوہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کی خاطر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کی خاک چھانی تھی ان دوستوں نے منتخب ہونے کے بعد اپنے ان خدام کو فراموش کر دیا۔ مسٹر جناح ایگریکلچرل پارٹی کو ما!نے اُٹھے تو انہوں نے بات نہیں کی اور ہمارے بعض خود غرض دوست منسٹری اور اسپیکری کے لیے کانگریس سے سمجھوتہ کرنے اُٹھے تو انہوں نے نہ پوچھی۔ میری ذمہ داری دیکھیے کہ جملہ رفقاء سے برائی اُٹھا رہا ہوں لیکن ہر ایک سے یہی کہتا ہوں کہ مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرو۔ الٰہ آباد میں میں نے جو کچھ کیا، اس سے بھی آپ غافل نہ ہوں گے اور میرے دوستوں نے جو سلوک میرے ساتھ کیا اس کا بھی آپ کو علم ہوگا لیکن بایں ہمہ میں اپنی رائے پر قائم ہوں۔ اگر حافظ محمد ابراہیم صاحب کا معاملہ درمیان میں نہ آجاتا تو شاید میں اپنی جماعت کو اپنا ہم خیال رکھ سکتا۔

بہر حال مفصل باتیں تو عندالملاقات ہوں گی۔ آپ کی لیگ سمجھوتہ نہ کرے گی اور نہ اس سے کچھ ہوگا۔ اگر لیگ کسی قابل ہوتی تو آج مسلمانوں کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

ہاں! یہ تو فرمایئے کہ اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے کہ اگر آپ کے لیے اور نواب اسماعیل خان کے لیے کوئی جگہ نکل آتی تو آپ کا کانگریس سے سمجھوتہ ہو جاتا؟ کانگریس ایک منسٹری تو نکال لینے کے لیے تیار تھی لیکن آپ نواب صاحب کو چھوڑنا نہ چاہتے تھے اور ان کے لیے کوئی موقعہ نہ تھا۔ اس لیے صلح ناکام رہی اور کیا یہ بھی سچ ہے کہ رفیع احمد قدوائی، جن کی آپ نے پوری امداد کی اور ان کے مقابلہ سے احتراز کیا تھا۔ انہوں نے بھی آپ کے ساتھ غداری کی؟ میں ممنون ہوں گا، اگر آپ مہربانی فرما کر مجھے صحیح معلومات بہم پہنچائیں گے۔''

فقیر احمد سعید

گلی قاسم جان، دہلی

حوالہ:

شاہراہِ پاکستان، مصنفہ چودھری خلیق الزمان: ص ۳۱-۶۲۹

(۲)

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

صدر مجلس احرار اسلام

(۱)

دفتر جمعیت علمائے ہند
گلی قاسم جان، دہلی نمبر ۶
۲۵/اپریل ۱۹۳۸ء

محترم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب!

السلام علیکم! آپ کو معلوم ہے، کہ اڑہائی ماہ کے بعد برما سے واپس ہوا۔ یہاں پہنچ کر تبادلۂ خیالات کا موقعہ نہ ہوا تھا کہ آپ گرفتار ہو گئے۔ اچھا ہوا کہ آپ کی ضمانت ہو گئی۔ یہاں کی پارٹی میں جو صورتِ حال درپیش ہے، وہ آپ کو معلوم ہے۔

ذاتی اغراض اور ذاتی منافع کے پیش نظر یا جماعتی وقار یا استحکام کے مدنظر مختلف کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔ مسلم لیگ اور کانگریس کی باہمی کشمکش کے مقابلہ میں فلسطین کی فکر ہے نہ عرب کی۔ انگریز نے ایک ایسا خوش ذائقہ لقمہ ڈال دیا ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں مبتلا ہے۔

آپ مقدمہ کو چلنے دیجیے۔ میں کل آٹھ یوم کے لیے ڈابھیل اور راندھیر جا رہا ہوں۔ واپسی پر انشاء اللہ پہلی ٹرین سے لدھیانہ حاضر ہوں گا۔ آپ سے زبانی باتیں کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کروں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر آپ کے لدھیانہ سے باہر جانے پر پابندی نہ ہو تو آپ کو دہلی بلا لوں گا۔ بہر حال تبادلہ خیال کی ضرورت ہے۔ والسلام

فقیر احمد سعید

(۲)

۲۹/اپریل ۱۹۳۸ء

محترم مولانا!

السلام علیکم! بہار سے واپسی پر مفصل خط ملا۔ آپ کو معلوم ہے ہندوستان میں انقلاب کی

خواہش کا بہت بڑا منبع یہ تھا کہ ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچے گا اور وہ سب آزاد ہو جائیں گے۔ انہی جذبات کے تحت ہر قسم کی جد وجہد کی گئی تھی لیکن بیس سالہ محنت کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ انگریز کی قوت بحالہ موجود ہے۔ ممالکِ اسلامیہ کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ سرحدی مسلمان، فلسطین کے مسلمان، عرب اور ہند کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ انگریز سے جنگ یا مسلمانوں کی امداد یا ملک کی آزادی صرف زبانوں پر ہی رہ گئی ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے وزارتیں ہیں اور عہدے ہیں اور ناقص آئین کو چلانا ہے۔ انگریز کی پوزیشن بالکل محفوظ ہے۔ اگر کوئی حرکت کرنے کا خیال بھی آتا ہے تو مسٹر پنتھ اور سکندر کی وزارتیں سامنے آ جاتی ہیں۔ ان حالات میں آپ ہی فرمائیں کیا کیا ممکن نہیں۔

یہ آپ نے خوب کہا کہ کانگریس کا حقیقی علاج لیگ ہے۔ یہ صحیح ہے، علاج تو ایسا ہے، جیسے سانپ کا علاج نیولہ لیکن آپ درمیان نہ آئیں تو بات ہے۔ آپ حکیم جی کو صحیح علاج کہاں کرنے دیتے ہیں۔ بلکہ جب علاج کرنا چاہتا ہے جب ہی آپ اور ہم درمیان میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔'' والسلام

فقیر احمد سعید

دفتر جمعیۃ علمائے ہند۔ گلی قاسم جان۔ دہلی

(کاروانِ احرار ج ۳)

(۳)

مولوی عبدالاوّل

(۱)

مولانا محترم المقام عبدالاول صاحب

السلام علیکم! بھائی اس کام کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔ یہ کام تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کرا سکتے ہیں۔ میں حکیم محمود الحسن صاحب کے لیے کوشش کر رہا ہوں اور اس میں اب تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس میں کوئی کامیابی کی اُمید ہو تو حکیم مشتاق صاحب کا ذکر بھی کروں۔ بہر حال آپ کوشش جاری رکھئے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا۔ حافظ صاحب قبلہ سے دعا کی درخواست کیجیے۔ آپ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ضرور رجوع کیجیے۔ والسلام

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۸ جنوری ۱۹۵۸ء

(۲)

محترم مولانا صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم! آپ کا خط موصول ہوا۔ پنڈت جی سے ملاقات مشکل ہے۔ مولانا آزاد دفعتاً علیل ہو گئے۔ کام میں تعویق ہو گئی۔ دعا کی ضرورت ہے۔ والسلام

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۲۰ فروری ۱۹۵۸ء

(۳)

محترم مولوی عبدالاول صاحب!

السلام علیکم!

خیریت نامہ نمبر ۲۴۲ پڑھ کر آ گاہی ہوئی۔ الحمدللہ تعلیم کا کام کرتے رہیے یہ ذریعۂ نجات ہے۔ علالت کا حال پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عاجلہ عطا فرمائے۔ دیگر کارِلائقہ میں یاد رکھیں مقصد کام ہونا چاہیے۔ نام کی ضرورت نہیں۔ حاجی محمد اسماعیل صاحب کی خدمت

میں میرا اسلام عرض کردیں۔ والسلام

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۱۹/مئی ۱۹۵۸ء

(۴)

محترم المقام مولوی عبدالاول صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم! آپ یا تو بیمار تھے یا ایک دم کراچی پہنچ گئے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ آپ کا معین و مددگار ہو اور آپ کو صحت عاجلہ عطا فرمائے۔ اپنے میزبان حافظ جمیل احمد صاحب کی خدمت میں میرا اسلام عرض کردیجیے۔

حافظ جمیل احمد صاحب سے فرمادیں کہ میاں دہلی میں جب تک تھے جب تو خیر ستاتے ہی تھے لیکن کراچی پہنچ کر بھی اپنی بے مہری سے باز نہ آئے اور کسی آتے جاتے کے ہاتھ مربے یا اچار کا ایک ڈبہ بھی تم کو بھیجنا نصیب نہیں ہوا۔ والسلام

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۱۱/اپریل ۱۹۵۹ء

(۴)

ملا واحدی صاحب (کراچی)

(۱)

محترم واحدی! سلام مسنون

ارے میاں! وہ اسماعیل چوئی کو تو آپ بھی جانتے ہوں گے سوئی والان میں رہتا تھا، لوگ ایسے ہی کاموں کے لیے اس کو استعمال کیا کرتے تھے[۱]۔ امام صاحب[۲] جامع مسجد کا کرایہ بھی وصول کیا کرتا تھا اور شوکت مرزا نے جامع مسجد کی تھڑی[۳] کا کرایہ بھی وصول کرنے کے لیے اسے رکھ چھوڑا تھا، مغلوب الغضب آدمی ہے، پہلے کوکین بیچا کرتا تھا، اسی نالائق کو کسی نے میرے لیے استعمال کرلیا، بہر حال الحمدللہ زندہ ہوں، تشویش کی کوئی وجہ نہیں، زخم بتدریج مندمل ہو رہا ہے، بڑھاپے کا زخم وہ بھی ڈیڑھ انچ گہرا اور تین انچ لانبا، بھرتے بھرتے ہی بھرے گا، آپ کی مخصوص دعاؤں کا محتاج ہوں، جملہ پرسان حال کی خدمت میں سلام مسنون۔

آپ سے اگر ہو سکے تو میاں علی نظامی[۴] کا پتہ مجھے لکھ بھیجئے ان کا تار آیا ہوا ہے اور میں جواب نہیں دے سکتا، آپ نے جا کر اور خواجہ صاحب[۵] رحمہ اللہ نے مر کر دہلی کو رہا سہا ختم کر دیا۔

میرا دلی پن کا اور میں کیا اور کئے دن کا، ادھر بیخود صاحب[۶] بستر پر پڑے ہیں، اللہ تعالیٰ دہلی والوں پر رحم فرمائے، دہلی کہاں ہے۔ بازار اور گلیاں اور کوچے وہی ہیں لیکن رہنے والے سب ہی تو آپ کی دعا سے اجنبی ہیں۔ کوئی ٹوٹا پھوٹا مسلمان کبھی آ نکلتا ہے یا پرانا ہندو آ جاتا ہے تو سمجھتا ہوں، اوہو! میں دہلی میں رہتا ہوں، ورنہ یقین جانیے دلی کے بازاروں پر پنجاب کے شہروں کا شبہ ہوتا ہے۔ بہت دل کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ دلی کی سڑکیں ہیں۔ مگر آنکھیں دل کا ساتھ نہیں دیتیں، اچھا میرا اسلام قبول کیجیے، خدا تعالیٰ آپ کو خوش رکھے، پرسان حال کو بھی اگر ہو سکے تو سلام کہہ دیجیے۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

کوچہ چیلان دہلی

۱۷-۹-۵۵ء

حواشی:

۱- اسماعیل چوئی نے مولانا احمد سعید صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا تھا، اس کی طرف اشارہ ہے۔

۲- شمس العلماء مولوی سید احمدؒ۔

۳- سڑکوں کے کنارے یا فٹ پاتھوں پر لوگ تھوڑا بہت سامان تجارت لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اسے تھڑی لگانا کہتے ہیں، جامع مسجد کے چبوتروں والی کپڑا مارکیٹ کی ابتدا تھڑوں سے ہوئی تھی، اس لیے مارکیٹ کا نام آخر تک تھڑی ہی رہا۔

۴- حضرت خواجہ حسن نظامی کے منجلے صاحبزادے جو کراچی میں سکونت پذیر ہیں اور کوئٹہ میں کاروبار کرتے ہیں۔

۵- حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم۔

۶- مشہور شاعر وحید الدین بیخود دہلوی۔

یہ تمام حواشی مکاتیب کے مرتب سید ضمیر حسن دہلوی کے قلم سے ہیں۔(ا۔س۔ش)

(۲)

محترم ومکرم ملا واحدی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم! زخم کی وجہ سے بیٹھا نہیں جاتا، بڑے بڑے خطوط کا جواب لکھا کرتا ہوں، زخم بائیں کولہے میں ہے، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد جو حالت (دلی کی) ہوئی تھی، ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے وہ بہت خراب ہوگئی اور بھی بات یہ ہے کہ پرانے اور تعلیم یافتہ اور دولتمند سب ہی تقریباً چلے گئے، کارخانہ دار قسم کے لوگ رہ گئے ہیں، اچھے اُنگلیوں پر گننے کے قابل ہیں۔ اس کو (اسماعیل چوئی کو) کیا سوجھی؟ میں تو سمجھتا ہوں اس کو سوجھائی گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آمادہ بقتل من آں شوخ ستمگارے

ایں طرفہ تماشا بیں ناکردہ گنہگارے

اس تسکین کے لفظ پر آپ کے، مجھے غالب کا ایک شعر یاد آ گیا ع

دل مایوس را تسکین بمردن می تواں دادن
چہ اُمید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ موت کے تصور سے تسکین تو حاصل کر لیتے ہیں۔

آپ کا مضمون اگر میں چھپنے سے پہلے دیکھتا تو اس میں اگرچہ گستاخی ہوتی مگر ترمیم ضرور کرتا، دہلی تو مولانا حالی کے زمانہ ہی میں مرحوم ہو چکی تھی۔ آپ تو چالیسواں یا برسی کرنے والوں میں سے ہیں، مولانا حالی سے اللہ میاں کے ہاں ملاقات ہو تو یوں فرمائیں کہ آپ کے زمانہ میں دہلی مرحوم تھی۔ اس کی آخری رسوم اور اس کا چالیسواں اور برسی کی شرعی یا غیر شرعی رسوم میں نے ادا کی ہیں، پتے کا شکریہ، آج علی میاں کو خط لکھ رہا ہوں والسلام آپ چوئی کو جان گئے اور اس کی نوکری اور میری سفارش بھی آپ کو یاد آ گئی لیکن یہاں تو قسمت ہی ایسی ہے ع

علم نیا آموخت علم تیر از من
کم عاقبت مرا نشانہ نہ کرد

والسلام خیریت کا طالب

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ
کوچہ چیلان دہلی
۲۴-۹-۱۹۵۵ء

(۳)

محترم و مکرم مولانا واحدی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم! یاد فرمائی کا شکریہ، آپ نے یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی ہوگی کہ دہلی کا آخری چراغ بھی گل ہو گیا، یعنی حضرت بینو د صاحب کا بھی وصال ہو گیا، کئی دن سے کھٹیا پر پڑے تھے، مجھ کو خطرہ ہو گیا تھا کہ دیکھئے اب کی کھڑے ہوتے ہیں یا نہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ○

واحدی صاحب! میں نے واقعی طور پر عرض کیا تھا کہ ۱۹۴۷ء میں دلی کا سوم یا چالیسواں یا برسی ہو گئی، یہ آخری رسوم اور ایصالِ ثواب دلی کے مقدر میں آپ کے ہاتھوں لکھا تھا، اس سے اُمید ہے کہ دلی مرحوم کی بخشش ہو گئی ہوگی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریز منقسم شدہ ہندوستان کو ایک مرکز

پر جمع کر رہا تھا اس لیے جانے والوں کو واپسی سہل تھی[۱]۔ اور ۱۹۴۷ء میں مرکزی حکومت کو تقسیم کر کے دو ملک بنا دیے گئے ہیں، اس لیے واپسی ممکن نہیں رہی، یوں خدا کو سب آسان ہے۔

جعل الله یحدث بعد ذالک امراO

زخم کا بہت سا حصہ مندمل ہو گیا ہے، ابھی پھایا لگ رہا ہے۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

کوچہ چیلان دہلی

۷-۱۰-۱۹۵۵ء

حاشیہ:

۱- انقلاب ۱۸۵۷ء میں شہر دہلی کی تمام آبادی نکل گئی تھی اور پھر واپس آ گئی تھی۔

(۴)

محترم ملا واحدی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم! کل آپ کا خط ملا ڈاک کی خرابی کے باعث آپ کو میرا خط ملنے میں تاخیر ہوئی، اور یہاں اس عرصہ میں علامہ برج موہن کیفی کا انتقال ہو گیا۔

اس عرصہ میں مجھ پر یہ گزری کہ کنج ران میں ایک پھوڑا ہو گیا، چاقو کا زخم مندمل نہ ہوا تھا کہ ایک نئی تکلیف میں مبتلا ہو گا، ڈاکٹر زیڈ احمد سے اس کا آپریشن کرایا اور اب طوطے کو لیے بیٹھا ہوں۔ روز شام کو ڈریسنگ ہوتا ہے غرض بڑھاپے کی زندگی سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ آپ کی دعاؤں کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، بجنو صاحب کو ''موٹا'' لکھیے[۱]، ڈبا لکھیے، اب بجنو کہاں، بہر حال وہ ''غدر'' کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ''غدر'' کے دیکھنے والوں میں نہ تھے۔ البتہ ''غدر'' سے اتنے قریب تھے کہ ''غدر'' کی ان کو یادگار کہا جا سکتا ہے۔

والسلام خیریت کا طالب

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

کوچہ چیلاں دہلی

۱۶-۱۱-۱۹۵۵ء

حاشیہ:

۱- واحدی صاحب نے بیخود دہلوی کو دلی کا موٹام لکھا تھا مولانا نے اسے موٹا پڑھا۔
(سید ضمیر حسن دہلوی)

(۵)

محترم ملا واحدی صاحب زاداللہ مجدکم

السلام علیکم! چاقو کا زخم مندمل ہو چکا ہے پھوڑا بھی قریب الصحت ہے، ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں ۵ر دسمبر تک زخم مندمل ہو جائے گا، دیر کی وجہ یہ ہے کہ دونوں چڈھوں میں ایکو یما ہے، اس میں سے پانی نکلتا ہے۔ وہ پانی زخم کو خشک نہیں ہونے دیتا، کوئی دُعا یا دوا لگ جائے تو کام جلدی ہو جائے۔

میاں واحدی! آپ کا لفظ ''موٹام'' ہی تھا مگر میں یہ لفظ سمجھ نہیں سکا اور سچ پوچھو تو میں نے یہ لفظ ''موٹام'' پہلی مرتبہ سنا ہے۔ اگر آپ اس کی تشریح کر دیں تو شاید میں سمجھ سکوں کہ یہ ''موٹام'' کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا یبقی من القرآن الا اسمه ولا یبقی من الاسلام الا اسمه○

جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا، اس کو میں اور آپ نہیں روک سکتے۔

خدا تعالیٰ آپ جیسے غم گساروں کو زندہ رکھے، جو مرثیہ تو پڑھ لیتے ہیں، آئندہ اس کی بھی اُمید نہیں، پچھلے دنوں آغا طاہر[۱] آ نکلے تھے، وہ دو شعر سنا گئے تھے وہ آپ بھی سن لیجیے، شاید آپ کے مطلب کی کوئی بات نکل آئے۔

محفل اُن کی ساقی اُن کا
آنکھیں میری باقی اُن کا

وہ پلٹ کر پھر نہیں آئیں گے یہ عیاں تھا طرزِ خرام سے
کوئی گردش ایسی بھی ہے فلک جو ملا دے صبح کو شام سے

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ کوچہ چیلان دہلی

۱۹-۱۱-۱۹۵۵

حاشیہ:

۱۔ آغا طاہر، المتوفی جون ۱۹۵۷ء، نبیرہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی۔

(۲)

محترم واحدی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم! یہ مینارے خدا جھوٹ نہ بلوائے سیکڑوں مرتبہ دیکھے ہیں، مگر آج تک ان کا نام معلوم نہ تھا دیکھیے حسن اتفاق ہے، کیوں آپ بیخود صاحب کو موٹا م لکھیں اور کیوں یہ بحث چلے اور کیوں مجھے ان مٹی کے میناروں کا نام معلوم ہو، اگر موٹا م پنت کی مٹی کے تودے کو کہتے ہیں تو علامہ کیفی اور بیخود اور خواجہ صاحب بلکہ ہم اور آپ بھی چھوٹے موٹے موٹا م ہی ہیں۔ بہر حال میاں کوئی دن کی بات ہے جب کوئی چھوٹا موٹا م بھی نظر نہ آئے گا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے دلی واقعی ان بزرگوں سے سمجھی اور جانی جاسکتی تھی، اس سلسلے کی ایک اور کڑی بھی سن لیجیے، کل ایک اور موٹا م بھی ہمارے محلے میں لڑک گیا۔ یعنی حکیم طالب احمد بھی خدا کو پیارے ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ٥ گلے میں تسبیح پڑی ہوئی ہے اور مطب ہو رہا ہے، خواجہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ دہلی کے موٹا م تھے، خواجہ صاحب کی وفات کے بعد دہلی میں یہ خواجہ صاحب کے پہلے مرید ہیں، جو موت سے ہم آغوش ہوئے ہیں۔ شام کی مجلس تو جمتی ہے مگر وہ پہلی سی رونق کہاں؟ نہ مچھلی کے کباب کوئی تلنے والا ہے نہ کھانا پکواؤ تو کوئی کھلانے والا ہے اور میاں واحدی! اپنی آمدنی بھی تھک گئی، سفر چھوٹ گیا باہر سے کما کر لاتے تھے اور دہلی میں نوابی کرتے تھے اور لوگوں کی بے بنیاد باتیں سن کر ہنستے تھے۔ اب پہلوان یعنی اسماعیل غوری اور عبدالحمید تیل فروش تو رات کو مکان میں سوتے ہیں باقی عوض گھوسی، ماسٹر محمد صدیق جو آج کل حضرت چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے سجادہ نشین خیال کیے جاتے ہیں اگرچہ مقدمہ عدالت میں زیرِ غور ہے اور پیر جی یاسین مرزا جو عبدالحمید تیلی کی برابر کی مسجد میں امامت کرتے ہیں، بنے میاں کے خلیفہ ہیں، عام طریقہ سے لوگ ان کو مولوی لال مرغا کہتے ہیں۔ یہ تین چار آدمی ہیں جو گھنٹے دو گھنٹے کو آجاتے ہیں اور بس! شہر کے اُجڑنے اور چیلوں کا کوچہ برباد ہونے کے بعد تو یہ پارٹی بالکل ہی تتر بتر ہو گئی[1]۔ کھانے پینے کی رونق حکیم جی[2] کے دم سے تھی۔ ان کو آپ اپنی

خدمت کے لیے لے گئے۔ مچھلی کے کباب کوئی تلنے والا نہ رہا نہ کوئی شب دیغ پکانے والا رہا۔
غرض یوں سمجھئے میں بھی ختم ہوا۔ صرف وضعداری کو نبھار ہا ہوں۔ والسلام

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ
کوچہ چیلان دہلی
۱۳-۱۲-۱۹۵۵ء

حواشی:

۱- شرفائے دہلی ۲- حکیم امتیاز الحق

(۷)

محترم واحدی صاحب زاد اللہ مجدکم!

السلام علیکم! گرامی نامہ کا شکریہ!

میاں نمونہ ہونے سے کیا فائدہ۔ آپ نمونہ ہوں، یا میں نمونہ ہوں اگر کوئی ہمارے نمونہ کو دیکھ کر صحیح دہلی والا نہ بنا تو ایسے نمونوں سے کیا فائدہ! آپ نے کراچی پہنچ کر بہرحال دہلی کے ایک رئیس[۱] اور دہلی کے ایک منطقی عالم کو ملا کر اپنی مجلس تو بنائی۔ میں تو بیٹھا بیٹھا دہلی ولوں کو کم کر رہا ہوں، جو پاکستان چلے گئے وہ تو چلے گئے اور جو باقی رہ گئے ان کو موت نہیں چھوڑتی، تین چار دن کی بات ہے، حاجی کالے مر گئے جو دہلی کے مشہور کباڑیے تھے، عباسی برادری کے بڑے آدمی تھے، ڈپٹی کمشنر سے کہہ کر اُن کو شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ کے مزار کے قریب دفن کرایا، اُن سے فارغ نہ ہونے پائے کہ مولانا سید عبدالرؤف صاحب[۳] کا دوسرے دن انتقال ہو گیا، جو پنجابیوں کے قبرستان میں اپنے نانا سید میاں نذیر حسین مرحوم[۴] کے قریب مدفون ہوئے، غرض دہلی کو دہلی والوں سے خالی ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں، اب یہی خیال کرتا ہوں کہ مردوں میں مل کر کوئی سوسائٹی بناؤں اور روز روز کے قصوں سے نجات حاصل کرلوں۔

صحت اچھی ہے، زخم مندمل ہو گیا ہے، سردی میں قلب کا دورہ پڑا کرتا ہے، وہ پڑتا ہے اور ہر شب میں گھنٹے دو گھنٹے بے چین رہتا ہوں، کنج ران میں کھجلی ہوتی ہے، بہرحال دوستوں

کی دعاؤں کا محتاج ہوں، اپنی مجلس کے ارکان کی خدمت میں میرا اسلام عرض کردیجیے۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

کوچہ چیلان دہلی

۱۸-۱۲-۱۹۵۵ء

حواشی:

۱- خان بہادر حبیب الرحمٰن سابق پریسیڈنٹ او بی ای میونسپل کمیٹی دہلی۔

۲- مشہور مفکر اور متکلم مولانا محمد ایوب دہلوی مراد ہیں۔

۳- مولوی عبدالرؤف صاحب، میاں نذیر حسین محدثؒ کے نواسے تھے، دہلی میں نذیریہ لائبریری انھوں نے ہی قائم کی تھی۔

۴- میاں نذیر حسین محدث دہلوی بڑے پایہ کے عالم تھے۔

(۸)

محترم واحدی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم۔ بھائی حاجی کالے کو آپ نہ سمجھے، شاید کوئی واسطہ نہ پڑا ہو ورنہ خاصے مشہور آدمی تھے۔ کلوخواص کی حویلی میں ایک مسجد بھی انھوں نے تعمیر کرائی تھی، یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ شہر میں تدفین گورنمنٹ نے بند کردی ہے اور نئی زمین دے کر نیا قبرستان بنادیا ہے۔ پھر بھی اگر کوئی خاص ضرورت پیش آئی ہے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے اجازت لے کر پرانے قبرستانوں میں دفن کردیا جاتا ہے۔ امام صاحب جامع مسجد[۱] اور چند جوتے والے جامع مسجد کے جنوبی دالان کے نیچے دفن ہوئے مولانا شوکت علی ہرے بھرے کے قریب دفن ہوئے۔ مکی صاحب[۲] شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب دفن کردیے گئے۔ غرض اس طرح کام چل جاتا ہے۔ آپ کے لیے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بلامنتِ غیرے جگہ مل سکتی ہے۔ آپ فرمائیں[۳] تو اُن کے لڑکوں سے کہا جائے۔ وہ بیچارے انکار نہیں کریں گے۔ اسی چبوترے پر آپ دفن ہوسکتے ہیں، جس پر حضرت خواجہ صاحب مدفون ہیں اور مولانا شاہ ولی

اللہ صاحب کے ہاں یعنی مہندیوں کے قبرستان میں بھی آپ دفن ہو سکتے ہیں لیکن یہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت پر موقوف ہے۔ عام طور پر تو اجازت ہو ہی جاتی ہے۔ کوئی مجسٹریٹ ضدی ہو تو نہیں کہا جا سکتا، بہر حال آپ دونوں جگہ کی نیت سے آ جایئے، نظام الدین تو صاف ہے اور اگر خدا کو منظور ہے تو مہندیوں میں بھی، دونوں جگہ موزوں اور آپ کی پسندیدہ ہیں جگہ تو آج کل زندوں کو ملنی مشکل ہے۔ مردوں کو دہلی کی سرزمین میں کہیں نہ کہیں دبا ہی دیا جاتا ہے۔

میں اب خیریت سے ہوں، ذرا سردی کم ہو جائے اور زندگی مساعدت کرے تو ڈاکٹر سے دریافت کر کے ہوا خوری کا کوئی وقت تجویز کروں گا، مگر چاقو لگنے کے بعد سے تو اکیلے نکلنے کا بھرم بھی نہیں رہا۔

میں ہوں آپ کا مخلص

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

کوچہ چیلان دہلی

۹-۱-۱۹۵۶ء

حواشی:

۱- شمس العلماء مولوی سیّد احمد۔

۲- میرٹھ کی بھیا فیملی کے ایک ممتاز شخص تھے، دلی کو انھوں نے وطن بنا لیا تھا۔

۳- ملا واحدی صاحب نے تمنا ظاہر کی تھی کہ میں مدینہ منورہ جا کر نہیں مر سکتا تو کم از کم دہلی میں مروں اور درگاہ حضرت سلطان المشائخ میں خواجہ حسن نظامی کے برابر دفن ہوں یا مہندیوں میں زیر سایہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۹)

محترم واحدی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم! خواجہ صاحب مرحوم کے بچے بھی اپنے والد کی طرح میرا بہت لحاظ کرتے ہیں اور مجھے اُمید نہیں کہ وہ میری بات کو ٹالیں گے لیکن اگر آپ کی مصلحت نہیں ہے تو جانے دیجیے۔ مجھے بھی کچھ اصرار نہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے جذبات کو قبول فرمائے اور

مدینے ہی میں موت آئے اور وہیں دفن ہونا نصیب ہو۔ آمین! اللہ تعالیٰ کو سب آسان ہے۔وما ذالک علی اللہ بعزیز ٥ عبدالعزیز[۱] کی یہ غیر بناوٹی باتیں اکثر میں نے بھی سنی ہیں، باتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں، کاش ان باتوں میں فحش اور مغلظ گالیاں شامل نہ ہوتیں، آپ کا بیان کردہ لطیفہ میں نے مولانا عارف ہسوی مرحوم سے بھی سنا تھا، آپ نے تو ایک موٹی سی گالی کہہ کر چھوڑ دیا اللہ بخشے انہوں نے تو مجھ کو ان کے پورے الفاظ سنائے تھے اور میں نے بہت توبہ توبہ کہا تھا۔

یہ بچکانے والی بات تو ان کی بہت پرانی ہے، میاں وہ لوگ اب کہاں جن کی مجلس میں بیٹھ کر متین سے متین آدمی بھی ہنسی پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب[۲] کے قبرستان میں میرے بھی بہت سے عزیز دفن ہیں۔ بہرحال اگر خدانخواستہ آپ دہلی میں مرے اور میں اس وقت تک زندہ رہا تو پوری طرح کوشش کروں گا کہ آپ کو مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ یا نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی زمین میں سپرد خاک کراؤں اور اگر میں اس وقت تک زندہ نہ رہا تو کچھ نہیں کہہ سکتا، بہرحال تمنا آپ کی نیک ہے اور میں پھر دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ وہ تمنا پوری کرے، نظام المشائخ[۳] کا شکریہ تصوف کی چاشنی کم ہے، یہ شاید پاکستان کی آب وہوا کا اثر ہے۔

دعا کا طالب

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

کوچہ چیلان دہلی

۲۶-۱-۱۹۵۶ء

حواشی:

۱- مہندیوں والے قبرستان کے مجاور تھے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ ملاحظہ ہو، ملا واحدی دہلوی کی کتاب ''میرے زمانہ کی دلی'' ص ۲۸۲-۲۸۴

۲- حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔

۳- ملا واحدی صاحب کا ماہنامہ جو آج کل کراچی سے نکلتا ہے، ۱۹۰۹ء میں دہلی سے جاری ہوا تھا اور آج تک برابر نکل رہا ہے

(۱۰)

محترم واحدی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم! گرامی نامہ مورخہ ۳۱-۱-۱۹۵۶ء کا شکریہ، میاں یہ بھی بہت بڑی بات ہے کہ آپ نے نظام المشائخ کا نام تو باقی رکھ چھوڑا ہے۔ کتابیں تو آج بھی بدون کسی رسالہ کے نہیں چلتیں، کتابیں چھپوانے میں کیا دقت پیش آ رہی ہے، آج کل تمام سرمایہ دار تو کراچی میں سمٹ آئے ہیں، کسی کو توجہ دلاؤ کوئی نہ کوئی اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ چھپوا دے گا، پہلی اشاعت ذرا نرم بھاؤ پر دے دو، آگے پھر سنبھال لیجیے گا۔

حیات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نامی کتاب[1] میری نظر سے نہیں گزری، نہ معلوم کس کی معرفت بھیجی تھی۔ الجمعیۃ والوں کی معرفت اگر آئی تھی تو وہاں کیا پتہ چلتا ہے۔

ہر کہ درکان نمک رفت، نمک شد

سندھ اور پنجاب میں پیروں کا زور ضرور ہے لیکن تصوف دوسری چیز ہے اور پیری اور مریدی کا ڈھونگ دوسری چیز ہے۔ اگر کوئی اسلامی حکومت ہوتی تو اس پیری مریدی کی قلعی کھل جاتی، مگر یہ چیزیں آپ کے بس کی نہیں، اسلام کی سادی تعلیم کی اشاعت ہی آپ کی عاقبت بخیر ہونے کے لیے کافی ہے۔ بہر حال ہر تبدیلی میں کوئی راز ہوتا ہے، شاید نظام المشائخ میں عرصہ ہوا حضرت سلطان الاولیاءؒ اور حضرت عبدالوہاب[2] زکریا ملتانیؒ کا ایک مکالمہ پڑھا تھا وہ مجھے یاد آتا ہے، آپ کی ہجرت کراچی والوں کے حق میں بہتر ہوئی اگرچہ دہلی والے محروم ہو گئے۔ بہر حال قضاء و قدر کو کون ٹال سکتا ہے۔

لا معقب لحکمۃ، والسلام جملہ پرسانِ حال کی خدمت میں سلام مسنون

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

کوچہ چیلان دہلی

۱۱-۴-۱۹۵۶ء

حواشی:

۱- ملا واحدی کی تالیف۔

۲- شاید مولانا کو حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کی بجائے عبدالوہاب زکریا کا نام یاد رہا، مگر وہ بزرگ جن کی حضرت سلطان المشائخ سے ملاقات ہوئی تھی حضرت رکن الدین ملتانیؒ تھے، حضرت بہاؤالدینؒ زکریا کے پوتے۔

(۱۱)

محترم واحدی صاحب دام مجدکم!

السلام علیکم! عرصہ سے کوئی خط نہیں لکھ سکا، شرمندہ ہوں، طبیعت کے حالات کچھ ایسے ہی ہیں، کبھی سب کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے، کبھی کسی کام کے کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ قلم ہاتھ میں لیے بیٹھا رہتا ہوں، ذہن آگے نہیں بڑھتا۔ "آپ کے زمانے کی دلی"[۱] پڑھتا ہوں، پھر جو کچھ آپ قصداً یا سہواً چھوڑ جاتے ہیں، اس پر چاہتا ہوں کہ آپ کو متنبہ کروں، لیکن نہ تو فرصت ہی ملتی ہے نہ دل ہی متوجہ ہوتا ہے، حیات سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دوسری جلد پہنچی۔ ماشاءاللہ خوب ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اس عرصہ میں حاجی یونس[۲] آئے اور چلے گئے، غزالی آئے اور چلے گئے، آپ کی خیریت معلوم ہوئی، اس ہی تساہل میں آغا طاہر کے مرنے کی اطلاع بھی نہ دے سکا، بہرحال اس شخص کی سخت حالی قابل ستائش ہے، جو دہلی والوں کے بغیر دہلی میں رہتا ہے اور اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے، اُمید کہ آپ کے مزاج گرامی مع الخیر ہوں گے۔ حیاتِ سرور کائنات کی پیشکش بھی میں نے پڑھی اور یہ شعر خاص طور پر پڑھتا رہا، اقبال کا مشہور شعر ہے ع

از حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

کیا کہتے ہیں، ایسا وجد آفرین شعر کم شاعروں کو نصیب ہوتا ہے۔ والسلام

فقیر احمد سعید کان اللہ لہ
کوچہ چیلان دہلی

حواشی:

۱- میرے زمانے کی دلی از ملا واحدی۔

۲- مولانا احمد سعید دہلوی کے چچا ہوتے ہیں۔

(۱۲)

محترم ومکرم واحدی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم! ''حیات سرور کائنات'' کا حصہ اوّل موصول ہوا، جلد بندھنے کے لیے یہ حصہ دے دیا ہے، جلد بندھنے کے بعد پڑھوں گا، پھر انشاء اللہ کچھ لکھ سکوں گا، الجمعیۃ سے آپ کا معاملہ براہِ راست رہے تو اچھا ہے، اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ والسلام

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

کوچہ چیلان دہلی

(۱۳)

محترمی واحدی صاحب زید مجدکم!

السلام علیکم! جواب بہت تاخیر سے دے رہا ہوں، وجہ یہ ہے کہ میں تفسیر القرآن کو ختم کرنے کی فکر میں تھا، الحمدللہ وہ کام ۱۴ شعبان کو پورا ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے مقصد زندگی کو پورا کر دیا، اس عرصہ میں سوائے چند صفحوں کے آپ کی کتاب حیاتِ سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی نہیں پڑھ سکا، تفسیر پوری کرنے کے بعد اس کی طباعت اور صحت وغیرہ کا معاملہ، نیز رمضان المبارک کے استقبال میں مصروف ہوں، اب اگر زندہ رہا اور رمضان خیریت سے گزر گیا تو انشاء اللہ عید بعد کسی اور کام کی جانب توجہ کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ والسلام۔ پرسانِ حال کی خدمت میں سلام مسنون

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

کوچہ چیلان دہلی

(۱۴)

محترم ومکرم جناب واحدی صاحب زاداللہ مجدکم!

السلام علیکم! ۴ جنوری کے خط کا شکریہ! یہ کوئی بات ایسی نہیں ہے۔ اگر ہاشمی صاحب[1] کے تعلقات ہوں گے تو وہ کرادیں گے۔ بہرحال جنوری نہ سہی اپریل سہی۔ اللہ تعالیٰ زندوں کو سب آسان کرے گا۔ سوال اتنا ہے کہ آخر زندگی کب تک ساتھ دے گی۔ صبح ہوتی ہے تو شام کا بھروسا نہیں اور شام ہوتی ہے تو صبح کا بھروسا نہیں۔

ع بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

واقعی یہاں سردی کا خوب زور رہا ہے۔ دو دن تو آفتاب کو ترس گئے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ ۲۰ دسمبر کو چلہ ختم ہو جاتا ہے جس تاریخ سے دن صبح سے بڑھنے لگتا ہے اس دن چلے کو ختم سمجھنا چاہیے۔ باقی سردی تو آپ جانیے۔ فروری کے آخر تک چلتی رہتی ہے۔ مارچ کا مہینہ معتدل شمار ہوتا ہے اور اپریل گلابی گرمی کا سمجھا جاتا ہے اور اس دفعہ تو سنا ہے کراچی میں خلاف معمول بہت سردی پڑی۔ واللہ اعلم بالصواب

میاں عبدالسلام زئی بہت پوچھتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی خواجہ بانو بھی دریافت فرماتی ہیں۔ سنا تھا نصیب اعدا میاں (ولی) پر کسی نے حملہ کر دیا تھا۔ آج کل تو عشق ومحبت میں بھی غنڈہ گردی رہ گئی ہے۔ آخر یہ کام ہمارے آپ کے چھٹپنے میں بھی ہوتے تھے۔ مگر اس میں بھی ایک شرافت تھی، خوشامد تھی، خدمت تھی۔

زور وزر سے بھی کہیں داغ صنم ملتے ہیں
اپنے نزدیک تو ہے سب سے اطاعت اچھی

یہ آج کا دستور ہے کہ محبوب اور مطلوب کو چھریاں دکھا کر رام کرتے ہیں۔ پناہ بخدا! تو [illegible] دن خوشامد کرتے گزر جاتی ہے۔ جب کہیں جا کر کامیابی نصیب ہوتی ہے، کہیں نہیں [illegible] لیکن، جو کامیابی میسر ہوتی ہے وہ پرلطف اور پرسرور [illegible] ہے۔ بہرحال اب بتاؤ! میاں [illegible] کیسے ہیں؟ نصیب دشمناں کوئی زیادہ صدمہ تو نہیں پہنچا۔ حملہ آور گرفتار ہوا یا نہیں؟ اور اگر گرفتار ہوا تو مارشل لاء کے تحت کس سزا کا مستحق قرار دیا گیا۔ میں ممنون ہوں گا۔ اگر تفصیلی

حالات سے مطلع فرمائیں گے اور میاں ولی کو میری طرف سے ہمدردی کا پیغام پہنچا دیں گے مجھے میاں ولی کا پتا نہیں معلوم ورنہ میں براہِ راست ان کو ہمدردی کا خط لکھتا۔ اللہ تعالیٰ میاں ولی کو خیریت سے رکھے اور ان کے ماں باپ کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے۔ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی سترھویں ۲۶/۲۷ اپریل کو ہوگی۔ بہرحال موسم اچھا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دہلی کا آنا اور جانا مبارک کرے اور مجھ کو جب تک زندہ رہنا مبارک کرے۔ آپ کے جاننے والے اس دس برس میں بیسیوں مر گئے اور بیسیوں پاکستان چلے گئے۔ جو دو چار زندہ ہیں اُن سے ملاقات کر لیجیے گا۔ باقی کی قبروں پر فاتحہ پڑھ جایئے گا۔ والسلام

خدا جانے غزالی بھی آیا یا نہیں۔ اگر آئے تو اس پر اور حاجی یونس حکیم جو مغزے وغیرہ پر میرا سلام بھیج دیجیے گا۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۱۰ر جنوری ۱۹۵۹ء

حاشیہ:

۱۔ مولانا احمد سعید دہلوی کے بھتیجے انیس ہاشمی۔

(۱۵)

محترم مواحدی صاحب دام مجدکم!

السلام علیکم! آج ہی زید[۱] پاشا کا نکاح پڑھا کے آیا تھا۔ نکاح کے وقت خواجہ صاحب مجھ کو بہت یاد آئے۔ ان کے ساتھ ساتھ آپ کا تصور بھی آیا اور اپنے بعض مضامین یاد آئے جو نظام المشائخ کے ابتدائی دور میں میرے نام سے چھپے تھے۔ ایک مضمون تو شاید ایک فقیر کی صدا پر (چل دلہنیا ترے پیانے بلائی) ذہن میں آیا تھا۔ وہ میری طالب علمی کا وسطی دور تھا یا شاید ابتدائی ہو۔ اس وقت مجھے خیال بھی نہ تھا کہ مجھے اس دنیا میں کیا کیا کرنا ہوگا۔ بہرحال یہ سب باتیں یاد کرتا ہوا واپس مکان پر آیا تھا اور مغرب کی نماز کی تیاری کر رہا تھا کہ آپ کا لفافہ مل گیا۔ وضو روک کے پہلے آپ کا خط پڑھا۔ اتنے میں بعض اعضائے وضو خشک ہو گئے۔ لہٰذا احتیاط کے خیال سے دوبارہ وضو کیا، نماز پڑھی۔ یہاں آج کل شادیاں زیادہ ہو رہی ہیں۔ لوگ نکاح

پڑھانے کے لیے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ اب اسی کام کا رہ گیا ہوں شادی والے نکاح پڑھانے کے لیے لے جاتے ہیں۔ غمی والے جنازے کی نماز پڑھانے کے لیے گھسیٹتے ہیں۔ مجھے اپنی خبر نہیں کہ میرے جنازے کی نماز کون پڑھائے گا۔ بزرگوں میں سے کوئی رہا نہیں۔ بہر حال کوئی نہ کوئی پڑھا دے گا۔

انیس ہاشمی وعدہ کرتے ہیں تو انشاء اللہ اپریل میں ویزا مل جائے گا اور حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی سترہویں میں آپ شریک ہو جائیں گے۔ سردی کے اس دفعہ بڑے ٹھاٹھ رہے۔ چلتے چلاتے پرسوں ایک بہت اچھا چھینٹا پڑ گیا۔ کل سے پھر سردی جیت گئی۔ ہمارے ہاں کی عورتیں پرانے زمانے کی کہا کرتی تھیں ''بوا جاڑا ہاتھ پاؤں پیٹ رہا ہے'' وہی بات مجھ کو یاد آتی ہے۔ جاڑے نے مرتے مرتے سنبھالا لیا ہے۔ بہر حال آپ کی دعا کا اثر ہے کہ مجھ جیسے کمزور و ناتواں، بادی بواسیر اور قلب کے مریض نے اس جاڑے کا مقابلہ کر لیا۔ بجائے ایک ہیٹر کے دو ہیٹر جلا کر کئی راتیں بسر کیں۔ اللہ تعالیٰ شنکر پرشاد چیف کمشنر کا بھلا کرے وہ بیچارہ ایک ہارس پاور کی بجلی مجھ کو دے گیا تھا۔ اس سے سردی میں پانی گرم کر لیتا ہوں اور ہیٹر جلا لیتا ہوں اور شنکر پرشاد کو دعا دیتا ہوں۔

یہ صاحب جو لاہور سے آئے تھے۔ غالباً جوان ہوں گے ورنہ کراچی میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہانا اپنے بس کا نہ تھا۔ میاں ولی[۲] بھی، کل حسین کہتے تھے۔ پہلوانی کا شوق کرتے ہیں۔ چلو خدا کا شکر ہے قصہ رفت گزشت ہوا۔ آپ بھی ولی کو سمجھا دیجیے کہ وہ اپنے دادا کی طرح دوست بڑھائیں، دشمن کسی کو نہ بنائیں، دشمن تو اس زمانے میں خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ دوست خال خال نظر آتے ہیں اور اُن پر بھی اس زمانے میں اعتبار مشکل ہے۔ سیّد اقبال شاہ[۳] کے انتقال پر افسوس ہوا۔ یہ وہی لڑکا ہوگا جس کی ناک آگے سے ذرا موٹی تھی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ لڑکا بہت ملن سار اور خوش خلق تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔ خدا جانے کیا بیمار ہوا تھا؟ حاجی یونس کو سلام پہنچانے کا شکریہ، میرے سلام جمع کرتے رہیے۔ پھر کبھی ملاقات ہو جائے تو سب یکمشت پہنچا دیجیے گا۔ آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ آپ نے غزالی صاحب کی صورت دیکھ لی۔ دنیا بدل گئی مگر اس شیطان کی وعدہ خلافی نہ بدلی۔ اس کو

اپنے متعلق غلط فہمی ہے۔ مہربانی فرما کر اس کی غلط فہمی دور کر دیجیے۔ والسلام

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۳۰ر جنوری ۱۹۵۹ء

حواشی:

۱- خواجہ حسن نظامی دہلوی کے تیسرے فرزند۔

۲- خواجہ حسن نظامی کے فرزند اکبر۔

۳- واحدی صاحب کے ایک عزیز۔

(۱۶)

محترم و مکرم جناب ملا واحدی صاحب دام مجدکم

السلام علیکم! ۹ر فروری ۱۹۵۹ء کا خط آیا تھا۔ کئی دن گزر گئے پہلے بھائی فضل احمد کے خط کا جواب لکھا۔ آج آپ کے خط کا موقعہ نکالا۔ میری حالت یہ ہے کہ کچھ کام نہیں، دن میں گھر پر اینڈ تا رہتا ہوں لیکن فرصت بھی نہیں کیا خوب زندگی ہے۔

ع بے کارم و با کارم چون مد بحساب اندر

بہر حال غزالی صاحب آ گئے مبارک ہو۔ ان کا عدیم الفرصت ہونا ٹھیک ہے قحبہ چون پیر شود کار کند۔۔۔۔۔ گھری کا ایک گھر، نگھری کے ستر گھر۔ اللہ تعالیٰ ان کو فرصت نہ دے۔ انھیں ویزا مل جائے تو اچھا ہے۔ دہلی والوں کے لیے بھی کچھ تفریح کا سامان ہو جائے گا۔ اقبال شاہ کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ واقعی بڑا لحاظ دار بچہ تھا۔ مجھ کو تعجب ہے کہ اس کی عمر ۵-۶ سال تھی۔ خیر بھائی حضرت حق تعالیٰ مغفرت فرما دیں تو سب کچھ ہے۔ زندگی تو درحقیقت وہی ہے جو آخرت کی زندگی ہے۔ وان الدار الاخرۃ لھی الحیوان o

اگر ۹ر فروری کو ایسا موسم ہے کہ آپ ململ کا کرتہ پہنے بیٹھے ہیں تو آپ کے موسم کی حالت معلوم شد، ایسا ہر موسم اچھا۔ یہ موسم بڈھے جوان، امیر غریب سب کے لیے پردہ پوش اور صحت بخش ہے۔ اگر صاحب غسل مرزا عبدالرزاق بیگ[1] ہیں تو میں ان کو سمجھ گیا۔ مرزا عبدالغفار مرحوم کے صاحبزادے اور حافظ عبدالستار صاحب کے بھتیجے ہیں۔ بھائی وہ تو اگر دلی

میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہا لیتے تو ان سے کچھ بعید نہ تھا اور آپ کے ہاں تو اللہ رکھے جنوری فروری ایسا ہی ہے جیسے ہمارے بھارت میں اپریل مئی کا موسم ہوتا ہے۔ بہر حال جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ مرزا عبدالرزاق صاحب کو چھوڑ دیجیے اگر کسی اور شخص نے آپ کے یہاں غسل کیا تو اس کا ذکر فرمائیے۔ شنکر پرشاد صاحب تغلق روڈ نمبرے نیو دہلی میں رہتے ہیں۔ ان کا تقرر آج کل کشمیر میں ہو گیا ہے۔ وہ غالباً رزیڈنٹ کے عہدہ پر یا اس سے کوئی ملتا جلتا عہدہ ہو اس پر فائز ہیں۔ غرض نہایت شریف الطبع، پرانی تہذیب کے لوگوں میں سے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کو خوش رکھے۔ باقی حالات بدستور ہیں۔

میرا خیال ہے کہ بھائی فضل احمد بھی آپ کے ہمراہ ہوں اور وہ شمسی تالاب پر بیٹھ کر ضرور روئیں گے۔ اس مہینے میں میاں حسین اور خواجہ صاحب کے دو داماد دہلی آئے تھے۔ شاید یہ حضرات زید کی شادی میں نہیں آئے تھے۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۱۸ فروری ۱۹۵۹ء

حاشیہ:

۱۔ مرزا عبدالرزاق بیگ دہلوی لاہور میں مقیم ہیں۔ کراچی آئے تو واحدی صاحب سے انھوں نے ذکر کیا کہ یہاں فروری میں ٹھنڈے پانی سے نہا رہا ہوں۔ واحدی صاحب نے کراچی کے موسم کا حال لکھتے لکھتے مولانا کی مثال لکھ دی تھی۔ مولانا نے اس پر رائے زنی فرمائی ہے۔

(۱۷)

محترم واحدی صاحب زاد اللہ مجدکم!

السلام علیکم! میاں یوں تو اعتبار کسی چیز کا بھی نہیں۔ ہر چیز معدوم ہونے اور خفا ہونے کے لیے تیار ہے لیکن یہ سن کر تعجب ہوا کہ وہاں کا موسم ناقابل اعتبار ہے۔ سمیع آرٹسٹ واقعی اپنے فن کے ماہر ہیں۔ انھوں نے یہ کارٹون بنایا تو خوب[۱] بنایا۔ خدا ان کو خوش رکھے جس طرح بڑے لوگ روپیوں کے ساتھ پیسے اور کوڑیاں رکھا کرتے تھے ٹھیک اسی طرح کراچی والے سفر

میں روئی کی کمری، لحاف اور دُلائی، تن زیب کا کرتہ، بنیان اور چھتری لیے پھرتے ہوں گے۔ واہ کیا موسم ہے۔ چونکہ دلی والے وہاں آباد ہیں۔ قدرت نے ان کے لیے تینوں موسموں کا انتظام کر دیا ہے۔ تا کہ وطن کو نہ بھول جائیں اور جہاں بھی رہیں دلی کو یاد رکھیں۔

ہاں پندرہ مارچ کو خاصا موسم ہو جائے گا۔ معتدل اور گلابی موسم ہوگا۔ تندرست آدمی اس موسم میں ٹھنڈے پانی سے نہا لیتے ہیں۔ مجھ جیسا ضعیف آدمی بھی یکم مارچ سے ٹھنڈے ہی پانی سے وضو کرتا ہے البتہ صبح کے وقت گرم پانی کا استعمال کرتا ہوں۔

مرزا عبدالرزاق بیگ صاحب کو میں سمجھ گیا۔ ان کے بڑے بھائی کو بھی سمجھ گیا۔ اچھا جب آپ تشریف لائیں گے اور میں اس وقت تک زندہ رہا تو انشاءاللہ مزید باتیں ہوں گی۔ خدا کرے آپ کو ویزا مل جائے اور آپ ساتھ خیریت کے تشریف لائیں اور خدا کرے بھائی فضل احمد جن کو میں اب بسورتے بھائی کہتا ہوں وہ بھی آئیں اور وہ جس کا نام غزالی ہے اور جو آج کل دلالی کر رہا ہے وہ بھی آپ کے ہمراہ آئے تو کچھ تو لطف صحبت رہے ورنہ اب زندگی کہاں ہے، زیادہ وقت خاموشی میں گزرتا ہے۔ رات کو اسماعیل غوری، عیوض گھوسی، عبدالحمید تیلی یہ لوگ آجاتے ہیں۔ وہی وقت میرے سونے کا ہوتا ہے ساتھیوں کی موت نے دل کو شکستہ کر رکھا ہے۔ اپنی بے غیرتی سے ہنس بول لیتا ہوں۔ ع

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

والسلام

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۳؍ مارچ ۱۹۵۹ء

حاشیہ:

۱- ملا واحدی نے کراچی کے موسم کی بے اعتباری کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر سمیع آرٹسٹ کے ایک کارٹون کا حوالہ دیا تھا کہ گھر سے کوئی صاحب معمولی لباس پہن کر بازار چلے ہیں۔ مگر احتیاطاً اوورکوٹ، چھتری اور برساتی بھی ساتھ لے لی ہے نہ معلوم واپسی میں کس چیز کی ضرورت پڑ جائے۔

(۱۸)

محترم واحدی صاحب دام مجدکم!

السلام علیکم! الحمد للہ آپ مع الخیر کراچی پہنچ گئے۔ خدا جانے دہلی والوں سے مل کر آپ نے کیا اثر لیا، کچھ خوش گئے یا ناراض گئے۔ یہاں کی سوسائٹی کچھ آپ کے ذوق کو پورا کرسکی یا نہیں۔ خط میں کوئی اشارہ نہیں، لاہور میں بھائی فضل احمد کے ہاں زیادہ قیام رہا ہوگا۔ ورنہ آپ کراچی جلدی پہنچ جاتے۔

بہر حال میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری زندگی میں دہلی کو دیکھ لیا۔ اگر دہلی والوں سے خوش گئے ہیں تو شاید عید کی سترہویں پر پھر تشریف لائیں۔ ورنہ آپ کو میں نے دیکھ لیا اور آپ نے مجھ کو دیکھ لیا۔ والسلام

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۲۴؍مئی ۱۹۵۹ء

(۵)

حکیم سید محمد یامین

(۱)

محترم المقام حکیم سید محمد یامین صاحب دام مجدکم!

السلام علیکم! گرامی نامہ کا شکریہ، کیا عرض کروں کئی مہینے سے حاضری کا قصد کر رہا ہوں۔ مگر حضرت حق جل مجدہ کو منظور نہیں۔ کوشش تو یہی ہے کہ آموں کی فصل باقی رہے لیکن کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ پھنسیوں کو اب آرام ہو رہا ہے۔ چلتا پھرتا ہوں، لیکن سفر نہیں کر سکتا۔ میں نے آپ کا گرامی نامہ محمد سعید کو دے دیا تھا کہ وہ سید محمد احمد صاحب کو پہنچا دیں۔ خدا جانے انھوں نے کیا کیا؟ میں دوبارہ دریافت نہیں کر سکا۔ میرا جانا آنا نہیں ہوتا جو میں اُن سے خود ملاقات کروں میں نے عرض کیا کہ کئی بار پروگرام بنائے مگر ''ماشاء الله کان وما لم یشاء لم یکن'' کا مضمون ہے۔ بہرحال جو اُن کی مشیت ہوگی وہ ہوگا۔ حکیم ذوالنون صاحب مولانا حکیم سید محمد ایوب صاحب، حکیم محمد یاسین صاحب کی خدمت میں سلام مسنون۔ حضرت شیخ الحدیث کی خدمت میں سلام مسنون۔ محمد یوسف کو دعا۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۲۲ جولائی ۱۹۵۴ء

(۲)

محترم ومکرم حکیم سید محمد یامین صاحب زاد اللہ مجدکم!

السلام علیکم! آپ کا اور صاحبزادہ بلند اقبال کا خط ملا۔ گھبرانے کی بات نہیں نہ اپنے مرنے کی کوئی اطلاع ہے۔ نہ میں اُن بزرگوں میں سے ہوں جن کو اُن کے موت کی اطلاع قبل از وقت مل جاتی ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ بڑھاپے اور موت کے درمیان کوئی اور منزل نہیں۔ الله الذی خلقکم من ضعف ثم جعل من بعد ضعف قوۃ ثم جعل من بعد قوۃ ضعف و شیبۃ یہی تین دور ہیں اور میں تیسرے دور میں ہوں جس کے آگے موت ہی کی گھاٹی ہے۔ اگر میں نے اس کا ذکر کر دیا تو اس سے گھبرائیے نہیں اور نہ ڈریے۔ بس اللہ تعالیٰ

سے انجام بخیر اور خاتمہ علی الایمان کی دعا کیجیے۔

جتنی جلدی آپ فرمارہے ہیں اس قدر جلدی تو ممکن نہیں۔ البتہ میں اپنا پروگرام تجویز کر کے مطلع کروں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ جمعہ کے بعد کوئی پروگرام تجویز ہوگا اور آپ کو اطلاع دی جائے گی۔ حکیم مولانا محمد ایوب صاحب، حکیم محمد یاسین صاحب کی خدمت میں سلام مسنون۔ میاں محمد یوسف کو دعا۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۱۶ر اپریل ۱۹۵۹ء

(۳)

محترم ومکرم سید حکیم محمد یامین صاحب دام مجدکم!

السلام علیکم! آپ کی دعاؤں کی برکت سے زندہ ہوں۔ بڑھاپے میں نئی نئی تکلیفیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ چھوئی موئی کا درخت ہوں دور سے ہرا ابھرا معلوم ہوتا ہوں۔ ہاتھ لگاؤ تو بیکار ہوں۔ اسی وجہ سے سفر کرنے سے گھبراتا ہوں۔ بہرحال اگر زندہ رہا اور اللہ تعالیٰ نے میری آرزو پوری کی تو گنگوہ شریف اور کلیر شریف کا حاضر ہونا منظور ہوگیا تو انشاء اللہ سہارنپور ضرور حاضر ہوں گا۔ اگرچہ چند گھنٹوں کے لیے حاضری ہو۔

حکیم ذوالنون، حکیم مولانا محمد ایوب، حکیم محمد یاسین صاحبان کی خدمت میں سلام مسنون۔ محمد یوسف کو دعا۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۲۶ر جولائی ۱۹۵۹ء

(۴)

محترم المقام جناب حکیم سید محمد یامین صاحب زاد اللہ مجدکم!

السلام علیکم! ۷ر نومبر کے گرامی نامے کا شکریہ۔ جی ہاں مرادآباد ہو آیا۔ بیٹھے بیٹھے تقریر بھی کرآیا۔ رات کو قلب کا دورہ بھی پڑ گیا۔ ایک حکیم صاحب ہمراہ تھے۔ انھوں نے رات کے چار بجے گرم چائے بنوا کر پلوائی۔ چائے کے بعد تھوڑی دیر کھانسی ہوتی رہی اس کے بعد ایک

دم آنکھ لگ گئی۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد صبح ہوگئی۔ نماز پڑھی، چائے پی کر موٹر میں گھر آ گیا۔ جو تکلیف مقدر میں تھی وہ بھگت آیا۔ یہ خلاصہ ہے مراد آباد کے سفر کا۔

آپ دہلی تشریف لائیں گے اور میں زندہ رہا تو تفصیل عرض کروں گا۔ کہیے باغ کا کیا حال ہے۔ خدا کرے آپ کا باغ خوب پھلے پھولے۔ حکیم ذوالنون، مولانا حکیم محمد ایوب اور حکیم محمد یاسین صاحبان کی خدمت میں سلام مسنون، میاں محمد یوسف کو دعا۔ حضرت شیخ الحدیث اور مولانا امیر احمد صاحب صدر مدرس کی خدمت میں سلام مسنون۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۱۷ر نومبر ۱۹۵۹ء

(۵)

محترم ومکرم حکیم سید محمد یامین صاحب دام مجدکم!

السلام علیکم! گرامی نامے کا شکریہ، چربی گھٹانے کے لیے ڈاکٹر چکنائی کو منع کرتے ہیں اس لیے مکھن سے بچتا ہوں۔ البتہ انڈے کھا رہا ہوں اور صبح کو کھاتا ہوں شام کو مکھن میں شکر ملا کر کھانے سے کیا مراد ہے۔ وہی گڑ کی شکر یا کھانڈ یا چینی جس کو قند کہتے ہیں۔ شکر کو میں نہیں سمجھ سکا؟ اگر روغن بادام کا استعمال مناسب ہو تو اس کی ترکیب تحریر فرما دیجیے۔ بہر حال آج کل تو نزلہ سخت ہو رہا ہے۔ کل سے یہاں سردی بڑھ گئی ہے۔ حکیم ذوالنون صاحب، حکیم محمد ایوب صاحب، حکیم محمد یاسین صاحب کی خدمت میں سلام مسنون۔ میاں یوسف کو دعا۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۲۸ر اکتوبر ۱۹۵۹ء

حصہ سوم:

خطبات وتقاریر

اور

بیانات

خطبۂ صدارت

سحبان الہند حضرت مولانا حافظ احمد سعید دہلوی
جمعیت علمائے صوبہ متحدہ کے اجلاس ہفتم میں

مورخہ

۳/۴ ربیع الاوّل ۱۳۵۰ھ بمطابق ۱۹/۲۰ جولائی ۱۹۳۱ء کو
بمقام شہر میرٹھ (صوبہ متحدہ) پیش کیا

مطبوعہ

تجلی برقی پریس۔ دہلی

۱۹۳۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لا هله حمدًا یر تضیه والصلوٰة علٰی نبیه الجلیل النبیه و آله وکل من یحبه ویقتفیه

حیرت واستعجاب

علماء کرام اور معزز حاضرین! صدارتی تقریروں کی ابتداء میں انتخاب کرنے والوں کے شکریہ کی ایک رسم جاری ہوگئی ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ایک نااہل شخص کو اپنی معزز جمعیۃ علماء کا صدر منتخب کرنے میں حسن ظن کی سرحد سے تجاوز کیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی مکرم و مؤقر شخصیتوں کے بعد اُمت میں علماء ہی کے وجود کو ذی عزت واحترام تسلیم کیا گیا ہے۔ یہی جماعت ہے جس کو پیغمبری وراثت اور اُمت مسلمہ کی ہدایت کا صحیح استحقاق حاصل ہے۔ آپ خیال کیجیے کہ ایسی موقر وممتاز جماعت کی صدارت کے لیے مجھ جیسے نالائق کا انتخاب کہاں تک حق بجانب ہوسکتا ہے۔ میں آپ حضرات کی اس عزت افزائی کو ممکن تھا کہ ایک حد تک برداشت کر لیتا لیکن آپ نے مجھے یہ خدمت ایک ایسے صوبہ میں تفویض کی ہے کہ جو صدیوں سے اہل علم اور علمی مراکز کا گہوارہ رہا ہے۔ دار العلوم فرنگی محل، دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء کے علاوہ صدہا مدارس عربیہ اس وقت آپ کے صوبے میں موجود ہیں۔ ایک ایسے صوبے میں جو علمی حیثیت سے ہندوستان کا ممتاز صوبہ ہے میرے لیے صدارت کا انتخاب یقیناً ایسا انتخاب ہے کہ اس پر جس قدر حیرت واستعجاب کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ اس کے ساتھ ملک کی گوناگوں سیاسی پیچیدگیوں کا تقاضا بھی یہ تھا کہ آپ کسی ایسے تجربہ کار عالم کو اپنا صدر منتخب کرتے جو واقعی اس نازک دور میں صحیح رہنمائی کا اہل ہوتا لیکن میں افسوس کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ آپ نے اس اجلاس کی صدارت کے انتخاب میں تمام ضروری رعایتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بہر حال اب چونکہ بعض اکابر نے اس ناقابل برداشت بوجھ کو میرے کندھوں پر ڈال دیا ہے اس لیے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ میں انہی حضرات سے دعا کے لیے درخواست کروں تاکہ میں ان بزرگوں کی برکت سے اس خدمت کو انجام دے سکوں۔ **اللھم وفقنی لما تحب وترضی۔**

صوبہ متحدہ کی حالت

معزز حاضرین! جس صوبے میں آج آپ کا یہ مبارک اجتماع ہو رہا ہے۔ میں نے اس کی علمی اور مذہبی حیثیت کے متعلق ابھی آپ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ آپ کا یہ صوبہ جس طرح مذہبی علوم کے سلسلے میں ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے اسی طرح مغربی علوم کے اعتبار سے بھی اس صوبے کو ہندوستان میں خاص حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستان کا یہی ایک صوبہ ہے جہاں شاہان سلف کی تہذیب اور مسلمانوں کے پرانے تمدن کا اثر اس گئے گزرے زمانے میں بہت کچھ باقی ہے۔ اگرچہ نئی تہذیب نے بڑی حد تک مسلمانوں کے دل ودماغ پر قبضہ کرلیا ہے لیکن پھر بھی صوبہ یوپی میں بعض ایسے خاندان موجود ہیں جہاں شاہان مغلیہ کی دیرینہ تہذیب کا نمونہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ گو اس صوبے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور نئے بندوبست کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ساٹھ اور ستر کے درمیان مسلمانوں کی زمینداری بھی تباہ ہو چکی ہے لیکن باوجود اس کے اگر اس صوبے کے مسلمانوں کی اصلاح کا کام پوری توجہ اور محنت کے ساتھ کیا جائے تو یہاں کے مسلمان اپنے نقصانات کی ایک حد تک تلافی کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کی جمعیۃ نے صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی تنظیم اور اُن کی اصلاح پر توجہ کی تو میں سمجھتا ہوں کہ بہت جلد آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے اور اگر آپ نے یہاں کے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کر دی تو آپ اسلام کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دیں گے۔

یادِ رفتگان

حضرات! آپ کے صوبے کی معزز اور مایۂ افتخار ہستی مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی موت سے مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچا ہے وہ کسی مزید تشریح وتوضیح کا محتاج نہیں ہے۔ مولانا مرحوم کے ایثار وقربانی کا یہ اثر ہے کہ آج لاکھوں مسلمانوں کی آنکھیں اپنے محبوب رہنما کی یاد میں پرنم ہیں۔ مسلمان ایک عرصہ سے آزادیٔ وطن کے سبق کو فراموش کر چکے تھے لیکن مولانا

مرحوم کے صحیح جذبے نے ہزار ہا مسلمانوں کے قلوب میں احساس عمل کو از سر نو پیدا کر دیا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمان بھی ہندوستان کی دیگر اقوام کی طرح اپنے وطن کو اغیار و اجانب کے تسلط سے جلد از جلد آزاد کرانے کے خواہشمند ہیں۔

آپ کے صوبے کی دوسری باوقار ہستی پنڈت موتی لال نہرو کی وفات بھی حامیان وطن کے لیے ایک مصیبت کبریٰ ہے۔ پنڈت موتی لال کی موت بھی ایسے نازک زمانے میں واقع ہوئی جبکہ ہندوستان آزادی کی منزلوں کو طے کرنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ بہر حال موت و زندگی خدا کے قبضے میں ہے۔ ہمارے بس میں سوائے اس کے کیا ہے کہ ہم خادمان ملک کے لیے چند آنسوؤں کے قطرے بطور نذر پیش کریں اور مرنے والوں کے اس طریقہ کو جاری رکھیں جس پر وہ آخر وقت تک قائم رہے ہیں۔

ملک میں انقلابی دور

حضرات! دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی کوئی چیز بھی اپنی حالت پر قائم نہیں رہتی۔ کچھ سنت اللہ اسی طریقہ پر جاری ہوئی ہے۔ دنیا میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں اور مٹ گئیں۔ ایک حکومت کی جگہ دوسری حکومت اور ایک تہذیب کی جگہ دوسری تہذیب قائم ہوئی اور ختم ہوگئی۔ بابل کی تہذیب، مصر کی تہذیب، یونان کی تہذیب، ایران کی تہذیب ان تمام تہذیبوں نے اپنے اپنے زمانے میں عالمگیر صورت اختیار کی لیکن آج ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔ ملک کے مالک، تخت و تاج کے مالک، جاہ و حشم کے آقا آج قبروں کے اندر گمنامی اور تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں اور اُن کی جگہ دوسرے مالک ہیں۔ تاجدروں کی اولاد گداگری کر رہی ہے اور فقیر و دریوزہ گر تخت و تاج کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوا ہے اور قیامت تک یہی ہوتا رہے گا۔ کم ترکوا من جنت وعیون وزروع و مقام کریم کذلک و اورثنہا قوما آخرین۔

چشم عبرت بیں کشاؤ حال شاہاں رانگر	تا چناں از گردشِ گردونِ گرداں شد خراب
پردہ داری میکند برقصر قیصر عنکبوت	بوم نوبت مے زند بر گنبد افراسیاب

آج جس انقلاب کی آوازوں کو آپ درودیوار سے سن رہے ہیں وہ نئی آوازیں نہیں، مسلمان اس آواز سے دہلے جاتے ہیں لیکن میں عرض کروں گا کہ یہ آواز کوئی نئی نہیں ہے۔ تم بھی جب حجاز سے اپنی تہذیب لے کر نکلے تھے تو یہی انقلابی نعرہ لگاتے ہوئے نکلے تھے۔ براعظم افریقہ، ایشیا اور یورپ کا بہت بڑا حصہ تمہارے انقلابی نعروں سے آج تک گونج رہا ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ اسپین میں یولاجیس کے رضا کار بھی یہی نعرہ لگاتے تھے اور کیا تم فراموش کر چکے کہ چنگیز خانی فوج بھی یہی نعرہ لگاتی ہوئی بغداد میں گھسی تھی اور کیا تمہیں خبر نہیں کہ میرٹھ سے جو فوج ناراض ہو کر دہلی گئی تھی وہ بھی انقلاب زندہ باد کہتی ہوئی گئی تھی۔

حضرات! اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تمام دنیا مجموعۂ انقلاب ہے۔ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات۔ سردی کے بعد گرمی اور گرمی کے بعد برسات بچپنے کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد بڑھاپا۔ کیا یہ انقلاب نہیں ہے۔ پھر آج انقلاب سے حیرت و استعجاب کیوں ہے۔ حکومت برطانیہ ایک عرصہ تک ان صداؤں سے محفوظ رہی جس طرح اس سے پہلے حکمراں اس آواز سے محفوظ رہے لیکن جس طرح وہ ایک وقت معینہ پر اپنی حکومت سے دستبردار ہو گئے اسی طرح حکومت برطانیہ کے لیے بھی یہ وقت قریب ہے کہ وہ حکومت سے دستبردار ہو کر ملک اہل ملک کے سپرد کر دے۔

انگریزوں کا طرزِ عمل

معزز حضرات! میں افسوس کے ساتھ اس امر کے ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ انگریزوں کا طرزِ عمل اس ملک کے باشندوں کے ساتھ اچھا نہیں رہا۔ انگریز پیشتر اس ملک میں تجارت کی غرض سے آئے۔ ابتدا میں صرف یہ اس امر کی کوشش کرتے رہے کہ ان کے مال کا محصول معاف کر دیا جائے اور ان کو سکونت کی غرض سے تھوڑی سی زمین دے دی جائے۔ جب یہ اس درخواست میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے اس ملک کی تجارت کو آہستہ آہستہ تباہ کرنا شروع کر دیا اور ملک کی خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھا کر اس ملک پر قابض ہو گئے۔ کمپنی نے قبضہ کرنے کے بعد اس ملک کو حکومت انگلستان کے ہاتھ فروخت کر دیا جس کا روپیہ بھی خود ہندوستان ہی

کے ذمے ڈالا گیا۔ گویا ہم ہی فروخت ہوئے اور اس فروختگی کی قیمت بھی ہم کو ہی دینی پڑی اور جب ہم بدقسمت اپنی قیمت ادا نہ کر سکے تو سود در سود لگا دیا گیا۔ انگریزوں نے ایک طرف ملک کی صنعت و حرفت کو تباہ کر دیا اور دوسری طرف ہمارے ملک کو اپنے اقتدار کے بقاؤ استحکام گودام بنالیا۔ دنیا بھر کو غلام بنانے کے لیے ہمارے ملک کا روپیہ اور ہمارے ملک کے آدمی استعمال کیے گئے۔ حتیٰ کہ جزیرۃ العرب اور خلافت اسلامیہ کو تباہ کرنے کے لیے بھی ہم ہی استعمال کیے گئے اور مسلمانوں کا خون مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے بہایا گیا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان روز بروز غریب ہوتا چلا گیا۔ ہندو تو اپنی دولت کی وجہ سے کچھ دنوں اس افلاس کا مقابلہ کر سکا لیکن مسلمانوں کا حال تو اتنا تباہ ہوا ہے کہ شاید انگریزوں کے جانے کے بعد بھی سو برس تک مسلم قوم کا پنپنا مشکل ہے۔ مسلمانوں کا بیشتر حصہ مزدور پیشہ ہے اور مزدور ہی آج بیکار ہے تو مسلمانوں کو جس قدر اس حکومت سے نقصان پہنچا ہے اُس کا صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ آج کل اس ملک میں جو انقلابی کیفیت آپ دیکھ رہے ہیں انگریزوں کے اُسی طرزِ عمل کا نتیجہ ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اب اس ملک میں انگریزی حکومت اور تجارت دونوں کا قائم رہنا مشکل ہے۔

ہندو مسلم فساد

محترم حاضرین! ایک طرف حکومت نے جو سلوک اہل ہند کے ساتھ کیا ہے وہ آپ پر مخفی نہیں ہے۔ دوسری طرف ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات ہیں جن پر کوئی بھی ملک کا بہی خواہ افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کانپور، بنارس، مرزا پور، آگرہ کے فسادات تو اسی صوبے میں ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی ملک کے دوسرے حصوں سے چھوٹے چھوٹے فسادوں کی خبریں وصول ہوتی رہتی ہیں۔ کانپور میں اگرچہ بظاہر امن و امان ہو چکا ہے لیکن قلوب مطمئن نہیں ہیں۔ ہزار ہا انسان بے خانماں ہو چکے ہیں اور سینکڑوں کی تعداد میں جیل خانے کی مصیبت برداشت کر رہے ہیں۔ فریقین اپنے اپنے فسادیوں کی ہمت افزائی کر رہے ہیں اور اس امر کی کوشش کی جا رہی ہے کہ فساد کی تمام ذمہ داری ایک فریق اپنے مقابل حریف پر عائد کرے۔

تقریروں اور تحریروں کا پورا زور اسی پر خرچ کیا جا رہا ہے کہ اپنے فریق پر کوئی الزام نہ قبول کیا جائے۔ مسلمان بچوں اور عورتوں کو بلا امتیاز قتل کرنے کے بعد بھی ہندو اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ فساد کی تمام ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کر دی جائے۔ اسی طرح مسلمانوں کے بعض خودساختہ لیڈر بھی مختلف مقامات پر مفسدین کی حمایت کر کے ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں۔ گویا فریقین کے نزدیک قومی خدمت کا یہ ایک جز بن گیا ہے کہ اوّل اشتعال دلا کر فساد کراؤ اور پھر اپنے اپنے گروہ کی صفائی پیش کرنے میں پوری قوت خرچ کر دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ کار جو ان قومی خادموں نے اختیار کر رکھا ہے، ملک کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں ہے۔ اگر ہم غور کریں تو اس کا علاج خود ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اگر ہم ان مفروضہ خدام کو اُن کی خدمت سے سبکدوش کر دیں تو ان کی عقل درست ہو جائے اور یہ اس خونریزی کی روٹی کھانی چھوڑ دیں۔ اس سلسلے میں میں ملک کے سنجیدہ اور امن پسند طبقے سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہندو مسلم مشترکہ بورڈ اور چھوٹی چھوٹی پنچایتیں ہر جگہ قائم کریں اور فرقہ وارانہ معاملات کو خود باہمی رواداری کے ساتھ طے کرنے کا طریقہ اختیار کریں تاکہ اس قسم کے مذموم واقعات کا صحیح انسداد ہو سکے۔

مسلمانانِ کشمیر پر ظلم

ایک عرصہ سے ریاست کشمیر کے مسلمانوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں اُن کا تذکرہ آپ اخبارات میں پڑھتے ہوں گے۔ جس ریاست میں تقریباً نوے فیصدی مسلمان آباد ہوں وہاں مسلمانوں کی اس قدر خراب حالت ہے کہ شاید ریاست کے جانور بھی اُن سے بہتر زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ اس زمانے میں کسی ریاست کے رئیس کا اپنی رعایا کی اکثریت سے تغافل برتنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے میں نے مہاراجہ کشمیر کو ایک تار دیا تھا جس میں اُن سے اس امر کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ جمعیۃ علماء ہند کے ایک وفد کو اجازت دیں تاکہ وہ کشمیری مسلمانوں کے حالات کی تحقیق کر سکے لیکن افسوس ہے کہ مہاراجہ نے اجازت نہیں دی۔ اگر جمعیۃ علماء ہند کا وفد کشمیر پہنچ جاتا تو شاید میں آج اس قابل ہوتا کہ آپ کو مسلمانوں کے صحیح حالات سے مطلع کر

سکتا۔ حال ہی میں گولی چلانے اور تین سو مسلمانوں کے شہید و مجروح ہونے کی جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں وہ انتہائی خوفناک اور بہت زیادہ مایوس کن ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید رئیس مسلمانوں کے مطالبات کو اپنی قوت کے گھمنڈ پر دبانا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو مہاراجہ کو اس کے عدم امکان کا یقین کر لینا چاہیے آج کل کسی قوم کے جذبات کو قوت سے دبانا آسان نہیں ہے۔ اگر مہاراجہ اپنی ریاست میں امن اور خوشحالی کے خواہشمند ہیں تو اُن کو مسلم مطالبات کی جانب جلد از جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہے ورنہ اس سے زیادہ خطرناک نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ مسلمانوں کے خون کی قیمت مہارانی کے پانچ ہزار روپے نہیں ہو سکتے بلکہ اُن کے خون کی اصل قیمت مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور مسلمانوں کو انسان سمجھنا ہی ہو سکتا ہے۔

سول نافرمانی اور جمعیۃ علماء ہند

حضرات! گزشتہ تحریک سول نافرمانی میں جمعیۃ علماء ہند نے جس استقلال اور مستعدی سے حصہ لیا ہے وہ مسلمانوں پر پوشیدہ نہیں ہے۔ جمعیۃ علماء ہی کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمانانِ ہندوستان کسی دوسری قوم سے شرمندہ نہیں ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند نے ۶ مئی ۱۹۳۰ء کو سول نافرمانی کی اسکیم اور کانگریس کی شرکت کا رزولیوشن پاس کیا تھا جس وقت امروہہ میں یہ تجویز پاس کی جا رہی تھی اُس وقت خوف و طمع اور ترغیب و ترہیب کی تمام منزلیں جمعیۃ علماء ہند کے سامنے موجود تھیں لیکن اس حق گو جماعت کے ارکان نے تمام خطرات و مطامع سے بے نیاز ہو کر آزادیٔ وطن کے راستے میں قدم بڑھایا اور دوسرے مسلمانوں کو بھی دعوت دی۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے جمعیۃ علماء کی آواز کو سنا، قبول کیا اور سرکاری طبقہ کی مخالفانہ جدوجہد کے باوجود بارہ ہزار مسلمان جیل میں گئے۔ جس جماعت سے یہ توقع تھی کہ وہ میدانِ جنگ میں ہماری رہنمائی کرے گی۔ ہمیں افسوس ہے کہ اُس نے ہمت ہار دی اور اُس نے مسلمانوں کو رجعت پسندی پر مجبور کیا۔ جس طبقے نے اپنے سیاسی معلم ہونے کا بارہا فخر کیا۔ افسوس ہے کہ وہ استاد خود اس موقع پر اُس سبق کو بھول گیا۔ مغربی تعلیم کے حاصل کرنے والوں نے ٹھوکر کھائی اور بوریہ نشین کامیاب ہو گئے۔ اُنہوں نے دنیا کو بتا دیا کہ جن لوگوں کو تنگ خیال اور دقیانوسی

کہا جاتا تھا اور جن کو ڈرپوک اور مفت کی روٹیاں توڑنے والا بتایا جاتا تھا وہ ہی میدانِ جنگ کے شہسوار بنے اور انہوں نے عالم اسلامی کے مظلوم مسلمانوں کی دعائیں حاصل کیں۔ بزدل اور سیاست سے ناآشنا بہادر بن کے نکلے اور کامیاب ہو کر لوٹے اور انہوں نے اپنے ایثار و قربانی سے یہ ثابت کر دیا کہ اُمت کی صحیح رہنمائی اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ علماء ہی کا طبقہ ہے۔ جن کو اپنی بہادری اور سیاستدانی پر ناز تھا وہ تذبذب کی دلدل میں پھنس کر رہ گئے اور زمانۂ جنگ میں بجائے مظلوم کے ظالم کی مجلس استبداد میں ایٹ ہوم کے مزے لوٹتے رہے، لیکن ایک جماعت نے جیل خانوں کی کوٹھریوں میں رات گزاری۔ ہر طرح کے مصائب برداشت کیے، مالی نقصانات اُٹھائے اور دنیا کو یہ بتا دیا کہ آزادی وطن کا سچا حامی کون ہے! آپ میں سے جو لوگ عربی اخبارات پڑھتے ہوں گے اُن کو معلوم ہوگا کہ جمعیۃ علماء ہند کے اس فیصلے کو عالم اسلامی نے کس نظر سے دیکھا ہے؟

صاحبو! ملک فقط ہندو کا نہیں ہے۔ یہ ملک جس طرح ہندو کا ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی ہے۔ آخر یہ کون سا طریقہ ہے کہ جب قربانی کا وقت آئے تو ہم اپنے عشرت کدوں میں بیٹھ کر سول نافرمانی کرنے والوں کا مذاق اُڑائیں اور جب حقوق ملنے کا وقت آئے تو ہم سب سے آگے آ کر کھڑے ہو جائیں۔ یہ ہے وہ طرزِ عمل جس کے باعث آج ہم دوسری قوموں کے لیے سنگ راہ ہیں۔

حقوق کا سوال!

جہاں تک حقوق کا سوال ہے میں اس کو صاف طور پر عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی رائے عامہ کا پورا احترام کیا جائے گا اور کسی ایسے معاہدے کو جسے جمعیۃ علماء کی تصدیق حاصل نہ ہوگی، جسے مسلمان عام طور پر قبول نہ کر لیں۔ مسلمانوں کے حقوق کا جہاں تک سوال ہے جمعیۃ علماء اس میں کسی ادنیٰ سی مداہنت کے لیے بھی آمادہ نہیں ہے۔ البتہ سرکاری مسلمانوں کی ذمہ داری کا کوئی وعدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جن کا مقصد حقوق مسلمین کی حفاظت نہیں بلکہ گورنمنٹ کے حقوق کی حفاظت ہے۔ جو لوگ گورنمنٹ کے ملازم ہو کر مسلمانوں کے

لیڈر بننا چاہتے ہیں۔ اُن کو مطمئن کرنا جمعیۃ علماء کے امکان میں نہیں ہے لیکن جہاں تک مسلم مفاد کا معاملہ ہے اُس کے متعلق میں آپ حضرات سے پرزور درخواست کرتا ہوں کہ اُس پر آخر تک قائم رہیے اور اس میں کسی کمی کو قبول نہ کیجیے۔

مسلمانوں کے لیے اصلاحی اسکیم

حضرات! مسلمانوں کی اس وقت عجیب حالت ہے جس شعبے میں دیکھیے ان کا شیرازہ منتشر ہے۔ اقتصادی اور معاشرتی تباہی نے اپنے دامن اس قدر وسیع کیے ہیں کہ مسلمانوں کو اُس سے نجات ملنی مشکل ہوگئی ہے۔ آپ کی جمعیۃ کو اپنے صوبے میں فوراً کام شروع کر دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے جمعیۃ کو تمام صوبے میں پھیلا دینا چاہیے۔ کوئی ضلع اور کوئی تحصیل ایسی نہ ہو کہ جہاں آپ اپنی شاخ قائم نہ کرلیں تاکہ آپ کی آواز ہر شہر اور ہر قریہ میں پہنچ سکے۔ غیر علماء کی جماعت یا کمیٹی کا صرف اس قدر کام ہو کہ وہ آپ کی تجاویز اور اعلانات عام مسلمانوں کو پڑھ کر سنا دے اور اُن سے عمل کرنے کا عہد لیں۔ جمعیۃ کے مطبوعہ عہد نامے ہر شخص کے پاس موجود ہوں۔ جس پر عہد کرنے والے کے دستخط یا انگوٹھے کا نشان حاصل کرلیا جائے۔ جب آپ کی جمعیۃ منظم ہو جائے تو آپ مسلمانوں کے سامنے صرف تین باتیں پیش کریں۔

(۱) سود دینے سے اجتناب کرنے کا عہد (۲) مراسم غیر شرعیہ کے ترک کا عہد

(۳) اپنے ملک کے بنے ہوئے کپڑے کا استعمال

اگر اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے رضا کاروں کی ضرورت ہو تو ہر مقام پر رضا کاروں کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھی بنا دی جائیں۔

معزز علماء کرام! ہمارے کام میں عام طور سے ناکامی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم پروگرام ایسے لمبے چوڑے بناتے ہیں جس کو مسلمان پڑھ کر گھبرا جاتے ہیں۔ پھر اُس پر عمل کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ میں چاہتا ہوں کہ مختصر پروگرام پیش کیا جائے لیکن پروگرام پر پوری قوت خرچ کی جائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اُس پر عامل بنایا جائے۔ ممکن ہے کہ آپ

حضرات اس کو معمولی کام سمجھتے ہوں لیکن یہ بہت بڑا کام ہے۔ اس کے لیے آپ دورے کیجیے جو مسلمان سود میں مبتلا ہوں اُن کی اشیاء فروخت کر دیجیے یا بلا سودی قرض کی طرف منتقل کر دیجیے۔ بہر حال آپ اس کام کو آسان نہ سمجھیے۔ مراسم غیر شرعیہ اور اسراف سے مسلمانوں کو بچانا ہی مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت ہے۔ آج لاکھوں مسلمان اس اسراف کے باعث تباہ ہو چکے ہیں۔ اسی طرح دیسی کپڑے کا استعمال بھی مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ ہاتھ کا کتا ہوا اور ہاتھ کا بنا ہوا استعمال کریں لیکن اگر مسلمان اس کے لیے آمادہ نہ ہوں تو زیادہ سختی سے کام نہ لیا جائے بلکہ ہندوستانی مل کے بنے ہوئے پر اکتفا کر لیا جائے۔ چونکہ بدقسمتی سے مسلمان اس کو بھی سیاسی مسئلہ یا ہندو تحریک سمجھتے ہیں اس لیے اُن کے قلوب سے شبہ کو دور کیا جائے اور اُن کو دیسی ساخت کے کپڑوں کے فوائد سے آگاہ کیا جائے اور اُن کو بتایا جائے کہ یہ مسلمانوں کے فائدے کی تحریک ہے۔ مجھے اس پر اصرار نہیں ہے کہ ان تین چیزوں کے علاوہ اور کوئی چیز ضروری نہیں ہے بلکہ میں نے آسان اور کم سے کم چیز کو اختیار کیا ہے تاکہ مسلمان آسانی سے اس پروگرام کو پورا کر سکیں اور اُن کو سیاست کے نام سے وحشت بھی نہ ہو۔

مدارس عربیہ اور طریقۂ تعلیم

محترم علماء کرام! میں ایک عرصہ سے اس امر کی کوشش کر رہا ہوں کہ عربی مدارس میں نہ صرف درس نظامی میں تبدیلی کی جائے بلکہ طریقۂ تعلیم کو بھی بدل دیا جائے۔ طریقۂ تعلیم بالکل نئے اصولوں پر جاری کیا جائے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی کامیابی کی شکل نظر نہیں آتی۔ اگر درس نظامی پر اصرار ہو تو اُس کو بحالہٖ قائم رکھیے لیکن کم از کم عربی مدارس میں جغرافیہ، حساب، تاریخ اسلامی اور ترجمۃ القرآن ضرور داخل کر لیجیے۔ ان مضامین کو لازمی طور پر رکھیے۔ اگر کوئی طالب علم ان مضامین میں سے کسی ایک میں بھی فیل ہو تو اُس کو سند نہ دیجیے۔ میرا یہ منشاء نہیں ہے کہ آپ آج ہی سے تمام مدارس میں ان چیزوں کو داخل کر لیجیے بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ ایک یا دو مدرسوں کو مخصوص کر لیجیے۔ صرف اُنھی مدارس میں ان چیزوں کا تجربہ

کیجیے۔ اگر آپ دیکھیں کہ یہ چیزیں علماء کے لیے مفید ہیں اوران چیزوں کے حاصل کرنے سے ایک نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے تو پھر دوسرے مدارس میں بھی جاری کر دیجیے۔ اسی طرح طرزِ تعلیم کو بھی کسی ایک مدرسہ میں جاری کیجیے اور یہ دیکھیے کہ اس سے تعلیم میں آسانی ہوئی ہے یانہیں؟ اُستاد کو سمجھانے میں اور شاگرد کو سمجھنے میں اگر کوئی سہولت معلوم ہوتی ہو تو پھر دوسرے مدارس میں جاری کر لیجیے۔ ہر ایک کام ابتدا میں مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن جب کوئی سنت حسن کو جاری کر دیتا ہے تو پھر متبعین کے اجر کا بھی وہی وارث ہوا کرتا ہے۔ ہر بہترین چیز مومن ہی کی گمشدہ چیز ہے۔ پھر آپ اُس سے کیوں دبا کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ میرا مشورہ غلط ثابت ہو تو اُس کو ترک کر دینے کا ہر وقت آپ کو حق ہوگا۔ اسلامی تاریخ کے متعلق مجھے اس پر اصرار نہیں ہے کہ وہ عربی میں ہو۔ اگر عربی کی تاریخ آپ پسند کریں تو تاریخ کامل یا خطیب بغدادی کی تاریخ جو زیرِ طبع ہے اگر وسیع پیمانے پر معلومات میں اضافہ کرنا مقصود ہو تو صبح الاعشیٰ کو درس میں داخل کر لیجیے لیکن اگر آپ بجائے عربی کے کوئی اُردو کی تاریخ پڑھانا چاہیں تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تاریخ کو لازم کر دیجیے، تاریخ کی زبان خواہ کچھ بھی ہو۔ اسی کے ساتھ ایک اور بھی گزارش ہے اور وہ یہ کہ عربی مدارس کے طلباء پر کتابت کو بھی لازم کر دیا جائے اور خوشخطی کا بھی باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ عام مضامین کے ساتھ کتابت کا بھی امتحان لیا جائے۔ جو طالب علم کتابت میں پاس نہ ہو اُس کی سند میں لکھ دیا جائے کہ اس کا خط اچھا نہیں ہے۔ اگر آپ نے یہ چند معمولی اصلاحات قبول کر لیں اور ان کو رائج کر دیا تو آپ چند ہی سالوں میں ان اصلاحات کے منافع اور فوائد کو ملاحظہ فرمائیں گے۔ میں نے اس سلسلے میں بہت ہی اختصار سے کام لیا ہے اور آپ کی خدمت میں صرف چند باتیں پیش کی ہیں تاکہ آپ کو ان کے اجرا میں آسانی ہو۔ اگر میری یہ ناچیز گزارش طلباء عربی کے لیے مفید ثابت ہو تو آپ باقی مدارس میں بھی اس کو جاری کر دیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ہمارے مدارس میں بہت زیادہ اصلاحات کی ضرورت ہے لیکن میں نے سہل سے سہل صورت اختیار کی ہے۔ تاکہ آپ کو بھی اُس کے قبول کرنے میں کوئی دُشواری نہ ہو۔

ساردا ایکٹ

محترم حاضرین! گزشتہ سال اسمبلی میں ایک قانون صغر سنی کی شادی کے متعلق پاس کیا گیا تھا۔ یہ قانون اسلامی پرسنل لا کے صریح مخالف اور منافی تھا۔ جمعیۃ علماء ہند نے اس قانون کو مسترد کرانے کے لیے ہر قسم کی آئینی جدوجہد کی لیکن حکومت جس کی ضداب آئینی چیخ و پکار سے بالاتر ہو چکی ہے اور جو اپنے قانون کو خود ہی ذلیل کرانا چاہتی ہے اُس نے کوئی توجہ نہیں کی۔ تمام ہندوستان میں ہڑتالیں ہوئیں، جلوس نکالے گئے، جلسے ہوئے لیکن لارڈ اروِن نے جب تقریر کی تو اس منحوس قانون کی حمایت ہی کی۔ صدر جمعیۃ علماء ہند نے ایک مفصل مکتوب میں وائسرائے کو توجہ دلائی اور صاف طور پر بتایا کہ ہم صغر سنی کی شادی کو رائج کرنا نہیں چاہتے نہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ ہم چھوٹے بچوں کی شادی کو ضروری یا لازمی جانتے ہیں لیکن شریعت اسلامیہ نے جس امر کی اجازت دی ہے اُس کو ہم قانون سے ناجائز کرنا نہیں چاہتے۔ نکاح مسلمانوں کا ایک مذہبی مسئلہ ہے اس قانون سے خالص مذہبی مسئلے میں مداخلت لازم آتی ہے۔ ان تمام تنبیہات کے باوجود بھی گورنمنٹ اپنے اصرار پر قائم رہی۔ تمام آئینی مراحل کے بعد بھی جب گورنمنٹ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو یکم اپریل ۱۹۳۰ء کو جو اس قانون کے نفاذ کی تاریخ تھی عام طور سے اس قانون کی سول نافرمانی کی گئی۔ گورنمنٹ نے اُس وقت کوئی گرفتاری نہیں کی لیکن قانون کو منسوخ نہیں کیا۔ اگرچہ یہ قانون مردہ ہو چکا ہے لیکن موجود ضرور ہے۔

محمد دین ملک کا مسودۂ قانون

ملک صاحب پنجاب کونسل میں ایک مسودۂ قانون پیش کرنے والے ہیں جس کا مفاد یہ ہے کہ آئندہ سے مسلمانوں کے مذہبی معاملات مثلاً وراثت، ہبہ، وصیت، نکاح، مہر، طلاق وغیرہ میں مسلمانوں کے تمام فیصلے شریعت اسلامی کے موافق ہونے چاہئیں۔ امور مذکورہ بالا میں کسی شخص کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنا فیصلہ رواج کے موافق کرائے۔ میرا خیال ہے کہ ملک صاحب کے اس مسودہ کی تمام مسلمانوں کو حمایت کرنی چاہیے۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ

مسلمان متفقہ طاقت کے ساتھ گورنمنٹ سے قاضی کے حق کو تسلیم کرائیں جب تک بااختیار قاضیوں کا تقرر نہیں نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے مرض کا صحیح علاج نہیں ہوسکتا۔ ملک کے ہر گوشے سے مسلمان اس قسم کی آواز بلند کریں کہ جن مسائل کے لیے شریعت اسلامی میں قاضی کا فیصلہ ضروری ہے اُن کے لیے قاضی کے تقرر کی ضرورت ہے۔ گورنمنٹ مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کرے اور مقررہ قاضی جو فیصلہ کر دے وہ نافذ سمجھا جائے۔ اس کام کے لیے روپیہ اور وقت کی ضرورت ہوگی لیکن اگر کوشش کی جائے تو مسلمان کامیاب ہوسکتے ہیں۔ اگر پنجاب کونسل میں محمد دین صاحب کا مسودہ منظور ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں آپ کے اصلی مطالبے کو بہت کچھ تقویت حاصل ہوگی اس لیے ملک صاحب کے مسودہ کی آپ حضرات کو پرزور تائید کرنی چاہیے۔

مسلمانانِ طرابلس پر وحشت ناک مظالم

حضرات! مجھے یہاں طرابلس اور برقہ کے مظلوم مسلمانوں کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے اور اٹلی کی ''مہذب'' حکومت نے جن شرمناک اور حیوانی افعال کا ارتکاب کیا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالنی ہے۔ ۱۹۱۲ء تک طرابلس (ٹریپولی) ترکی حکومت کے زیر نگیں تھا لیکن اس کے بعد یہ تمام علاقہ شمالی افریقہ کی اٹلی نوآبادی بنا دیا گیا۔ طرابلس پر اٹلی نے کس طرح قبضہ جمایا اور دول یورپ نے ترکی کے اٹلی کو کہاں تک امداد دی؟ یہ ایک داستان پارینہ ہے جس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں لیکن اشارتاً یہ سمجھ لیجیے کہ طرابلس کو ترکی حکومت سے نکال کر اس پر اٹلی کی سیادت کو قائم کرانے میں برطانیہ عظمیٰ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ترکی افواج کے لیے نہر سویز کا راستہ برطانیہ ہی نے بند کیا تھا۔ جس وقت طرابلس سے ترکی نے اپنی افواج کو واپس بلایا ہے اس وقت سب سے پہلے برطانیہ نے ہی اٹلی کے اس حق کو تسلیم کیا تھا اور اس کی حکمرانی پر خوشیاں منائی تھیں۔ طرابلس، برقہ اور جبل اخضر کی کل آبادی دس لاکھ افراد پر مشتمل ہے جو سب کے سب عرب مسلمان ہیں۔ جنگ عمومی کے زمانہ میں طرابلس کے مسلمانوں پر اٹلی کے سفاک درندوں نے جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے اور جس طرح مظلوم اور بے گناہ مسلمانوں کا خون بہایا

وہ تاریخ کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ اس کے بعد بھی اٹلی نے مسلمانوں کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا اور وہ برابر ان کے استیصال کرنے پر تلی رہی۔ شیخ سنوسی کے خاندان اور ان کے سلسلہ کے لوگوں کو قریب قریب ختم کر دیا گیا ہے اور ان کے اوقاف و املاک، مدارس و مساجد اور خانقاہوں پر خود حکومت نے قبضہ کر لیا ہے۔ اس خاندان کے افراد کو اس لیے فنا کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے اندر صحیح اسلامی جذبہ رکھتے ہیں۔ اسلامی شریعت کی پابندی ان کی زندگی کا اصل اصول ہے اور نظم و امامت ان کو خاندانی ورثہ میں ملی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم میں یہ تمام صفات جمع ہوں وہ مستعمرین مغرب کے عتاب سے کس طرح بچ سکتی ہے۔

طرابلس اور برقہ کے مسلمانوں پر اٹلی کی جابر اور ظالم حکومت نے جو مظالم ڈھائے ہیں ان کے اصل اسباب کو تلاش کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ حکومت اٹلی مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے کس طرح بہانے تلاش کر رہی ہے۔ مسلمانوں کا قصور اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے سنوسی خاندان کے اوقاف اور خانقاہوں کی ضبطی کے خلاف احتجاج کیا تھا جس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ وہ اپنے بال بچوں، معصوم عورتوں اور بوڑھوں سمیت ذبح کر ڈالے گئے۔ بلا امتیاز مرد و عورت سب کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ پردہ نشین خواتین کو جبراً فوج میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ بچیاں جو سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچی تھیں ان کی عصمت دری سے بھی اجتناب نہیں کیا گیا۔ مسلمانوں کو ہوائی جہازوں میں بھر بھر کر چار چار سو فٹ کی بلندی پر لے جایا جاتا ہے اور پھر ان کو وہاں سے نیچے گرا دیا جاتا ہے اور جس وقت مردہ لاشیں زمین پر گرتی ہیں تو فوجی سپاہی تالیاں بجا کر اور خوش ہو کر کہتے ہیں کہ ''مسلمانو! اب تم اپنے پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بلاؤ تاکہ وہ تم کو ہمارے ہاتھوں سے نجات دلائیں''۔ امیر عادل امیر شکیب ارسلان کے اعلان سے معلوم ہوا کہ جبل اخضر سے اسی ہزار مسلمانوں کو بے آب و گیاہ جنگل میں نکال دیا گیا جہاں وہ اور ان کے مویشی ہزاروں کی تعداد میں بھوک اور پیاس کی وجہ سے شہید اور ہلاک ہو گئے وغیرہ

صاحبان! یہ واقعات ہیں جو حقیقت اور اصلیت پر مبنی ہیں اور جن کو پروپیگنڈہ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے لیکن ان مظالم پر پردہ ڈالنے کے لیے اٹلی کے سفرا ان کی تکذیب کر رہے ہیں اور عالم اسلامی کو یقین دلا رہے ہیں کہ حکومت اٹلی ان بہیمانہ افعال کا ہرگز ارتکاب نہیں کر سکتی

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعات سرے سے نمودار ہی نہیں ہوئے تو دنیا میں یہ مفروضہ واقعات کس طرح پھیل گئے اور ہزارہا عرب طرابلس اور برقہ سے بھاگ کر مصر میں کیوں آئے۔ کفرہ کے عربوں نے مصر میں کیوں آ کر پناہ لی اور یہ مظلوم برطانوی سوڈان، فرانسیسی سوڈان، ٹیونس اور جزائر افریقہ میں کس لیے بے سروسامانی کی حالت میں پہنچے؟ پھر ان مظالم کی تصدیق کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ طرابلس کے قائد اکبر سیّد عمر مختار نے جو مکتوب امیر شکیب ارسلان کے نام لکھا ہے اس میں ان مظالم کی نہ تصدیق کی گئی ہے بلکہ یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اب تک جن مظالم کا علم دنیا کو ہوا ہے وہ اُن مظالم کا کم سے کم حصہ بھی نہیں ہے جو اٹلی کی طرف سے یہاں کے مسلمانوں پر برپا کیے جا چکے ہیں۔ سیّد عمر کے مکتوب کے اصل الفاظ یہ ہیں:

كل ما ذكرتموه عما اقترفته ايدى الا يطاليين هو قليل من كثير وانما لو يذكر للعالم كل ما يقع من الايطاليين لا تجد اذاناً تسمع لما يرونه من استحالة وقوعه والحقيقة والله و ملائكته شهود انه صحيح (الشوریٰ ۸ صفر ۱۳۵۰ھ)

اس شہادت کے بعد واقعہ کی اصلیت میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خود اٹلی کے اخبارات نے ان مظالم کو کسی نہ کسی پیرایہ میں تسلیم کر لیا۔ چنانچہ جریدۂ الشوریٰ نے ان اخبارات کے بعض اقتباسات درج کیے ہیں جن میں سے ایک ذیل میں درج ہے۔

نشرت جريدة "جورنالى ويتالبا" تقول. ان نزع السلاح السكان بطرابلس وبرقة وحل الآيات الجنود الوطنيين وانزال القبائل الرحل فى اما كن معنية كل ذالک اقتضته ضرورة حصر الثورة وتحديد نطاقها. (الشوریٰ ۱۵ صفر ۱۳۵۰ھ)

یعنے طرابلس اور برقہ کے باشندوں سے اسلحہ کا چھین لینا، فوج کا حملہ کرنا اور قبائل کا کسی دوسری جگہ منتقل کر دینا ہنگامہ پر قابو پانے کے لیے ضروری تھا لیکن باوجود اس کے کہ طرابلس کے عرب بھاگ بھاگ کر دور دراز مقامات میں پہنچے، خود سیّد عمر مختار نے اس کی تصدیق کی اور

اٹلی کے اخبارات نے ان مظالم کا اعتراف کیا پھر بھی اٹلی کے سفرا کا بے باکی سے یہ اعلان کرنا کہ یہ واقعات سراسر بے بنیاد ہیں یہ مسلمانانِ عالم کے زخموں پر نمک پاشی نہیں تو اور کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ طرابلس کے غیور اور مجاہد مسلمان کلیتًا فنا کیوں نہ ہوں جائیں لیکن وہ حریت و استقلال کے لیے برابر حرکت کرتے رہیں گے اور جب تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جائیں گے اس وقت تک وہ اپنے خون کا سیلاب بہانے میں دریغ نہ کریں گے۔ اُمید ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکومت کی مزاحمت کا خیال کیے بغیر اسلامی شوکت کے علمبردار طرابلسی مسلمانوں کی مظلومی کے خلاف مؤثر احتجاج کرتے رہیں گے اور اٹلی کے مال کا بائیکاٹ کر کے دنیا پر ظاہر کر دیں گے کہ مسلمانانِ ہند کے قلوب اپنے طرابلسی مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہیں۔

صوبہ سرحد کی آزادی

حضرات! اب میں اس بدنصیب صوبہ کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو ہندوستان کے شمال مغربی سرحد پر واقع ہے۔ اس صوبہ کی مجموعی آبادی کم وبیش ۱/۴ کروڑ ہے جس میں ۹۵ فیصد مسلمان ہیں۔ یہ مسلمان تقریباً تمام پٹھان ہیں اور ان کی زبان پشتو ہے۔ انتہائی شمالی علاقہ یعنی چترال کی زبان چترالی ہے لیکن وہاں بھی پشتو اچھی طرح بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ سرحدی اقوام کی سیرت کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ فطرتاً جمہوریت پسند ہیں۔ ان کی مذہبی حالت تمام دنیا کے مسلمانوں سے بہتر ہے اور اُن کی بہادری، شجاعت، پاسِ عہد، بلند حوصلگی، غیرت اور مہماں نوازی ایسی چیزیں ہیں جن سے کوئی منصف مزاج انسان انکار نہیں کر سکتا۔ ذہنی اور فکری قابلیتوں میں بھی وہاں کے باشندے ہندوستان کے دوسرے حصوں کے باشندوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ غرض ایک مہذب قوم کے لیے جن خصوصیات اور اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کی سب ان میں موجود ہیں لیکن بایں ہمہ یہ پچیس لاکھ سے زیادہ توحید پرست غلام ہندوستان میں سب سے زیادہ بدقسمت انسان ہیں۔ ان کے لیے تمام ہندوستان سے جدا قانون ہیں۔

اُن کے لیے جو طریقۂ حکومت اختیار کیا گیا ہے وہ ہندوستان کے تمام صوبوں سے مختلف ہے اور انہیں ان برائے نام آئینی حقوق سے یکسر محروم رکھا گیا ہے۔ جو ہندوستان کے ہر حصہ کو حاصل ہیں۔ منٹو مارلے اصلاحات کا نفاذ، مانٹیگو چیمسفورڈ کی اصلاحی اسکیم کا رواج، کونسلوں کا قیام، لوکل سیلف گورنمنٹ کے اصول پر میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے اختیارات اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے تغیرات۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جن کی اہل سرحد کو ہوا بھی نہیں لگنے دی گئی ہے۔ حالانکہ صوبہ سرحد کے پٹھانوں نے انگریزوں کے ساتھ سب سے زیادہ وفاداری کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خون دنیا کے ہر حصہ میں انگریزی تسلط و اقتدار کے قیام و تحفظ کے لیے بے دریغ کام آتا رہا ہے اور اپنی شجاعت و بسالت کی وجہ سے جنگی خدمات کے سلسلہ میں سرحد کا پٹھان سب سے پیش پیش رہا ہے۔ غرض ۱۸۴۹ء سے (جب سے کہ انگریزوں نے اس علاقہ پر اپنا تسلط قائم کیا ہے) اب تک سرحد کے باشندوں کو سکون و اطمینان کی زندگی نصیب نہیں ہوئی۔ ۱۹۰۱ء تک یہ علاقہ پنجاب میں شامل تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی اس علاقہ کی طرف ہمیشہ تسخیری اور تعزیری مہموں کا سلسلہ جاری رہا لیکن پھر بھی وہ ان حقوق سے جو پنجاب کو حاصل تھے کسی حد تک متمتع ہوتا رہتا تھا لیکن جب سے کہ لارڈ کرزن کی اسلام کش پالیسی نے اس علاقہ کو پنجاب سے الگ کر کے ایک مستقل صوبہ بنایا۔ اسی وقت سے اُسے تمام آئینی سہولتوں سے بالکل محروم کر دیا گیا اور اس نئے صوبہ کی حکومت کلیتاً مطلق العنان چیف کمشنر اور اس کے ماتحت فرعون مزاج ڈپٹی کمشنروں، آنریری ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور آنریری سب ججوں کے سپرد کر دی گئی جو یہاں کے نادر شاہی قوانین کا دل کھول کر استعمال کرتے ہیں اور جن کے ذریعہ اہل سرحد پر عرصہ عافیت تنگ ہے۔

منجملہ دوسرے وحشیانہ قوانین کے سرحد میں ایک قانون ہے جس کا نام قانون جرائم سرحد ہے۔ اس قانون کی غرض و غایت یہ ظاہر کی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ سرحد میں جرائم کا انسداد کیا جائے۔ مقامی حکام کو اس قانون کی موجودگی میں یہ حق حاصل ہے کہ وہ جسے چاہیں بغیر مقدمہ چلائے اور بغیر جرم کا اظہار کیے سخت سے سخت سزا دے دیں لیکن اس جابرانہ قانون کے اثرات و نتائج کا جہاں تک تعلق ہے وہ یہ ہیں کہ اس سے جرائم کا انسداد ہونے کے بجائے

ان میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں جب کہ یہ صوبہ پنجاب سے الگ کیا گیا یہاں قتل کی ۱۹۷ وارداتیں ہوئیں لیکن ۱۹۲۰ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۶۴۴ تک جا پہنچی۔ یہی حال دوسرے شدید جرائم کا بھی ہے۔ جرائم میں اس حیرت انگیز اضافہ کا مطلب اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ حکومت اپنے قوانین کے ذریعہ اس صوبہ کی اخلاقی حالت کو زیادہ سے زیادہ پست بنانے کی کوشش میں نہایت انہماک کے ساتھ مصروف ہے۔

حضرات! فرنٹیر ریگولیشنز (سرحد کے سیاہ قوانین) نے اہل سرحد کو موجودہ نظام حکومت سے بہت زیادہ بددل اور متنفر کر دیا ہے۔ ان میں حیرت انگیز بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ جس کا ثبوت ۱۹۳۰ء کی جنگ آزادی سے مل رہا ہے اور وہ اس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ ان حقوق و اصلاحات کو جو ہندوستان کے دوسروں صوبوں کو حاصل ہیں، حاصل کیے بغیر چین سے نہ بیٹھیں گے۔ وہ کسی طرح تیار نہیں ہیں کہ چند لاکھ سرحدیوں کی قسمت کا فیصلہ ۳۲ کروڑ ہندوستانیوں سے الگ کیا جائے۔

حضرات! اہل سرحد میں حصول آزادی اور اصلاحات کی جو زبردست خواہش پیدا ہو چکی ہے اس سے خود حکومت کے ذمہ دار ارکین کو بھی مجال انکار نہیں ہے۔ ۱۹۲۲ء میں مجلس تحقیقات سرحد کے نام سے جو کمیٹی سر ڈینس برے حکومت ہند کے وکیل امور خارجہ کی صدارت میں مقرر ہوئی تھی اور جس کے سیکرٹری سر نارمن بولٹن تھے جو بعد میں سرحد کے چیف کمشنر مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ میں اعتراف کیا گیا ہے کہ

> ''باشندگان سرحد لیاقت و ذہانت اور اپنے معاملات کے انصرام و انتظام کی اہلیت میں بقیہ ہندوستان کے لوگوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اصلاحات کے لیے ان میں زبردست خواہش پیدا ہو چکی ہے اور وہ ان اصلاحات سے ذرہ برابر کم پر مطمئن نہیں ہو سکتے جو ملک کے دوسروں صوبوں کو عطا کی گئی ہیں۔''

آگے چل کر یہ کمیٹی لکھتی ہے کہ

> ''اگر پٹھانوں پر بے اعتمادی کی وجہ سے انہیں اپنے علیحدہ صوبہ میں

ترقی اور حکومت خود اختیاری کے حق سے محروم رکھا گیا تو ان کے مغرب
کی جانب متوجہ ہونے کا خطرہ مبدل بہ حقیقت ہو سکتا ہے۔''

ان واقعات وحقائق کے سامنے آ جانے اور اہل سرحد کی زبردست خواہش آزادی کا علم ہو جانے کے بعد بھی فرنٹیر ریگولیشنز کو باقی رکھنا اور اس صوبہ کے لیے ہندوستان سے الگ کوئی دستور حکومت مرتب کرنا نہ صرف انتہائی ناانصافی اور ظلم ہوگا بلکہ انتہا درجہ عاقبت نااندیشی ہوگی اور خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اس خواہش کا اظہار نہ صرف اہل سرحد کی طرف سے کیا جا رہا ہے اور اس کی تائید نہ صرف مسلمانانِ ہند کر رہے ہیں بلکہ ہندوستان کی مشترکہ اور نمائندہ جماعت کانگریس بھی اس کی حمایت میں ہے اور اپنے اجلاس منعقدہ کراچی میں اُن کے حقوق آزادی ومساوات کو غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کر چکی ہے۔ ان حالات میں حکومت کی یہ انتہائی دانشمندی ہوگی کہ وہ گول میز کانفرنس کے نتائج کا انتظار کیے بغیر وہ تمام ریفارم صوبہ سرحد کو دے دے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کو اس وقت حاصل ہے۔

آزاد علاقہ میں جارحانہ اقدام

حضرات! اب ہمیں سرحد کے مغربی علاقہ پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ خیبر پار کا علاقہ آزاد علاقہ کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ اس علاقہ کے باشندے فطرتاً آزادی پسند ہیں اور ہزاروں سال سے وہ اس نعمت سے متمتع ہو رہے ہیں۔ انہوں نے نہ کبھی ہندوستانی سلطنتوں کے سامنے سر اطاعت خم کیا اور نہ افغانی حکومت کے غلام بنے۔ وہ آزاد پیدا ہوئے ہیں اور آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اس علاقہ کا رقبہ تقریباً ۲۶ ہزار مربع میل ہے جس میں کم وبیش ۲۸ لاکھ پٹھان آباد ہیں۔

انگریزی حکومت کی یہ مشہور پالیسی ہے کہ وہ اپنی قدرتی حدود پر کبھی قانع نہیں رہتی اور سرحد کی حفاظت کے بہانے سے اقدام اور پیش قدمی کی پالیسی پر عمل کرتی رہتی ہے اور ہمسایہ اقوام کے امن وسکون کو تباہ وبرباد کرنے کی سعی میں مصروف رہتی ہے۔ چنانچہ صوبہ سرحد پر قابض ہوتے ہی اُس نے آزاد علاقہ پر اپنا تسلط جمانے کی کوششیں شروع کر دیں اور ۱۸۵۰ء

سے لے کر اس وقت تک اس مقصد کے لیے بہت سی لڑائیاں لڑی جا چکی ہیں اور ہندوستان کا بیشمار روپیہ ان مہموں پر صرف کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ انگریزوں نے ان پیہم جنگوں سے آزاد علاقہ کی تقریباً سترہ لاکھ آبادی کو اپنے زیر اثر کرلیا ہے لیکن پھر بھی اس جارحانہ پیش قدمی کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کے واقعات ہمارے سامنے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ رہے سہے آزاد قبائل کی آزادی کو کچل ڈالنے کے لیے صرف ۱۵ لاکھ پونڈ کے بم ہوائی جہازوں کے ذریعہ اس علاقہ کے باشندوں پر گرادیے گئے ہیں اور کھجوری میدان میں انگریزی فوجوں نے مستقل طور پر اپنی چھاؤنیاں ڈال دی ہیں۔ اس پیش قدمی کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھجوری میدان کے علاقہ کو ایک نیا برطانی صوبہ بنا کر اہل قبائل کی آزادی کو سلب کرلیا جائے اور افغانستان و ہندوستان کے درمیان آزاد علاقہ کی جو حد فاصل قائم ہے اسے ختم کردیا جائے۔

حضرات! ملک گیری کا یہ مذموم طریقہ ایسا نہیں ہے جس کی مذمت میں کوئی سنجیدہ اور منصف انسان پس وپیش کرے گا۔ آج جبکہ دنیا کی ان قوموں میں بھی جو صدیوں سے غلامی کی عادی ہو چکی ہیں حریت طلبی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔ ایک ایسی قوم کو غلام بنانے کی کوشش کرنا جو ہزاروں سال سے آزاد ہے اور جس کے نزدیک غلامی ایک ایسی لعنت ہے جس کا تصور بھی قابل نفرت ہے۔ قابل مذمت نہیں تو اور کیا ہے۔ نہ صرف اپنے ہمسایہ ہونے کی وجہ سے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ آزاد قبائل ہمارے ہم مذہب ہیں میرے خیال میں ہندوستان کے ہر مسلمان کو اُن کے ساتھ دلی ہمدردی ہونی چاہیے اور اُن کے خلاف انگریزی حکومت کی جارحانہ پیش قدمی کو لائق نفرت و مذمت سمجھنا چاہیے۔

میں حکومت کو دوستانہ مشورہ دوں گا کہ وہ جلد از جلد اپنی جارحانہ پیش قدمی کو ختم کردے اور آزاد علاقہ سے اپنی تمام فوجی چوکیاں ہٹالے۔ کھجوری میدان سے اپنی فوجوں کو واپس بلالے اور آزاد قبائل کو اسی طرح آزادی کی زندگی بسر کرنے دے جیسی کہ وہ صدیوں سے بسر کر رہے ہیں۔ ورنہ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی یہ غیر دانشمندانہ حکمت عملی اس کے لیے بھی مفید نہیں ہوسکتی۔

ہندو مسلم مفاہمت

معزز علماء کرام! ہندوستان میں آج کل ہندو مسلم مسئلے نے خاص صورت اختیار کر رکھی ہے۔ عام طور سے یہ مسئلہ باشندگان ہندوستان کے لیے دلچسپی کا سبب بنا ہوا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی ایک ہی سیاسی جماعت تھی مسلمانوں میں سیاسی بیداری بھی نہ تھی۔ حکومت خود اختیاری کا بہت زیادہ امکان بھی نہ تھا۔ اس لیے اُس وقت اس پیکٹ کے متعلق نہ کچھ زیادہ چرچا تھا اور نہ کسی قسم کے جھگڑے تھے لیکن شاید یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اس وقت باوجودیکہ علماء نے میدان سیاست میں قدم بھی نہ رکھا تھا نہ جمعیۃ علماء کا وجود تھا، نہ اُن کا کوئی سیاسی پلیٹ فارم تھا مگر جونہی کانگریس اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ شائع ہوا فوراً علماء کی تمام جماعت میں سے صرف ایک ہی شخص اُٹھا تھا اور اس نے مسلم لیگ کے سمجھوتہ میں وہی خامیاں بیان کی تھیں جن کی بنا پر آج تمام ہندوستان کے مسلمان اس سمجھوتہ کو ناپسند اور ناقابل قبول سمجھتے ہیں۔ وہ دور بین اور غائر النظر اور ہمدرد اسلام و مسلمین ہستی حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند کی ہے۔ حضرت محترم نے اس وقت ایک اعلان بعنوان ''مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت'' شائع کیا اور مسلمانوں کو حکومت خود اختیاری کے حصول میں کوشش کرنے کی تاکید کی ساتھ ہی مسلم لیگ کانگریس کے سمجھوتہ کی خامیاں بیان کی تھیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت موصوف کا وہ اعلان تمام وکمال یہاں پر نقل کر دیں تاکہ آپ یہ اندازہ کر سکیں کہ جمعیۃ علماء ہند کے محترم صدر کے وقت ہی سے تحصیل آزادی کے جذبہ بے پناہ کے ساتھ ہی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا خیال پیش نظر ہے، وہ اعلان یہ ہے:

مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت

صاحب وزیر ہند کی ہندوستان میں تشریف آوری کی تقریب میں تمام اقوام ہند میں سیاسی تحریک موجزن ہے۔ تمام چھوٹی بڑی قومیں اپنی آئندہ بہبودی کے متعلق غور وفکر کر رہی

ہیں۔اس وقت ہر شخص کا فرض ہے کہ جس چیز کو قوم کے لیے مفید سمجھے، بغیر کسی پس وپیش کے ظاہر کردے۔اس لیے خاکسار اپنے خیالات کو مسلم پبلک کے سامنے پیش کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہوتا ہے۔

(۱) کوئی قوم حقیقی ترقی نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کے افراد میں اپنے اوپر خود حکومت کرنے کی استعداد نہ پیدا ہو جائے اور حقیقی آزادی اور حقیقی ترقی بغیر حکومت خوداختیاری کے حاصل نہیں ہوسکتی۔

(۲) آزادی کی خواہش انسان کی طبیعی اور جبلی خواہش ہے اس لیے کوئی فرد بشر بجاطور پر حکومت خوداختیاری کی مخالفت نہیں کرسکتا۔

(۳) دنیا کی متمدن اور مہذب قومیں انسانی آزادی اور ترقی میں ساعی رہتی ہیں۔ برطانوی گورنمنٹ کی رعایا کے مختلف طبقے بھی ہمیشہ اس کے آرزومند رہے کہ گورنمنٹ ان کو حکومت خوداختیاری عطافرمائے اور برطانوی گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے کئی طبقوں کی یہ آرزو پوری بھی کردی۔

(۴) اس وقت کہ گورنمنٹ نے فراخدلی سے ہوم رول دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے یا اس کی اُمید کی جاتی ہے اور صاحب وزیر ہند بہادر اسی کے متعلق ہندوستانیوں کے خیالات معلوم کرنے تشریف لارہے ہیں۔اگر ہندوستان کی قومیں ہوم رول کی خواہش کریں اور آزادی کی نعمت حاصل کرنے کی کوشش کریں تو اُن کی یہ خواہش اور کوشش یقیناً حق بجانب ہوگی۔

(۵) ہندوستان کی آبادی مختلف العقائد اور متبائن الخیالات اقوام سے مرکب ہے اور ایک قوم کے مذہبی اغراض دوسری قوم کے مذہبی اغراض سے متصادم ہیں اور اسی بناء پر یہاں ہمیشہ جھگڑے اور فساد ہوتے رہتے ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ ہوم رول کی خواہش کرنے سے پہلے مذہبی تصادم اور تمام اقوام کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت کا پورے طور پر خیال کرلیا جائے۔

یہ باتیں تو ایسی ہیں جن کا تعلق کسی خاص قوم سے نہیں تمام اقوام اس حد تک متساوی الاقدام ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے ان وجوہ خمسہ کی معقولیت میں کسی کو بھی کلام نہ ہوگا۔

اس کے بعد خاکسار خاص اسلامی طبقے کے متعلق عرض کرتا ہے۔

مسلم پبلک کا اوّلین فرض ہے کہ وہ سیاسی ترقی کی رفتار میں مذہبی آزادی کی حفاظت کو سب سے زیادہ اہم اور مقدم سمجھے اور ''پہلے ہم مسلمان ہیں پھر ہندی یا عربی۔ ایرانی یا چینی وغیرہ'' کے اصول کو لازم سمجھیں کیونکہ مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا شیرازہ صرف مذہب اسلام اور اسلام سے ہی بندھا ہوا ہے۔

اس وقت مسلمانوں کی اصولی تقسیم کے لحاظ سے دو گروہ ہیں۔

(۱) ہوم رول کے طالب (۲) ہوم رول کے مخالف

دوسرے گروہ میں پھر دو قسم کے لوگ ہیں۔ اوّل وہ لوگ جن کو ہوم رول کے معنی اور مفہوم کی خبر نہیں (اور انہیں کی تعداد زیادہ ہے) دوسرے وہ جو کسی خارجی اثر سے متاثر ہو کر اپنے ذاتی اغراض کی خاطر قومی اغراض اور انسانی فطری خواہش کو پامال کرنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں فریق کی متفقہ آواز یہ ہے کہ ہمیں ہوم رول کی ضرورت نہیں۔ ہم گورنمنٹ انگریزی کی حکومت سے خوش ہیں۔ مسلمان ابھی ہوم رول کے لایق نہیں ہوئے۔

لیکن چونکہ ان کی مخالفت ناواقفیت یا ذاتی غرض پر مبنی ہے اس لیے وہ کسی درجہ میں لایق اعتبار نہیں اور نہ مسلمانوں کو ان کی آواز پر کان لگانا چاہیے اور نہ ان کی آواز قومی آواز سمجھی جا سکتی ہے۔

ہوم رول کے طالب گروہ میں تمام سمجھدار، ذی علم، متمدن، مہذب افراد شامل ہیں مگر اُس میں بھی دو فریق ہو گئے۔ فریق اوّل مسلم لیگ کے ارکان اور اس کے حامی فریق دوم جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک معتدبہ حصہ اور تقریباً تمام مذہبی اور عامۂ مسلمین کا ایک جم غفیر۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ دونوں ہوم رول کے مطالبہ میں شریک اور اصل مقصد میں متفق ہیں پھر وجہ اختلاف کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فریق اوّل یعنی مسلم لیگ نے ہوم رول کے مطالبہ کا یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے:

(۱) کانگریس کے ساتھ اتفاق کر لیا اور لیگ اور کانگریس نے متفقہ اسکیم تیار کی۔

(۲) اس اسکیم میں مسلمانوں کو جو حق نیابت دیا گیا ہے اس کے لحاظ سے کسی صوبہ کی

کونسل میں دس فیصدی، کسی میں بیس فیصدی کسی میں تیس فیصدی مسلمان ممبر ہوں گے۔ صرف صوبہ پنجاب میں پچاس فیصدی مسلمان ہوں گے۔ یعنی ہندوستان کے کسی صوبہ میں ان کو اکثریت حاصل نہ ہوگی۔

(۳) کم تعداد والی قوموں (جن میں سوائے صوبہ پنجاب کے تمام ہندوستان کے مسلمان داخل ہیں) کے قومی اغراض کی حفاظت اس طرح کی گئی کہ ایک قاعدہ مقرر کر دیا گیا کہ کوئی ایسا رزولیوشن جو کسی غیر سرکاری ممبر نے پیش کیا ہو اور کسی قوم کے اغراض پر اس کا اثر پہنچتا ہو۔ اگر اُسی قوم کے نمائندوں کی ۳/۴ تعداد اس رزولیوشن کی مخالفت کر دے تو وہ رزولیوشن پاس نہ ہو سکے گا۔

اس قرارداد پر لیگ اور کانگریس کے ممبروں نے سمجھوتہ کرلیا ہے اور ارکان لیگ کا خیال ہے کہ یہ سمجھوتہ مسلمانوں کے لیے مضر نہیں ہے اور اس میں مسلم پبلک کی قومی اغراض کو کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا۔ نیز بعض حامیانِ لیگ سے یہ بھی سنا گیا کہ گورنمنٹ ہوم رول ضرور دے گی۔ اس کی بنیاد پڑ چکی ہے تو اگر ہم اس سمجھوتہ کے موافق ہوم رول لینے پر آمادہ نہ ہو جاتے تو اندیشہ تھا کہ گورنمنٹ ہوم رول دے دیتی اور پھر برادرانِ وطن ہمیں اتنا حصہ بھی نہ دیتے جتنا کہ اس سمجھوتہ میں انہوں نے منظور کرلیا ہے۔

فریق دوم کے خیالات:

فریق دوم کہتا ہے کہ مطالبہ ہوم رول ضروری اور ہمارا بھی مقصد اہم یہی ہے اور ہم کو ارکان مسلم لیگ کی نیت پر بھی حملہ کرنا مقصود نہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا مسلمانوں کی خیر خواہی کی نیت سے ہی کیا لیکن ان کے فیصلہ کے متعلق ہمیں حسب ذیل شکایتیں ہیں:

(۱) مسلم لیگ نے یہ فیصلہ کرتے وقت عام مسلم رائے حاصل نہیں کی۔ مسلمانوں کی قومی اور مذہبی انجمنوں سے کوئی استصواب نہیں کیا گیا اور اگرچہ ہمیں ان کی نیت پر بدگمانی نہیں تاہم سات آٹھ کروڑ مسلمانانِ ہند کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں وہ معصوم بھی نہیں ہیں اور اپنی اس استبدادی کارروائی کے جوابدہ ہیں۔

(۲) اس سمجھوتے میں مسلمانوں کے قومی اغراض کو صدمہ پہنچنے کا نہ صرف گمان بلکہ ظن

غالب ہے کیونکہ مسلمانوں کو اس صورت میں کثرت رائے حاصل ہونا ناممکن ہے۔

(۳) یہ قاعدہ کہ غیر سرکاری ممبر کے پیش کیے ہوئے رزولیوشن کی اگر کسی قوم کے ۳/۴ ممبر مخالفت کریں تو وہ پاس نہ کیا جائے۔ پرسنل لا کی حفاظت کے لیے چنداں مفید نہیں کیونکہ سرکاری غیر مسلم ممبروں کے ان رزولیوشنوں کی جو مسلمانوں کے اغراض قومی کے مخالف ہوں اس قاعدہ سے کوئی روک نہیں ہوئی۔ وہ برابر کثرت رائے سے پاس ہوتے رہیں گے اور غیر سرکاری ممبر اپنے رزولیوشن کا مقصد سرکاری ممبروں کو سمجھا کر اُن کے ذریعہ سے پیش کرا سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس قاعدہ کا اثر زیادہ سے زیادہ ان تجاویز پر پڑ سکتا ہے جو غیر مسلم غیر سرکاری ممبروں کی طرف سے پیش کی جائیں لیکن مسلمان ممبروں کے واسطے اپنی اغراض کے لیے مفید تجاویز پاس کرانے کا کوئی راستہ نہیں۔ بخلاف غیر مسلم ممبروں کے کہ وہ اپنی اغراض کے لیے مفید تجاویز جس قدر چاہیں کثرت رائے سے پاس کرا سکتے ہیں۔

(۴) پنجاب میں ۵۰ فیصدی مسلم نیابت اس اصول کے موافق بھی صحیح نہیں کیونکہ پنجاب میں مسلم آبادی کا اوسط اس سے زیادہ ہے۔

(۵) ہندو تعداد مردم شماری میں تمام اُن قوموں کو محسوب کر لیا ہے جو ہندو دھرم کے معتقد نہیں بلکہ اس کے مخالف ہیں اور یہ اصولاً خلاف انصاف ہے۔

(۶) مسلم لیگ اور کانگریس نے جو سمجھوتہ کیا ہے اس کی پختگی کی طرف سے بھی قوم کا کوئی اطمینان نہیں کیا گیا۔

(۷) مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کا خیال نہیں رکھا گیا۔

(۸) یہ خیال کہ گورنمنٹ ہوم رول ضرور دیتی اور ہم یہ سمجھوتہ نہ کرتے تو اس سے زیادہ نقصان میں رہنے کا اندیشہ تھا۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ ہندوستان کو ہوم رول دینے کے نہ یہ معنی ہیں کہ ہندوؤں کو ہوم رول دے دیا جائے اور نہ گورنمنٹ کے ہوم رول دینے کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ مسلم قومیت اور مسلم حقوق کو پامال کر کے ایک قوم کو حکمران بنا دیتی۔ اگر مسلمان استقلال اور خودداری اور وقار سے اپنے حقوق کا مطالبہ آئینی طریقہ سے کرتے تو کوئی وجہ نہیں کہ گورنمنٹ اُسے نظر انداز کر دیتی۔

اس کے بعد یہ عرض ہے کہ اگرچہ اب وقت نہیں رہا کہ وزیر ہند کی خدمت میں کوئی ایڈریس یا وفد پیش کرنے کی درخواست کی جائے لیکن جن ایڈریسوں اور وفدوں کی اجازت لی جا چکی ہے ان کے اصحاب وارکان کو یہ موقع ہے کہ وہ اپنے مجمل ایڈریسوں کی تفصیل میں اس تجویز کے مضمون کو بھی شامل کرلیں جو ذیل میں درج ہے اور اب سے بہت پہلے شائع کی جا چکی ہے۔

مسلمانوں کی شدید ترین مذہبی ضرورت

اسلامی عقائد کے بموجب بہت سے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے قاضی یا حاکم کا مسلمان ہونا شرط ہے۔ مثلاً ایک عورت کا نابالغی کی حالت میں باپ دادا کے سوا کسی اور ولی نے نکاح کر دیا۔ نکاح تو صحیح ہو گیا لیکن عورت کو بلوغ کے وقت یہ اختیار ہوتا ہے کہ اس نکاح کو پسند کر کے باقی رکھے یا ناراضی ظاہر کر کے فسخ کر دے۔ مگر اسلامی احکام کی رو سے عورت خود نکاح کو فسخ نہیں کر سکتی بلکہ ضروری ہے کہ مسلمان قاضی سے فسخ کرائے۔

اسی طرح کسی عورت کا خاوند چار پانچ سال سے مفقود الخبر ہو گیا ہے اور عورت کے لیے گزارے کی کوئی صورت نہیں یا اُس کے جوان ہونے کی وجہ سے اس کی عصمت محل خطر میں ہے۔ ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ مسلمان قاضی سے خاوند کی موت کا حکم حاصل کیا جائے اور عورت عدت وفات پوری کر کے دوسرا نکاح کر لے۔

اسی طرح عبادات و معاملات بالخصوص نکاح، طلاق، میراث، وقف شفعہ وغیرہ کے ہزاروں مقدمات ایسے ہوتے ہیں جن میں مسلمان حاکم کے فیصلے اور حکم کی ضرورت ہے۔ غیر مسلم حاکم کا حکم یا فیصلہ شرعی نقطۂ نظر اور اسلامی عقائد کے بموجب کافی نہیں۔

گورنمنٹ انگلشیہ کے شاہی اعلان ۱۸۵۸ء کے بموجب اگرچہ رعایا کو مذہبی آزادی حاصل ہے اور قوانین گورنمنٹ احکام مذہبیہ کے موافق فیصلہ کرنے کے مدعی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ناقابل انکار حقیقت بھی ہمارے پیش نظر ہے کہ گورنمنٹ کی عدالتوں میں مسلم، غیر مسلم دونوں قسم کے حاکم مسند آرائے سریر حکومت ہوتے ہیں بلکہ اعلیٰ عدالتوں میں غیر مسلم

عنصر ہی غالب ہے۔ بہت سے شہر اور قصبے ایسے ہیں جہاں ایک بھی مصنف یا جج مسلمان نہیں۔

اس لحاظ سے گورنمنٹ کا اعلان مذکور اور موجودہ قوانین اُن مقدمات کے متعلق جن میں حاکم کا مسلمان ہونا شرط ہے بالکل غیر مفید اور ناکافی ہیں اور مسلمانوں کی اس شدید ترین مذہبی ضرورت کے پورے ہونے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔

ہندوستان میں بلا مبالغہ ہزاروں عورتیں ایسی ہوں گی جو اپنے خیار بلوغ کو اس وجہ سے استعمال نہیں کر سکتیں کہ مسلمان حاکم میسر نہیں اور اگر ناواقفیت کی وجہ سے غیر مسلم حاکم سے فسخ نکاح کا حکم حاصل کر کے دوسرا نکاح کر لیتی ہیں تو وہ اسلامی عقائد کے بموجب گنہگار اور مرتکب حرام ہوتی ہیں۔

ہزاروں عورتیں جن کے خاوند مفقود ہیں۔ مسلم عدالت نہ ہونے کے باعث عذاب میں مبتلا ہیں۔ زندگی بیکار ہے۔ رات دن مصیبت جھیلتی ہیں اور اسی طرح بہت سے دینی اور قومی اغراض اسلامی عدالت نہ ہونے کی وجہ سے ملیامیٹ ہو رہے ہیں۔

مجوزہ درخواست یہ ہے:

گورنمنٹ مسلمانوں کے خالص مذہبی معاملات اور اُن مقدمات کے فیصلے کے لیے جن میں مسلمان قاضی شرط ہے۔ ہر ضلع میں ایک شرعی عدالت قائم کر دے اور اس میں ایک مسلمان قاضی (جو علوم شرعیہ کا عالم اور متدین ہو) مقرر کرے اور اُس کو ان مقدمات کے متعلق ڈسٹرکٹ جج کے برابر اختیارات عطا کیے جائیں اور ہر صوبہ میں ان ماتحت عدالتوں کے احکام کے خلاف اپیل کرنے کے لیے ایک بڑی عدالت قائم کی جائے۔

یہ درخواست کا مجمل خاکہ ہے۔ اس کی اجمالی عام منظوری کے بعد اُن احکام کی تعیین جو ان شرعی عدالتوں میں طے ہونے ضروری یا مناسب ہیں۔ علماء ہندوستان کی ایک منتخبہ جماعت کر دے گی اور اُس کے یہ دیگر مراحل پر بھی مفصل بحث کی جا سکے گی۔

کتبہٗ محمد کفایت اللہ غفرلہٗ مدرس اوّل مدرسۂ امینیہ۔ دہلی، ۱۹۱۷ء

۱۶ سے لے کر اب تک نہ معلوم مسلمانوں میں کتنی آل انڈیا جماعتیں بن چکی ہیں۔ مسلمانوں میں تو اب یہ مرض عام ہو گیا ہے کہ چند حضرات ہم خیال جمع ہوئے اور انہوں نے

ایک جماعت بنالی۔ دس پانچ اخبارات میں تار شائع کرادیے اور انجمن کو آل انڈیا انجمن بنا بیٹھے۔ دوسری طرف ہندوؤں میں ہندو مہاسبھا نے اپنی فرقہ وارانہ سرگرمیوں کے باعث خاص شہرت حاصل کر لی ہے۔ اگر آج بھی کانگریس اور کسی ایک مسلم جماعت کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو شاید مفاہمت ایک دو روز میں ہو جائے لیکن اس عموم بلوہ کا کیا علاج کیا جائے جس میں آج کل ہندوستان کے ہندو اور مسلمان مبتلا ہیں۔ گاندھی جی کے لیے یہ مشکل ہے کہ وہ مسلمانوں سے معاملہ کرتے وقت مہاسبھائی ہندوؤں اور سکھوں کو نظر انداز کر دیں۔ اسی طرح ڈاکٹر انصاری کے لیے یہ مشکل ہے کہ وہ ہندوؤں سے سمجھوتہ کرتے وقت مسلم کانفرنس کے مسلمانوں کو فراموش کر دیں۔ فرقہ پرستوں کی دونوں جماعتیں عوام ہندو مسلمانوں کے جذبات سے کھیل رہی ہیں اور ہر طرح سمجھوتے کی راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہیں۔

سمجھوتے کا اصول جمہوری ہو یا فرقہ وارانہ

حضرات! میری رائے میں سب سے پیشتر اس مسئلہ کو طے کرنا ہے کہ سمجھوتے کے اصول کیا ہوں۔ کانگریس برابر کہتی رہی ہے کہ آئندہ سمجھوتہ اصول پر ہوگا۔ سکھ بھی یہی غل مچاتے ہیں کہ فرقہ وارانہ رعایت ترک کر دی جائے تو ہم بھی رعایت نہیں مانگتے۔ ہندو مہاسبھا کے ذمہ دار ہندو تو ہندو مسلم مسئلے کو مجلس بین الاقوام میں ہی پہنچانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کا بھی ایک بہت بڑا حصہ جمہوری اصول کو پسند کرتا ہے۔ نہرو رپورٹ بھی جمہوریت کے اعلیٰ اصول پر مرتب کی گئی ہے۔ جہاں تک آئندہ ملک کے طرزِ حکومت کا سوال ہے کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ آج نہ سہی تو کل مجبوراً جمہوری اصول پر سمجھوتہ کیا جائے گا اور میں تو یہ عرض کرتا ہوں کہ سمجھوتہ ہی کیا بس جمہوریت ہو جائے گی۔ سمجھوتہ تو ہوتا ہی وہاں ہے جہاں فرقہ وارانہ صورت پیش نظر ہوا کرتی ہے۔ جمہوری اصول ہمیشہ اکثریت کے لیے مفید اور اقلیت کے لیے مضر ہوا کرتے ہیں۔ تمام دنیا کے ممالک میں یہی ہوتا ہے کہ جب ملک ترقی کرتا ہے تو اکثریت جمہوری اصول کا مطالبہ کیا کرتی ہے لیکن اقلیت کو ہمیشہ پس و پیش ہوا کرتا ہے۔ ہندو اگر جمہوری اصول کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ مطالبہ کچھ زیادہ قابل تعریف نہیں ہے اس لیے کہ

جمہوریت میں اُس کا فائدہ ہے۔ اسی طرح اگر جمہوری اصول سے مسلمان گھبراتا ہے تو یہ قابل تعجب نہیں ہے اس لیے کہ جمہوریت میں مسلمان کا نقصان ہے اور نقصان سے ہر شخص گھبرایا ہی کرتا ہے۔

کیا فرقہ پرستی مفقود ہے؟

حضرات! جو کچھ میں نے عرض کیا ہے یہ تو اصولی طور پر ہے۔ اب میں آپ سے واقعی کے طور پر دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کے ملک میں اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلمان پانی کی آوازیں نہیں لگتیں۔ کیا مسجدوں کے سامنے باجا بجانے اور پیپل کی حفاظت، اذان کی بندش اور آرتی کی آزادی پر فساد نہیں ہوتے۔ پیپل اور گائے تو بجائے خود رہے اب تو یہ ضدیں اور ہٹیں سائنس بورڈ اور تعزیروں تک پہنچ گئی ہیں۔ کیا آپ یہ نہیں سنا کرتے کہ فلاں دفتر میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو نکال دیا اور فلاں دفتر کے مسلمانوں نے ہندوؤں پر ظلم کیا۔ فلاں دفتر میں ہندو راج اور فلاں محکمے میں مسلم راج کی بحث روزمرہ اخبارات میں آپ پڑھتے ہیں یا نہیں؟ کیا آپ نے کبھی ریل کے سفر میں یہ دیکھا ہے کہ ایک ہندو عورت کا بچہ پیاس سے پھڑک رہا ہے اور ایک مسلمان اس کو اپنی صراحی سے ٹھنڈا پانی دینا چاہتا ہے لیکن اس بچہ کی ماں شکریہ کے ساتھ پانی کو یہ کہہ کر واپس کر دیتی ہے کہ میاں صاحب! آپ مسلمان ہیں میں اپنے بچے کو آپ کا پانی نہیں پلا سکتی۔ اگر یہ واقعات ہیں اور آپ شہادت دیتے ہیں کہ یہ واقعات ہیں تو کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں مختلف فرقے موجود نہیں ہیں یا اس ملک میں مختلف الخیال اور مختلف مذاہب کے لوگ نہیں ہیں۔ اگر براعظم ہندوستان میں مختلف تمدن اور مختلف تہذیبیں ہیں تو پھر اس ملک میں کس طرح آنکھیں بند کر کے مطلقاً ایسی قومیت کی تائید کی جا سکتی ہے۔ جس میں ہندو مسلمانوں کا سوال ہی پیش نہ ہو یا ہندو مسلمانوں کا ذکر ہی نہ آئے۔

جمہوریت کی حمایت

میرے معزز دوستو! میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ جب تک اکثریت اور اقلیت کی تقسیم مذاہب کی بنا پر قائم ہے اور روزانہ زندگی میں اس قدر رواداری پیدا نہیں ہوتی کہ آزادی کے ساتھ سیاسی جماعتیں پیدا ہوسکیں اس وقت تک جمہوریت کا اصول قائم کرنے کے لیے بھی یہ ناگزیر ہے کہ فرقہ پروری کی کسی نہ کسی حد تک حمایت کی جائے کیونکہ اقلیت کا تحفظ کرنا بھی حقیقتاً جمہوریت کا ایک مسلمہ اصول ہے۔ سچ پوچھیے تو صحیح قومیت تو اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ اس ملک میں ہندو مسلمان کا سوال ہی باقی نہ رہے۔ باہمی کھانا پینا، مرنا جینا سب ایسا ملا جلا ہو کہ دونوں قوموں میں کوئی امتیاز ہی باقی نہ رہے لیکن قومیت کے لیے تو اس ملک کی اکثریت بھی رضامند نہیں ہے۔ پھر اگر بعض مسائل سیاسی اور حقوق ملکی میں اقلیت اپنا تحفظ چاہے تو یہ کیوں کر گناہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ کھانے کی تفریق، پینے کی تفریق کو جاری رکھتے ہوئے بھی اگر قومیت کو ٹھیس نہیں لگ سکتی تو سیٹوں کی تفریق اور انتخاب کی تفریق کس طرح قومیت کے منافی ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ انتخاب اور سیٹوں کی تفریق کو ذمہ دار حکومت کے منافی بتایا جائے لیکن میں عرض کروں گا۔ تفریق خواہ کسی شعبے میں ہو ذمہ داری کے لیے ضرر رساں ہے۔ ہاں تفریق مٹانے کی چیز ہے۔ کم کرنے کی چیز ہے لیکن ہر شعبے سے مٹانے کی ضرورت ہے۔ کیا انتخاب اور سیٹوں کی تفریق کھانے اور پینے کی تفریق سے زیادہ بدتر ہے۔ بہرحال آپ حضرات میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ میں جمہوریت اور قومیت کا حامی ہوں لیکن جو چیز آج نہیں ہے اس کا اقرار کس طرح کرلوں۔ تمام ہندو جواہر لال اور سندر لال تو نہیں ہیں۔ اسی طرح تمام مسلمان ڈاکٹر عالم اور ڈاکٹر کچلو تو نہیں ہیں۔ فریقین میں گنتی کے ایسے بزرگ ہوں گے جو اپنی اپنی جماعتوں کی گالیاں سن کر بھی اپنے اصول کو ترک نہیں کرتے لیکن کیا تمام ہندو اور مسلمان ایسے ہی ہیں اور جب فریقین کی اکثریت فرقہ پروری میں مبتلا ہے تو کوئی سمجھوتہ فرقہ وارانہ خیالات کو ترک کرکے انتہائی قومیت کے اصول پر وضع کرنا اس ملک میں کس طرح کامیاب ہوسکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس دفعہ زیادہ سے زیادہ جو رواداری ممکن ہو اُس کو استعمال کیا

جائے اور جس قدر جمہوریت سے قریب تر ہو سکتے ہوں اُتنے قدم بڑھائے جائیں اور فرقہ پروری کو جس قدر مٹا سکتے ہوں اُس قدر مٹائیں، خالص اصول جمہوریت پر اگر کوئی بنیاد رکھی گئی تو میں آپ کو اپنی ہمدردی کا یقین دلا سکتا ہوں لیکن مسلم قوم کی ذمہ داری نہیں لی جا سکتی۔ آپ ہی انصاف کیجیے ایسی حالت میں جبکہ سکھ برابر دھمکیاں دے رہے ہوں اور ہندو اُن کی سرپرستی کر رہے ہوں اور ایک مسلمان کی اکثریت کے برداشت کرنے کو بھی تیار نہ ہوں تو کیا ایسی حالت میں آپ مسلمانوں کو جمہوریت کی انتہائی منزل پر پہنچا سکتے ہیں۔ ان ہی حالات کو دیکھتے ہوئے آج کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے باوجود اپنے سابقہ اعلان کے جو اُس نے لاہور میں کیا تھا فرقہ پروری کو قبول کر لیا۔ حالانکہ لاہور کی تجویز میں صاف موجود ہے کہ آئندہ وہی سمجھوتہ قبول کیا جائے گا جو جمہوری اصول پر مبنی ہو اور فرقہ وارانہ ذہنیت پر اُس کی وضع نہ ہو لیکن مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی تجویز قبول کرتے وقت اُس کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس تھوڑی بہت فرقہ پروری کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ حالانکہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی تجویز فرقہ پروری سے پاک نہیں ہے اور ۱۹۲۰ء والے اعلان کے بالکل خلاف ہے لیکن پھر بھی ملک کی فرقہ پرستی کو دیکھتے ہوئے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اُسے منظور کر لیا۔ کانگریس کی اس منظوری ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک فرقہ پرستی کی بلا میں مبتلا ہے اور اس کو ایک دم بڑھاوے دے کر جمہوریت کے مینار پر نہیں چڑھایا جا سکتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کانگریس کم سے کم فرقہ پروری کو قبول کرنا چاہتی ہے اور ہم کچھ اس سے زیادہ منوانا چاہتے ہیں۔

سمجھوتے کی مختلف تجاویز

حضرات! ملک میں چونکہ فرقہ وارانہ جراثیم موجود ہیں اس لیے اب تک جو تجاویز مرتب کی گئی ہیں، اُن میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل کا کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جس سے تمام فرقے مطمئن ہو جائیں اس وقت مسلم کانفرنس، ہندو مہاسبھا، سکھ لیگ، مسلم نیشنلسٹ پارٹی، جمعیۃ علماء ہند، کانگریس ورکنگ کمیٹی، غرض ملک کی کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جس کی تجاویز منظر عام پر نہ آ چکی ہوں۔ اب تک یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ان تجاویز میں سے

کانگریس کون سی تجویز قبول کرنے کو آمادہ ہے۔قوم پرور حضرات سے بار بار یہ تقاضا کیا گیا ہے کہ کانگریس تمہاری تجاویز کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے۔کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے بمبئی میں جو تجویز منظور کی ہے اُس سے ایک حد تک غلط فہمی دور ہوگئی ہے اور مسلمانوں کو عام طور سے کانگریس کی رائے معلوم ہو چکی ہے۔کانگریس کی اس تجویز کے بعد یہ ممکن ہے کہ مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ مطمئن ہو جائے لیکن مجھے افسوس ہے کہ بعض دفعات کے ابہام اور بعض دفعات کے ترک نے مجھے اس امر پر مجبور کیا کہ میں اپنے عدم اطمینان کا اظہار کروں۔

فرقہ وارانہ حقوق کے متعلق میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ کسی قسم کی مداہنت نہیں کی جا سکتی۔معاملات کا جہاں تک تعلق ہے وہ بالکل صاف ہونے چاہئیں اور ہندوستان میں مسلمانوں کے پرسنل لا کی حفاظت کے متعلق جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا وہ ہے جو ۲۳رمارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔جس کا میں آگے چل کر ذکر کروں گا۔اگر کانگریس نیشنلسٹ مسلم کانفرنس اور جمعیۃ علماء کے اقل قلیل مطالبات کو تسلیم کر لیتی تو میں یقین کرتا ہوں کہ مسلمان عام طور سے اُس کی حمایت کرتے لیکن کانگریس نے تجویز پاس کرتے وقت کچھ ایسا ابہام پیدا کر دیا ہے کہ شاید میری طرح اور بھی بعض حضرات اس تجویز سے مطمئن نہ ہوں گے۔ میں نے احتیاطاً اس خطبے میں دونوں تجویزوں کو نقل کر دیا ہے تا کہ آپ حضرات دونوں کے فرق کو اچھی طرح معلوم کر سکیں۔مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی مفصل تجویز وہ ہے جس کا ڈاکٹر انصاری نے فرید پور میں ذکر کیا ہے۔

مسلم تجاویز	کانگریس تجاویز
(۱) ہندوستان کے مجوزہ دستور اساسی میں نمائندگی کی بنیاد بالغوں کو حق رائے دہی کے ساتھ مخلوط انتخاب پر ہونی چاہیے۔	(۱) (الف) دستور اساسی میں بنیادی حقوق کے ماتحت جو دفعات ہوں گی ان میں مختلف ملتوں کو ان کی تہذیب و تمدن، ان کی زبان ان کے رسم الخط، ان کی تعلیم، ان کا پیشہ، ان کے مراسم، ان کے مذہب اور مذہبی اوقاف کے تحفظ کے متعلق اطمینان دلا دیا جائے گا۔
(ب) پرسنل لاء (شریعت) کا تحفظ دستور اساسی میں ایک خاص دفعہ کے ذریعے کر دیا جائے گا۔	

(ج) مختلف صوبوں میں اقلیتوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کا تحفظ مرکزی حکومت کے ذمہ اور اختیار میں ہوگا۔

(۲) (الف) بالغوں کو حق رائے دہی کے ساتھ صرف ان اقلیتوں کے لیے ان کی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے نشستیں معین ہوں جو ۲۵ فیصدی سے کم ہیں اور یہ تعین مرکزی مجالس قانون ساز اور صوبہ کی مجالس قانون ساز دونوں میں ہو لیکن عام نشستوں میں حصہ لینے کا بھی اختیار حاصل ہو۔

(ب) ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۲۵ فیصدی سے کم ہے وہاں آبادی کے تناسب سے ان کی نشستیں معین کر دی جائیں لیکن انہیں اس کا اختیار حاصل رہے کہ وہ زائد نشستوں میں بھی حصہ لے سکیں لیکن ایسی صورت میں اگر دیگر فرقوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دی جائیں تو مسلمان اس کے مستحق ہوں گے اور انہیں جس اعتبار سے زائد نشستیں اس وقت حاصل ہیں وہی برقرار رہیں۔

(۲) حق انتخاب ہر بالغ مرد اور عورت کو حاصل رہے گا۔

(تشریح) مجلس عاملہ کراچی کی ایک قرارداد کے متعلق بالغوں کو حق رائے دہی کی پابند ہے اس لیے اس میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے سے مجبور ہے۔ تاہم اس خیال سے کہ بعض حلقوں میں اس بارے میں جو شک پایا جاتا ہے اسے رفع کرنے کی غرض سے یہ مجلس یہ ظاہر کر دینا چاہتی ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ حقوق انتخاب میں توسیع کی جائے تو اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا جائے کہ اس میں ہر ملت کی آبادی کا تناسب باقی رہے اور کسی ملت کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔

(ج) اگر بالغوں کو حق رائے دہی منظور نہ کیا جا سکے یا رائے دینے والوں کا رجسٹر اس طرح نہ بنایا جائے کہ اس میں آبادی کا تناسب قائم رہے تو بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی نشستیں معین رہیں۔ تا آنکہ بالغوں کو حق رائے دہی حاصل ہو جائے یا حقوق انتخاب میں اس قدر توسیع ہو جائے کہ انتخاب کنندگان کے رجسٹر میں آبادی کا تناسب اس طرح قائم ہو جائے کہ مسلم اکثریت کسی حالت میں اقلیت یا مساوات میں تبدیل نہ ہو سکے۔

(۳) مرکزی مجلس قانون ساز کے دونوں ایوانوں میں مسلمانوں کو ۱/۳ نشستیں حاصل ہوں۔

(۳) (الف) ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی میں مخلوط انتخاب نمائندگی کی بنیاد ہوگی۔

(ب) سندھ میں ہندوؤں کے لیے آسام میں مسلمانوں کے لیے، صوبہ سرحد اور پنجاب میں سکھوں کے لیے اور ہندو اور مسلمانوں کے لیے تمام دیگر صوبوں میں جہاں ان کی آبادی کا تناسب ۲۵ فیصدی ہے نشستیں آبادی کے تناسب پر معین ہوں گی لیکن انہیں عام انتخاب میں بھی حصہ لینے کا اختیار ہوگا۔

(۴) ملازمتوں میں ہر قسم کا تقرر پبلک سروسز کمیشن کے ذریعہ ہو اور قابلیت کا آسان ترین معیار رکھا جائے اور کسی فرقے کے حقوق کو نظر انداز نہ کیا جائے اور ماتحت اسامیوں پر کسی جماعت کو تفوق اور اجارہ حاصل نہ ہو۔

(۴) حکومت کی آسامیوں پر تقرر ایک غیر جانبدار کمیشن کے ذریعہ ہوگا اور جو قابلیت کا کم سے کم معیار معین کرے گا اور ملازمتوں کے لیے قابل اُمیدواروں کی بھرتی کا بھی خیال رکھے گا اور یہ خیال رکھے گا کہ ہر ملت کو یکساں طور پر حصہ ملے۔

(۵) مرکزی اور صوبوں کی وزارتوں میں مسلم مفاد کا کافی طور پر اس قسم کے رواج کے ذریعے لحاظ رکھا جائے جو مجالس قانون ساز کی مختلف جماعتوں میں باہمی طور پر طے ہو جائے۔

(۵) مرکزی اور صوبجاتی وزارتوں کی ترتیب میں رواج کے ذریعہ اقلیتوں کے حقوق کی نمائندگی ہوا کرے گی۔

(۶) سندھ ایک علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

(۶) صوبہ سرحد اور بلوچستان کو اس قسم کی اصلاحات دی جائیں جو ملک کے دیگر صوبوں کو ملیں۔

(۷) صوبہ شمالی اور مغربی سرحد اور بلوچستان کو بالکل اسی نوعیت کی اصلاحات دی جائیں جس نوعیت کی ہندوستان کے دیگر صوبوں کو ملیں۔

(۷) سندھ علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے بشرطیکہ اہل سندھ اگر زائد خرچ ہو تو اسے خود برداشت کریں۔

(۸) ملک کا مجوزہ دستور اساسی وفاقی ہو۔ اختیارات غیر مصرحہ وفاقی حکومتوں (اجزائے ترکیبیہ) کو حاصل ہوں۔

(۸) ملک کا آئندہ دستور اساسی وفاقی ہوگا۔ محفوظ اختیارات وفاقیہ کے مختلف اجزاء کو حاصل ہوں گے۔ الا یہ کہ مزید غور و خوض کے بعد یہ ثابت ہو کہ یہ صورت مفاد ملک کے لیے مفید نہیں ہے۔

(۹) (الف) بنیادی حقوق میں اس قسم کی
ایک دفعہ بھی داخل ہو جس میں ہر باشندے
کی تہذیب اس کے تمدن، اس کی زبان، اس
کا رسم الخط، اس کی تعلیم اس کا پیشہ اور اس کے
مذہبی مراسم، اوقاف اور اقتصادی مفاد سب
حکومت کی زد سے محفوظ رہیں۔

(ب) پرسنل لا اور بنیادی حقوق کا تحفظ دستور
اساسی میں صاف وصریح دفعات کے ذریعہ
کر دیا جائے۔
(ج) جہاں تک بنیادی حقوق کا تعلق ہے
دستور اساسی میں کوئی ترمیم نہ ہو سکے گی الا یہ
کہ مرکزی مجلس قانون ساز کے دونوں
ایوانوں کے اراکین کے $\frac{3}{4}$ تعداد اس کی
تائید کرے۔

''مجلس عاملہ نے ان مندرجہ بالا تجاویز کو اس طرح قبول کر لیا ہے کہ فرقہ پروری اور قوم پروری کے مابین ایک صورت نکل آئے لیکن پھر بھی اگر ایک طرف مجلس عاملہ لاہور کی قرارداد کی پابند ہے تو دوسری طرف اہل ملک سے اُمید کرتی ہے کہ وہ اس اسکیم کو منظور کریں گے وہ ان لوگوں کو بھی جو اس سے مختلف خیال رکھتے ہیں یہ یقین دلاتی ہے کہ اگر وہ کوئی اور ایسی تجویز سوچیں جو لاہور کی قرارداد کے مطابق ہو اسے قبول کر لے گی۔ بشرطیکہ متفقہ جماعتیں بھی اس سے مطمئن ہو جائیں۔''

معزز حاضرین! ان دونوں تجاویز کو غور سے پڑھیے تو آپ کو دونوں کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ کانگریس نے بعض تجاویز کو مطلق نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً مرکزی مجلس کے دونوں ایوانوں میں مسلمانوں کی $\frac{1}{4}$ نمائندگی یا دستور اساسی کی ترمیم کے لیے $\frac{3}{4}$ کی شرط اسی طرح

بعض دفعات میں کچھ قیود کا اضافہ کر کے مشتبہ کر دیا گیا۔ بعض کو مبہم کر دیا گیا ہے۔ اگر چہ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس کی تجویز مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی تجویز سے بہت قریب ہے۔ اقلیتوں کے مسئلے کو بھی اُس نے ایک حد تک سلجھا دیا ہے۔ پنجاب و بنگال کے مسئلے کو سلجھانے میں بھی اُس نے پوری سعی کی ہے۔ بہرحال اس نے فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے میں ایک خوشگوار قدم اُٹھایا ہے۔ چونکہ کانگریس نے اپنی تجویز کے ساتھ مفاہمت کا دروازہ بند نہیں کیا ہے اس لیے میں اُمید کرتا ہوں کہ باہمی گفتگو سے شکوک وشبہات کا دور ہو جانا بہت سہل ہو گیا ہے۔ جو لوگ نیشنلسٹ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ تمہارے مطالبات بھی کانگریس نے اس وقت تک منظور نہیں کیے اُن کے لیے اب موقع ہے کہ وہ رواداری کی اسپرٹ کے ساتھ کانگریس کی تجویز پر غور کریں اگر وہ کسی اور دفعہ کا اضافہ کرانا چاہیں یا کسی دفعہ کو تبدیل کرانا چاہیں تو مسلم نیشنلسٹ پارٹی کو اُس پر توجہ دلائیں تا کہ باہمی تبادلہ خیالات کے ساتھ اس تجویز میں ترمیم کی جا سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر مسلمانوں کے اتحاد کا موقع نہیں ہے۔ اگر کانگریس کمیٹی مسلم نیشنلسٹ پارٹی کی تجویز کو بلا کسی ترمیم کے قبول کر لیتی تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ مسلم مطالبات کے قریب ترین ہو جاتی۔ کانگریس نے بعض ایسی دفعہ کا بھی اضافہ کیا ہے جو مزید تشریح کی محتاج ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ حضرات کانگریس کمیٹی کی تجویز کو منظور کرنے میں عاجلانہ اقدام نہ کریں گے بلکہ مسلمانوں کو غور وفکر کا موقع دیں گے۔ یہ قوموں کی موت وحیات اور بقا وفنا کا معاملہ ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ کا فیصلہ انتہائی غور وفکر کے بعد ہو اور آپ جلدی میں کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائیں جو مسلم قوم کے لیے کسی ایسے نقصان کا موجب ہو جس کی تلافی آئندہ آپ کے امکان میں نہ ہو۔

جمعیۃ علماء ہند اور مسلم حقوق

حاضرین کرام! اس موقع پر یہ مناسب ہوگا کہ میں اس تجویز کو بھی آپ کے سامنے پیش کر دوں جو جمعیۃ علماء ہند کی ایک سب کمیٹی نے مرتب کی تھی اور جس کو مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے ارکان نے اپنے عام اجلاس میں منظور کیا تھا۔ اس تجویز کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں جمعیۃ علماء

ہند نے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی تشریح کی ہے اور دوسرے حصہ میں ان حقوق کا اظہار کیا ہے جو آج کل عام طور سے سیاسی جماعتوں میں مابہ النزاع ہیں۔ پہلے حصہ کی نقل گزشتہ مارچ میں گاندھی جی کو دے دی گئی تھی۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے جو تجویز بمبئی میں پاس کی ہے اور جس کو ابھی آپ نے سنا ہے اس تجویز میں بعض چیزیں کانگریس کمیٹی نے منظور کر لی ہیں لیکن اکثر حصہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر چہ جو دفعات کانگریس نے منظور کی ہیں وہ اصولی حیثیت سے صحیح ہیں لیکن جب تک وہ تمام فارمولا جو مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی کو دیا گیا ہے کانگریس منظور نہ کرے گی۔ مذہبی طبقہ مطمئن نہ ہوگا۔ میری غرض یہ نہیں ہے کہ میں کسی تفصیلی منظوری کا خواہشمند ہوں منظوری خواہ اجمالی ہو لیکن اصول تسلیم کر لیا جائے بہر حال تجویز کے الفاظ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ آپ کی جماعت اُن تمام حقوق کی پوری تائید کرے گی۔

جمعیۃ علماء ہند کی تجویز

<u>پہلا حصہ:</u>

جمعیۃ علماء ہند کے نزدیک ضروری ہے کہ مذہبی حقوق کی حفاظت کے لیے دستور اساسی میں حسب ذیل دفعات شامل ہوں۔

(۱) مسلمانوں کے لیے قربانی گاؤ و ذبیحۂ گاؤ کی آزادی۔

(۲) مسلمانوں کی بہت سی مذہبی ضرورتیں بغیر مسلمان قاضی کے پوری نہیں ہوتیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے لیے دار القضاء کے قیام کو اصولاً تسلیم کر لیا جائے اور حکومت مشترکہ ہند اس کی کفیل ہو۔

(۳) مسلمانوں کو آزادی ہو کہ وہ امارۃ شرعیہ کا ادارہ قائم کریں جیسے کہ آج بھی صوبہ بہار میں اس کا نمونہ قائم ہے۔

(۴) مذہبی تعلیم، مذہبی تعلیم کی زبان، مذہبی تعلیم کا نصاب، مذہبی ادارے، مذہبی

تحریکیں، مساجد، عیدگاہیں، تکیے، امام باڑے، کربلائیں، اوقاف، خانقاہیں، مدارس، مقابر و قبرستان، آثار قدیمہ اسلامیہ، عماراتِ اسلامیہ محفوظ رکھی جائیں گی اور آئندہ بھی اُن کی تشکیل وتعمیر وقیام واستعمال کے لیے مسلمان آزاد ہوں گے۔

(۵) حکومت کے مدارس میں اس کالحاظ رکھا جائے گا کہ نصاب تعلیم، طریقہ تعلیم، اشیاء متعلقہ تعلیم میں کوئی ایسی چیز نہ آنے پائے جو مسلمانوں کی تہذیب یا ان کے مذہب پر برا اثر ڈالتی ہو یا ان کے جذبات کو مجروح کرتی ہو۔

(۶) مسلمان اپنے مذہبی مدارس اور مذہبی اداروں میں ممالک اسلامیہ کے ماہرین سے خدمات لینے اور اس غرض کے لیے ان کو بلانے اور ان کا تقرر کرنے میں آزاد ہوں گے۔ حکومت اس کے خلاف پابندی عائد نہ کرے گی۔

(۷) مسلمانوں کو کسی ایسی چیز پر مجبور نہ کیا جائے گا جو ان کے مذہب کے خلاف ہو اور نماز کے اوقات میں بالخصوص جمعہ کے لیے ادائے نماز کی غرض سے ان کو چھٹی دی جائے۔

(۸) مذہبی تبلیغ آزاد رہے گی۔

(۹) مسلمانوں کے مذہبی معاملات مثلاً نکاح، طلاق، وراثت، ولایت، حضانت، بلوغ، تفریق زوجین، خلع، فسخ نکاح، عنین، مفقود، سفرحج وزیارت۔ اوقاف کے لیے اسلامی احکام کے خلاف قانون نہ بنایا جائے گا۔ نہ کوئی غیر مسلم ایسے قانون بنانے والی کمیٹی میں شریک ہوگا اور نہ کوئی ایسا قانون اسلامی مذہبی اداروں کی تصدیق کے بغیر قابل قبول ہوگا۔

(۱۰) ان تمام امور مذکورۂ دفعات بالا کا اہتمام وانتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے گا۔

دوسرا حصہ:

چونکہ مسلم قوم قلت تعداد کے ساتھ تمول اور تعلیم میں بھی بہت پیچھے ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اقتصادی اور سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے حسب ذیل دفعات کی دستور اساسی میں تصریح کردی جائے۔

(۱) حق رائے دہندگی کا ایسا طریقہ قائم کیا جائے کہ ہر قوم کو اس کی تعداد کے موافق رائے دہندوں کی تعداد حاصل ہو جائے۔

(۲) پنجاب و بنگال کی اکثریت کی پوری حفاظت کردی جائے۔

(۳) صوبہ سرحد و بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ اور دوسرے صوبوں کے طرزِ حکومت کے موافق ان دونوں میں قیام حکومت کے لیے فوراً متفقہ سعی شروع کردی جائے اور اس سعی کو کسی دوسری چیز پر معلق و مشروط نہ رکھا جائے۔

(۴) صوبہ سندھ کی علیحدگی بلا شرط تسلیم کرلی جائے۔

(۵) مرکزی مجلس قانون اور قوت عاملہ میں مسلمانوں کو ایک ثلث نشستیں دی جائیں۔

(٦) یہ قاعدہ تسلیم کرلیا جائے کہ کسی قانون ساز مجلس میں کوئی مسودۂ قانون، تجویز یا ترمیم یا اضافہ پیش نہ ہوسکے گا۔ اگر مسلم یا غیر مسلم جماعتوں کے $\frac{۳}{۴}$ ارکان۔ اس کو اپنی ملت کے مفاد کے خلاف قرار دیں۔

(۷) صوبوں کی مسلم اقلیتوں کو باہمی سمجھوتہ سے اگر اکثریت کوئی رعایت دے تو اسی نسبت سے غیر مسلم اقلیتیں بھی اپنے صوبوں میں رعایت کی مستحق ہوں گی اور اس باہمی مفاہمت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہیے۔ بشرطیکہ کوئی اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہوجائے۔

(۸) اقلیتوں کی نشستوں کو محفوظ کردینے کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ اُس کو دس سال کے ساتھ مقید نہ کیا جائے بلکہ اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک اقلیتیں اس کو ضروری سمجھیں۔

(۹) ملازمتوں کے لیے ایک کم از کم معیار قابلیت معین کردیا جائے کہ خوش اسلوبی سے کام ہوسکے اور پھر اس معیار کے ماتحت ہر قوم کو اس کی تعداد کے موافق اعلیٰ اور ادنیٰ ہر قسم کی ملازمتوں میں حصہ دیا جائے۔

(۱۰) ہر ملت کو اس کی تعلیم و تہذیب کو فروغ دینے کے لیے سرکاری امداد میں اس کی آبادی کے تناسب سے حصہ دیا جائے اور اس کی ملت کی تعلیم کا انتظام اسی ملت کے افراد کے سپرد کیا جائے۔

(۱۱) حلقہ ہائے انتخاب ایسے طریقے سے قایم کیے جائیں کہ اکثریت کی حیثیت پر کوئی ناگوار اور مضر اثر نہ پڑے۔

(۱۲) دولت متحدہ کی سرکاری زبان ہندوستانی ہوگی جس کا رسم الخط اُردو اور ہندی ہوگا۔

(۱۳) نیابت متناسبہ کے مذکورہ بالا اصول تمام انتخابی مجالس میں جاری ہوں گے۔

(۱۴) جب تک یہ تمام ضمانتیں دستور اساسی میں داخل نہ ہو جائیں گی اس وقت تک مسلمان انتخاب جداگانہ سے دستبردار نہ ہوں گے اور دستور اساسی کو قبول نہ کریں گے''۔

علماء کرام! ہندو مسلم مفاہمت کا مسئلہ تقریباً تین سال سے زیر بحث ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جس قدر مباحث طویل ہوتے جاتے ہیں اتنی ہی اُلجھنیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ اگر اس ملک کی اکثریت وسیع النظر اور کشادہ دل ہوتی اور یا اس ملک کی اقلیت کے قلب میں خوف و ہراس نہ ہوتا تو شاید یہ دُشواریاں پیش نہ آتیں۔ قوموں کے معاہدے چند افراد کے مابین ہوا کرتے ہیں لیکن یہاں بدقسمتی سے ہر شخص مستقل لیڈر ہے۔ کسی مسئلے کی اہمیت سمجھ میں آئے نہ آئے لیکن ہر شخص رائے دینے اور بحث کرنے کو تیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاملات میں بہت پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔

پنجاب و بنگال کی اکثریت

معزز حاضرین! میں سمجھتا ہوں کہ جو مسائل آج کل زیر بحث ہیں اُن میں بڑی حد تک مفاہمت کا امکان ہے۔ کانگریس کمیٹی کسی ایسی مفاہمت پر آمادہ ہے جو اصول جمہوریت اور فرقہ پروری کے مابین ہو۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اکثریت کا دعویٰ قومیت و جمہوریت قابل اعتنا نہیں ہے۔ اس لیے اس ملک کے باشندوں کا فی الحال قومیت۔ کے کسی انتہائی نقطے پر جمع ہونا مشکل ہے اور جب انتہائی قومیت ناممکن ہے تو لامحالہ جو حل بھی تلاش کیا جائے وہ ایسا ہو کہ اُس پر ہر فرقہ مطمئن ہو سکے۔ اس وقت جس مسئلہ کا حل سب سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے وہ پنجاب و بنگال کی مسلم اکثریت کا مسئلہ ہے۔ یہی دو صوبے ایسے ہیں کہ جن میں مسلمانوں کی بہت معمولی اکثریت ہے اور یہی وہ صوبے ہیں جن کی اکثریت، مسلمان لکھنؤ پیکٹ کے موقع پر زائل کر چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس وقت مسلمانوں نے پوری جدوجہد نہ کی تو آئندہ اُن کے لیے کوئی موقع نہیں ہے کہ وہ ان دونوں صوبوں میں اپنی اکثریت قائم کر سکیں۔ اس

لیے کوئی ایسی تجویز جس میں ان دو صوبوں میں مسلم اکثریت کے باقی رہنے کا یقین نہ ہو مسلمان قبول نہیں کر سکتے۔

ہم انصاف چاہتے ہیں!

میرے عزیز دوستو! آپ جانتے ہیں کہ جمعیۃ علماء کے ارکان سرکار پرست نہیں ہیں۔ انہوں نے سول نافرمانی کے زمانے میں ہندوؤں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر حکومت سے جنگ کی ہے۔ آئندہ بھی جب کبھی جنگ کا سوال پیش ہوگا تو وابستگان جمعیۃ علماء ہند انشاء اللہ میدان میں سب سے آگے ہوں گے۔ ہم اس ملک میں اجنبی حکومت کو پسند نہیں کرتے۔ ہماری جنگ کا مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہم غیر ملکی حکومت کے آہنی پنجے سے اپنے ملک کو آزاد کرالیں۔ آج ہم سب ظلم کی مدافعت کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ کسی نئے ظلم کو دعوت دینے کے لیے کھڑے نہیں ہوئے۔ جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں ہم نے نہایت خندہ پیشانی سے اکثریت پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ جس طرح ہم نے ہندو اکثریت پر اعتماد کرنے میں کوئی عذر نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی اکثریت پر ہندوؤں کی جانب سے بھی اسی خوشدلی کے ساتھ اعتماد کا اظہار چاہتے ہیں۔ ہم اس کو پسند نہیں کرتے کہ پنجاب و بنگال کی اکثریت سے محض اس لیے اعراض کیا جائے کہ ان دو صوبوں کی اقلیت اکثریت کی حکومت نہیں چاہتی۔ میں ہندو ذہنیت کو کوئی طعنہ نہیں دینا چاہتا۔ بلکہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف کا مطالبہ کرتا ہوں۔ پنجاب و بنگال کی مسلم اکثریت کے تحفظ کا سوال ایسا سوال ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

طریقہ انتخاب

حضرات علماء کرام! طریقہ انتخاب کی بحث نے بھی آج کل ایسی اہمیت اختیار کر لی ہے کہ مسلم قوم میں ایک لاینحل مسئلہ بن گیا ہے دنیا کی تمام قوموں کا یہ دستور ہے کہ دستور اساسی کی تدوین کے وقت ہر قوم اپنے اپنے تحفظ کے لیے زائد سے زائد دفعات کا اضافہ کرانے کی

کوشش کیا کرتی ہے لیکن یہاں کا معاملہ عجیب ہے، یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ دستور اساسی میں مسلمانوں کے حقوق کس طرح محفوظ کیے جائیں۔ بلکہ یہاں بحث یہ ہے کہ جو لوگ اسمبلی اور کونسلوں میں اب تک منتخب ہوتے رہے ہیں وہ آئندہ بھی منتخب ہوتے رہیں۔ جداگانہ یا مخلوط انتخاب کو بھی اس نظر سے نہیں دیکھا جاتا کہ مسلمانوں کے لیے ان میں کون سا مفید ہے۔ بلکہ محض اس لیے دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے لیے کیا مفید ہے۔

محترم حضرات! اگر دستور اساسی میں آپ کے حقوق کے تحفظ کا کوئی سامان نہیں ہے تو انتخاب کی بحث بالکل بیکار ہے۔ اگر آسمان کے ملائکہ کو بھی آپ کونسلوں میں بھیج دیں تو وہ کچھ نہیں کر سکتے لیکن اگر دستور اساسی میں صاف وصریح اور ناقابل تاویل دفعات مسلم حقوق کے متعلق موجود ہوں تو پھر کوئی ضرر نہیں۔ لڑنے کی چیز بنیادی حقوق ہیں۔ طریقۂ انتخاب نہیں ہے۔ ہماری بدقسمتی دیکھیے کہ آج کل ہر طرف طریقۂ انتخاب کے جھگڑے ہو رہے ہیں لیکن کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ بنیادی اصول میں مسلمانوں کی زندگی کا سامان کیا ہے۔ میں نے ہمیشہ مسلمانوں سے عرض کیا ہے کہ آپ دستور اساسی کی فکر کیجیے۔ اگر دستور اساسی میں مسلمانوں کے حقوق کا کماحقہ تحفظ ہو جائے تو پھر کسی ٹائپ کے مسلمان سے خطرہ نہیں ہے۔ جداگانہ انتخاب کی وجہ سے ڈاکٹر اقبال نے تین سال تک کونسلوں میں تشریف لے جا کر مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچایا جو مخلوط انتخاب کی وجہ سے ڈاکٹر انصاری تشریف لے جا کر مسلمانوں کو نقصان پہنچا دیں گے۔ جداگانہ انتخاب سے جانے والے مسلمان کو اگر پنجاب کونسل میں شراب کی حمایت کر سکتے ہیں تو مخلوط انتخاب سے جانے والے مسلمان شراب فروشی سے بڑھ کر کون سا گناہ کریں گے۔ بہرکیف میں اس وقت اس مسئلے کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا اور نہ میں اس کے نفع اور ضرر پر بحث کرنا چاہتا ہوں یہ مسئلہ اس قدر زیر بحث آچکا ہے کہ خواص تو خواص عوام بھی اس کو بہت کچھ سمجھ چکے ہیں۔ مجھے آپ کے سامنے اس وقت جو کچھ عرض کرنا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ جداگانہ انتخاب کی حقیقت کچھ بھی ہو۔ اس کا رواج انگریزوں نے اپنے فائدے کے لیے کیا ہو یا مسلمانوں کے فائدے کے لیے۔ یہ تقسیم بنگال کی تنسیخ کا صلہ ہو یا محض مسلمانوں کے ساتھ رعایا پروری کا سلوک کیا گیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اگر ہر بالغ کو حق

رائے دہندگی دے دیا جائے یا تناسب آبادی کے لحاظ سے ہر ملت کو ووٹ مل جائیں تو جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں یقیناً مسلمانوں کے لیے مخلوط انتخاب مفید ہے۔ میں آپ حضرات سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا صوبہ سرحد و بلوچستان میں جہاں ۹۵ فیصدی مسلمان ہیں وہاں بھی مخلوط انتخاب مسلمانوں کے لیے مضر ہے؟

کیا صوبہ سندھ جہاں ۷۵ فیصدی مسلمان ہیں وہاں بھی مخلوط انتخاب مسلمانوں کے لیے نقصان رساں ہے۔ کیا پنجاب و بنگال میں بھی مخلوط انتخاب مسلمانوں کے لیے ضرر رساں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی کم ہو وہاں مخلوط انتخاب مسلمانوں کے لیے بجز مخصوص صورت کے نقصان رساں ہو۔ اس امر کا دعویٰ کرنا کہ مخلوط انتخاب ہندوستان کے تمام صوبوں میں ہر حالت کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے مفید ہے۔ صحیح نہیں ہے جس طرح یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ مخلوط انتخاب تمام صوبوں میں ہر حالت کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے مضر ہے۔

مخلوط انتخاب کی شرائط

میرے معزز بزرگو! جداگانہ انتخاب کتنا ہی مضر ہو اور مخلوط انتخاب کتنا ہی مفید ہو یہ واقعہ ہے کہ جداگانہ انتخاب مسلمانوں کا قانونی حق ہے اور یہ حق مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر اُن سے نہیں لیا جا سکتا۔ اب تک حکومت کے ہر ذمہ دار نے یہی کہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آج تک کسی انگریز نے جداگانہ انتخاب کو اچھا نہیں کہا اور ہر وہ شخص جو ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کا خواہشمند ہے اس کو برا ہی کہتا ہے۔ بلکہ جداگانہ انتخاب کے حامی بھی اس کو اچھا نہیں سمجھتے اور یہ بھی ضرور ہے کہ حکومت خود اختیاری کی راہ میں جداگانہ انتخاب ایک سنگ راہ ہے۔ جب تک اس ملک میں جداگانہ انتخاب رہے گا اس ملک کو حکومت خود اختیاری نہیں دی جائے گی۔ یہ بھی مسلم ہے کہ جداگانہ انتخاب کی حالت میں جو وزارت مرتب ہوگی وہ فرقہ وارانہ اصول پر ہوگی اور جو وزارت فرقہ وارانہ اصول پر مرتب ہوگی۔ وہ اقلیت کے لیے تباہ کن ہوگی اور یہ بھی صحیح ہے کہ ایسی اکثریت کی حکومت جو اقلیت کے ووٹوں کی کسی حالت میں بھی محتاج نہ ہو اقلیت کے

لیے ایک مصیبت کبریٰ ہوگی لیکن ان تمام خرابیوں کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ مسلمان اس حق کو بغیر کسی کافی ضمانت کے چھوڑنے کو تیار نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے بھی یہ نامناسب ہے کہ ہم مسلمانوں کو بلا اُن کا اطمینان کیے ہوئے یہ مشورہ دیں کہ اس حق سے وہ دستبردار ہو جائیں۔ اس لیے میں نہایت صاف اور واضح الفاظ میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ جب تک مسلمانوں کو پوری طرح مطمئن نہ کر دیا جائے گا۔ مسلمان اپنے اس حق سے دستبردار نہ ہوں گے۔

اس وقت بدقسمتی سے مِلک میں جو معاملہ زیر بحث ہے وہ پنجاب و بنگال کی حکومت کا ہے۔ جب تک مسلمانوں کو یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ پنجاب و بنگال میں اُن کی حکومت اسی طرح ہوگی جس طرح ہندوؤں کی حکومت یو پی اور بہار میں ہوگی اُس وقت تک مسلمان ہرگز اس حق سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔

میں آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مجھے اُن لوگوں سے اتفاق نہیں ہے جو ہر اطمینان کے بعد بھی جداگانہ انتخاب کو چھوڑنے سے انکار کرتے ہیں یا پنجاب و بنگال کی مسلم اکثریت کے تحفظ کے بعد بھی جداگانہ انتخاب پر اصرار کرتے ہیں۔ اگر ہندو خوش دلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ پنجاب و بنگال میں مسلم اکثریت کی حکومت کو قبول کرلیں یا ایسا طریقہ انتخاب کا منظور کرلیں جس سے مسلمانوں کی اکثریت کا قائم ہو جانا یقینی ہو تو پھر جداگانہ انتخاب پر اصرار کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر جداگانہ انتخاب کے حامی مخلوط انتخاب کے اصول کو قبول کرلیں تو کسی خاص مدت تک کے لیے جداگانہ انتخاب کی حمایت کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں میں آپ حضرات کو یہ مشورہ دوں گا کہ باہمی مفاہمت کا دروازہ بند نہ کیجیے۔ اگر جداگانہ انتخاب کے حامی اس امر پر رضامند ہوں کہ کسی خاص مدت کے بعد دفعۃً یا تدریجاً مخلوط انتخاب کو قبول کرلیں گے تو باہمی سمجھوتے کو ہر حالت میں ترجیح دی جائے۔

گول میز میں مذہبی طبقے کی نمائندگی

معزز علماء کرام! مجھے اس موقع پر آپ کی توجہ گول میز کانفرنس کی نمائندگی کے متعلق بھی

مبذول کرائی ہے۔ گزشتہ کانفرنس میں جو حضرات نمائندگان کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے اگرچہ وہ تمام گورنمنٹ کے نمائندے تھے اور اُن نمائندوں میں کانگریس کا کوئی نمائندہ شریک نہیں ہوا تھا لیکن گورنمنٹ نے اس موقع پر بھی مذہبی جماعت کی نمائندگی کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ آئندہ ستمبر میں جس گول میز کانفرنس کا انعقاد ہونے والا ہے اس میں گورنمنٹ کے منتخب شدہ ارکان کے علاوہ کانگریس کے ارکان بھی شریک ہورہے ہیں۔ جہاں تک سیاسی حقوق کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کانگریس سے قوم پرور جماعت کا تصفیہ ہوجائے اور کانگریس مسلم مطالبات کی حمایت کا ذمہ لے لے تو کانگریس اور مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے ارکان کی نمائندگی پر اطمینان کیا جاسکتا ہے لیکن جہاں تک مسلمانوں کے مذہب اور اُن کے پرسنل لا کا تعلق ہے مذہبی طبقے کی نمائندگی بہت ضروری ہے۔ اگر اس موقع پر مذہبی طبقے کی نمائندگی سے اغماض واعراض کیا گیا تو مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ میں آپ کے صوبے کی جمعیۃ اور عام مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ پوری قوت کے ساتھ اس معاملے میں آواز بلند کریں۔ تمام ملک میں جلسے کیے جائیں اور گورنمنٹ کو اس مذہبی ضرورت کی جانب توجہ دلائی جائے۔

حضرات! ملک میں ایک نیا دستور نافذ ہورہا ہے حکومت انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوستان کے باشندوں کے ہاتھ میں آرہی ہے۔ بدقسمتی سے نہ تو مسلمانوں کے مذہب سے وہ طبقہ واقف ہے جو اس وقت حکومت کا مالک بنا ہوا ہے اور نہ وہ لوگ واقف ہیں جو آئندہ زمام حکومت کو ہاتھ میں لینے والے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو اگر اپنے مذہب کی حفاظت مقصود ہے تو وہ آئندہ دستور اساسی میں زیادہ سے زیادہ ایسی دفعات کو داخل کرائیں جن سے اُن کے مذہبی حقوق کا صحیح تحفظ ہوسکے۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں کی پوری توجہ سیاسی حقوق کی جانب مبذول ہے۔ سیٹوں کا خیال ہے، وزارتوں کی فکر ہے، ملازمتوں کا چرچا ہے، لیکن اگر تذکرہ نہیں ہے تو مذہبی حقوق کا۔ جمعیۃ علماء ہند جس نے سب سے پیشتر مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت کا اعلان کیا اور جس کی تجویز آپ ابھی سن چکے ہیں وہ جمعیۃ کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ اس کی آواز کو ہر طرح بے اثر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کا گناہ

صرف اتنا ہی ہے کہ وہ انگریزوں کی حمایت کرنے کو تیار نہیں ہے اور اُس نے ملکی آزادی میں حصہ لیا ہے۔ میں آپ حضرات سے بحیثیت مسلمان ہونے کے اپیل کرتا ہوں کہ اگر دنیاوی حقوق کا تحفظ ہی مقصود ہے تو اُس کی شکل بھی یہی ہے کہ تم دین کی حفاظت کرو۔ ان تنصرو الله ینصر کم

یاد رکھو جو شخص صبح کو اپنے بستر سے دین کی فکر اور مذہب کا خیال لے کر اُٹھتا ہے خدا تعالیٰ اس کی دنیا کا ضامن ہوتا ہے اور جو بندہ دنیا کی فکر لے کر صبح کرتا ہے خدا تعالیٰ اس سے بے پروا ہوتا ہے۔ یہ دنیادار کسی جنگل میں ہلاک ہو جائے، اس کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ پس اگر آپ حضرات آئندہ دستور اساسی میں مذہبی حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں تو علماء کی نمائندگی کے لیے مؤثر آواز بلند کیجیے۔ اگر آپ نے سعی کی تو جمعیۃ علماء ہند کے کم از کم دو نمائندے ضرور گول میز میں شرکت کرسکیں گے۔

معذرت

حضرات! میں نے آپ کی بہت زیادہ سمع خراشی کی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے اور جو بار آپ نے میرے کندھوں پر ڈالا ہے اس میں میری اعانت فرما کر مجھے شکریہ کا موقع دیں گے۔ فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه اولئک الذین هداهم الله اولئک هم او لواالالباب۔ (سورۃ الزمر (۳۹):۱۸)

دُعا

رَبَّنا لا تؤاخذنا ان نسينا او اخطانا ربنا ولا تحمل علينا اصراً كما حملته على الذينٌ من قبلنا ربنا ولا تحملنا ما لا طاقة لنا به وَعُف عنا واغفرلنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا على القول الكافرينO (سورۃ البقرہ (۲):۲۸۶)

فقیر احمد سعید کان اللہ لہ

۱۸ر جولائی ۱۹۳۱ء

خطبہ مولانا احمد سعید (۱۹۴۰ء)

اس میں شک نہیں کہ کانگریس نے جس ڈسپلن کا ثبوت دیا ہے اور الیکشن میں مقبولیت کا جو مظاہرہ اس کی جانب سے ہوا ہے، وہ ملک کی کسی ایک جماعت کو بھی اب تک نصیب نہیں ہوا اور یہی وجہ ہے کہ اس ہمہ گیر نمائندگی کا اعتراف کرنے پر مسٹر ایمرے بھی مجبور ہیں۔ یہ اس کے ڈسپلن کی بہترین مثال ہے کہ اس نے وزارتوں کے ترک کرنے کا ادھر فیصلہ کیا اور ادھر تعمیل ہو گئی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وزرا جیل خانے جائیں اور اس فیصلے کی فوری تعمیل ہو گئی۔ چنانچہ آج آپ دیکھتے ہیں کہ کل کے وزیر اعظم آج کے قیدی بنے ہوئے جیل خانوں میں پڑے ہیں۔ ڈسپلن کا یہ نمونہ آج ہندوستان کی کسی جماعت کو نصیب نہیں ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود جس بات کا افسوس ہے وہ یہ کہ کانگریس کے نیتاؤں اور ذمہ دار لوگوں کے دل کافر کی قبر کی طرح بہت ہی تنگ واقع ہوئے ہیں۔ اگر کانگریس میں مہا سبھائی ذہنیت کے لوگ نہ ہوتے تو آج کانگریس کی یہ حالت نہ ہوتی۔

کانگریس کی بے پناہ طاقت اور انتخابی قوت نے کانگرس کو آٹھ صوبوں میں حکومت کا موقع دیا۔ کانگرسی حکومتوں کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس کی محبت کو لوگوں کے قلوب میں بڑھاتیں اور اقلیتوں کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرتیں۔ محبت تو وہی ہے جو طاقت اور اقتدار کے بعد پیدا ہو ع

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

غلام غلام کے ساتھ ہمدردی کرے، تو یہ زیادہ مؤثر نہیں۔ بادشاہ بن کر فقیروں کا دل

ہاتھ میں لے لو تو یہ بات قابل تعریف ہے۔ کانگریسی حکومتوں کو قدرت کے اس زریں موقع سے فائدہ حاصل کرنے کی ضرورت تھی لیکن ہوا کیا؟ وہی ہوا جو سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر کے پڑ جانے سے ہوا کرتا ہے۔ کم ظرفی اور تعصب کا وہ مظاہرہ کیا گیا کہ دشمن تو دشمن، دوست بھی پریشان ہو گئے۔ حکومت ملنے کے بعد بھی ترازو ہاتھ سے نہ گئی۔ جو چیز دی گئی تول تول کر اور ناپ ناپ کر دی گئی۔ خیر اس کا کوئی مضائقہ نہ تھا، تول کر ہی دیا جاتا لیکن پورا تو تولا جاتا۔ وزیر بن گئے، لیکن ڈنڈی مارنے کی عادت نہ گئی۔ ہندو نے مسلمانوں کو دو مختلف آنکھوں سے دیکھا۔ مسلمانوں کے قلوب میں شکوک وشبہات پیدا ہو گئے۔ بڑے لوگوں کا طرز عمل اتنا برا نہ تھا۔ جتنا عوام ہندوؤں نے برا طریقہ اختیار کیا، ہر عامی اور معمولی شخص کے لب ولہجہ میں فرق پیدا ہو گیا۔ اکثریت کا ہر فرد یہ سمجھنے لگا کہ میری حکومت ہو گئی اور حکومت بھی مشترک نہیں، بلکہ ہندوؤں کی حکومت، مسلمانوں پر قائم ہو گئی۔ آپ خیال کیجیے، ایک طرف حکومت کو یہ فکر کہ کانگریسی حکومتوں کو نیچا دکھایا جائے، دوسری طرف وزارت کے وہ حرماں نصیب، جن کی اُمیدیں خاک میں مل چکی تھیں۔ تیسری طرف وہ جاہل عوام جو کانگریس کے اس اقتدار کو پسندیدہ نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ اتنی مخالف قوتوں کی موجودگی میں کس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھنے اور حکومت کرنے کی ضرورت تھی۔"

(کاروان احرار، جلد۵، ۲۹-۱۲۷)

معرکۃ الآراء تقریر

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی

نائب صدر جمعیت علماے ہند

جمعیت علماے سہارنپور کے زیر اہتمام

ایک جلسہ عام میں اکتوبر، نومبر ۱۹۴۵ء کی کسی تاریخ کو
دفتر سنٹرل مسلم پارلیمنٹری بورڈ، دہلی نے شایع کی

مطبوعہ

دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی

۱۹۴۵ء

یہ تقریر سہارنپور میں کی گئی تھی لیکن تاریخ اور مہینے کا اس سے پتا نہیں چلتا لیکن چند باتیں اس کے مطالعے میں قطعی واضح ہو جاتی ہیں۔

(۱) جمعیت علمائے اسلام کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔

(۲) سیّد پور اور بھاگل پور میں لیگی غنڈوں کی شرمناک حرکات ظہور میں آ چکی تھی۔ جس میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کا اسم سامی آیا ہے کہ یہ واقعہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۵ء کا ہے۔ یہ تقریر اس حادثہ کے بعد کی ہے۔

(۳) اس تقریر میں آئندہ دسمبر میں ہونے والے مرکزی لیجس لیٹو اسمبلی کے انتخابات کا ذکر ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تقریر اکتوبر، نومبر ۱۹۴۵ء میں کسی موقع پر کی گئی ہوگی۔

تاریخ تحریک آزادی کا یہ دور بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ اس زمانے میں عام مسلمانوں کے جذبات نے جو رخ اختیار کر لیا تھا اس کے خلاف عقل و بصیرت کی کوئی بات کہنا بڑے دل گردے کی بات اور سخت آزمائش کی گھڑیاں تھیں۔ ہمیں اپنے بزرگوں پر ناز ہے کہ اس دور میں انھوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی تھی اور اس آزمائش سے سرخ رو گزرے تھے۔

حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمہ اللہ کی اس تقریر کا ایک ایک جملہ ان کی عزیمت و استقامت اور بصیرت پر شاہد عدل ہے۔

حضرت دہلوی کی تقریر مطالعہ فرمائیے اور عبرت حاصل کیجیے!

1

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

نحمده، ونصلی علی رسوله الکریم

امابعد۔صدر محترم! اور معزز حاضرین! غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ایک عرصہ سے علیل ہوں ۔نہ کہیں تقریر کرتا ہوں اور نہ کوئی سفر کرتا ہوں۔ یہاں بھی علاج کی غرض سے آیا ہوں۔ میرے معالج آپ کے شہر سہارنپور کے مشہور طبیب حکیم سیّد محمد یامین صاحب ہیں۔ ہر چند میں علاج کی غرض سے آیا تھا لیکن یہاں کی جمعیۃ علماء کے بعض ارکان نے تقریر پر اصرار کیا لیکن جس قدر میں عذر کرتا رہا۔ اسی قدر یہ لوگ اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ میں مجبور ہو گیا اور میں نے کارکنان جمعیۃ سے وعدہ کرلیا۔ پھر اس پر گفتگو شروع ہوئی کہ تقریر رات کو ہو یا دن کو؟ میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں تقریریں کی ہیں اور میں جانتا ہوں کہ تقریر کے لیے دن سے رات زیادہ موزوں ہوتی ہے۔ رات کو ایک قدرتی سکون ہوتا ہے۔ وقت بھی کافی ہوتا ہے۔ عام شور وغل سے شب کی تاریکی کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا ہے۔ وَجَعَلْنَا اللیلَ لباساً وَجعلنا النهار معاشا۔ یعنی رات کو ہم نے پردہ پوش بنایا ہے اور دن کو ہم نے ضروریات زندگی کے حصول کا ذریعہ تجویز کیا ہے لیکن تقریر کا یہ سکون واطمینان اس شخص کے لیے اُمید افزا ہو سکتا ہے جس کی طبیعت صحت سے ہمکنار ہو اور وہ کوئی طویل تقریر کرنا چاہتا ہو۔ چنانچہ ان حضرات کی خواہش تو یہ تھی کہ میں آج رات کو جوبلی پارک میں آپ سے خطاب کروں لیکن میرا قصد آج قیام کا نہیں ہے۔ اس لیے میں نے اس امر پر ان لوگوں سے سمجھوتہ کرلیا کہ یہ آج کے قیام پر اصرار نہ کریں اور میں جمعہ کے بعد تقریر کردوں۔ جوبلی باغ میں پھر انشاءاللہ آئندہ کسی موقع پر تقریر ہو جائے گی بشرطیکہ میری زندگی اور میری صحت نے مساعدت کی۔

میرے معزز دوستو! اس وقت جو نظم منشی ظہور احمد صاحب نے پڑھی ہے اور جس کا تعلق حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے ہے اس نظم نے میرے قلب پر خاص اثر کیا ہے۔

حقیقتاً حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ جو بدسلوکی اس پاکستانی علاقہ میں کی گئی ہے۔ اُس سے ان عزائم کا پتہ چلتا ہے جن کے لیے یہ مطالبہ اختراع کیا گیا ہے۔ غالباً پاکستان ایسا ہی ہوگا جہاں مذہب اور اہل مذہب کے ساتھ اسی قسم کا وحشیانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس پاکستان میں علماء حق کو رائے کی آزادی میسر نہ ہوگی اور مسٹر جناح کے پاکستان میں اس سے زیادہ اور توقع بھی کیا ہو سکتی ہے۔ جس پاکستان کی تعمیر مسٹر جناح اور نوابزادہ لیاقت علی خاں کے ہاتھوں ہوگی اس پاکستان میں کیا آپ نماز، روزے اور شعائر اسلامیہ کی چہل پہل دیکھ سکیں گے۔ بلکہ وہ پاکستانی علاقے تو فسق وفجور کی منڈیاں ہوں گی۔ جہاں سب کچھ ہوگا اور نہیں ہوگا تو دین الٰہی کا تذکرہ کہیں نہیں ہوگا۔

مولانا حسین احمد کی ذات اقدس کا جس خاندان سے تعلق ہے اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سادات کا خاندان ہمیشہ ظلم وستم کا نشانہ رہا ہے۔ شاید ہی اس اُمت پر کوئی ایسا دور گزرا ہوگا جس میں سادات کی توہین وتذلیل نہ کی گئی ہو۔ یزید کے زمانے سے لے کر آج تک ہمیشہ سادات کو اسی قسم کی تکالیف ومصائب سے دوچار ہونے کا موقع نصیب ہوا ہے اور ہندوستان میں تو حکومت برطانیہ کا اقتدار ہی اہل حق کی عزت اور ان کے خون پر رکھا ہوا ہے۔

تیر بر معصوم می بارد خبیث بد گہر
آسماں را می سزد گر سنگ بارد بر زمیں

صاحبو! یہ مولوی حسین احمد صاحب کی عزت وآبرو کا سوال نہیں بلکہ یہ واقعہ مسلم لیگ کی موت کا پیغام ہے۔ جس طرح حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ مروانی حکومت کی موت کا پیغام تھا اسی طرح سیّد حسین احمد کا واقعہ لیگ کی موت کا پیغام سمجھئے۔ ان شاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ لیگ کی لاش بھی حکومت متسلطہ کے اقتدار کے ساتھ ہی دفن ہوگی اور کچھ تعجب نہیں کہ جو یہ دونوں مردے ایک ہی قبر میں رکھے جائیں یا ایک ہی سمندر میں غرق ہوں۔

ہوئے ہم جو مر کے رُسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا!

حکومت متسلطہ کا اقتدار

میرے دوستو! میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر یہ مسلم لیگی مولانا حسین احمد صاحب کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ مولانا کی مسلم لیگ سے تو کوئی لڑائی نہیں ہے۔ مولانا کی جنگ تو حکومت متسلطہ ہو۔ اس کے اقتدار سے ہے۔ مولانا بار بار فرما چکے ہیں کہ میری لڑائی حکومت کے اقتدار سے ہے اس جنگ میں خواہ مجھے کسی سے بھی اشتراک عمل کرنا پڑے میں کروں گا۔ حضرت مولانا اپنا کام کر رہے ہیں اور اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہیں۔ یہ لیگی حضرات ان کی ایذا رسانی کے درپے کیوں ہیں۔ ان کی انگریزوں سے کوئی رشتہ داری ہے یا یہ انگریزوں کے کوئی قرابت دار ہیں یا کوئی ان کی ددھیال یا ننھیال کا انگریزوں سے کوئی تعلق ہے، آخر معاملہ کیا ہے؟ یہ تو ایسے بپھرے بپھرے پھر رہے ہیں جیسے خود ان کی ہی حکومت چھن رہی ہے۔ انگریز کی حکومت جوں جوں اس کے ہاتھ سے نکلتی ہے ووں ووں ان کی روح نکلتی ہے۔ خدا جانے وہ کیا بات ہے جو یہ صاف نہیں بتاتے۔ ارے بابا! ہماری تم سے کوئی لڑائی نہیں۔ تم ہمارے بھائی ہو۔ ہماری تم سے کوئی جنگ نہیں ہم تو اس حکومت کے اقتدار کو زائل کرنے کے درپے ہیں، جس نے ہمارے اقتدار کو دنیا کے ہر گوشہ سے زائل کیا ہے۔ اگر تم ہماری مدد نہیں کر سکتے تو خدا کے لیے ہمارا راستہ تو روک کر نہ کھڑے ہو۔ اگر ملک آزاد ہو گیا تو تمہاری اولاد بھی تو فائدہ اُٹھائے گی۔ ہم تو اس ملک کو چھاتی پر رکھ کر نہیں لے جائیں گے۔ ہماری تو قربانیاں صرف تاریخ میں رہ جائیں گی۔ باقی یہ زمین تو یہیں رہ جائے گی جس کو تمہاری اولاد اور اولاد کی اولاد برتے گی۔ تم تو انگریز کی محبت میں ایسے اندھے ہوئے ہو کہ تم کو نہ مذہب کا پاس ہے نہ اہل مذہب کا خیال ہے نہ کسی عالم کے ادب و احترام کا پاس ہے نہ سیّدوں کی آبرو کے تحفظ کا خیال ہے۔ آخر کچھ تو سوچو کیا کر رہے ہو۔ انگریز تو یہاں ہمیشہ نہیں رہے گا لیکن ہم کو تم کو تو اس ہی ملک میں ہمیشہ رہنا ہے۔ تم نے تو صید پور میں ایسی ناشایستہ حرکت کا ارتکاب کیا ہے کہ یزید کی روح بھی تھرا گئی ہوگی۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان

شاید تم کو معلوم نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ جس شخص پر ظلم کیا گیا اور مظلوم نے ظالم کو معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ مظلوم کی عزت اور بلند کر دیتا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا قول اس طرح منقول ہے کہ حضرت حق مظلوم سے فرماتے ہیں لانصرنک ولو کہ تیری مدد ضرور کروں گا اگرچہ کچھ دفقہ سے ہو۔ اب تم خدا کے انتقام کا انتظار کرو جو ضرور لیا جائے گا۔ اگرچہ کچھ عرصے کے بعد لیا جائے۔ ایک طرف ہمارے لیگی دوست منتقم حقیقی کے انتقام کا انتظار کریں اور دوسری طرف دیکھیں کہ خدا تعالیٰ کس طرح مظلوم کی عزت کو بلند کرتا ہے۔

سر سیّد کی تخم پاشی

میرے عزیزو! خدا جانے تم میری رائے سے اتفاق کرو گے یا نہیں! میں تو یہ سمجھ رہا ہوں کہ سر سیّد نے فاتح اور مفتوح میں محبت پیدا کرنے کی غرض سے جو تخم پاشی کی تھی آج مسٹر جناح اسی پیداوار کو کاٹ رہے ہیں۔ یہ علماء کی توہین اور تذلیل سر سیّد کے دور میں شروع کی گئی تھی اور اس کی غرض یہ تھی کہ علماء کے اقتدار کو اس ملک میں فنا کر دیا جائے تاکہ مسلمانوں کو کوئی مذہب کے نام پر اُبھارنے اور برانگیختہ کرنے والا نہ رہے اور ہم جس طرح چاہیں قرآن میں تحریف کر کے مسلمانوں کو گمراہ کر سکیں آج وہی ہمارے یہ پاکستانی دوست گزشتہ تاریخ کو دہرا رہے ہیں۔ تاکہ ان کو اپنی من مانی کارروائی کا موقع میسر آ جائے۔

دیوبند کے ایک بزرگ کا خط

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہمارے ایک بزرگ نے اپنے کسی عزیز کو خط لکھتے ہوئے یہ الفاظ کہے کہ مسلم لیگ کا یہ فائدہ کیا کم ہے کہ مسلمان بھی انگریزوں کی ہر مجلس میں پوچھے جانے لگے۔

سبحان اللہ! مسلم لیگ کی کیا بہترین خدمت ہے۔ اللہ! اللہ! فاتح اور مفتوح کے درمیان ان احسانات کا تذکرہ ہی تو مفتوح کی موت ہے۔ کیا مسلمانوں کا یہی مقصد زندگی تھا جس کو لیگ نے پورا کر دیا۔ میں کہتا ہوں یہی تو لیگ کا سب سے بڑا نقصان ہے کہ جو مسلمان حکومت متسلطہ کی صورت دیکھنے کا روادار نہ تھا وہ حکومت کے وجود کو اپنی زندگی اور اپنی بقا کا سہارا سمجھنے لگا۔ اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی کوئی اور سیاسی موت ہو سکتی ہے اور کیا مسلمانوں کی اس سیاسی موت کی ذمہ داری مسلم لیگ پر نہیں ہے۔

سہارنپور کے مسلمانو! میں اب تم سے کیا کہوں۔ میں نے ان بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں جن کی حالت یہ تھی کہ جب آپ کے صوبہ کا لفٹنٹ گورنر جس کا نام غالباً میسٹن تھا دارالعلوم کو دیکھنے آیا تو حضرت شیخ الہند قدس سرہ دیوبند چھوڑ کر مظفر نگر چلے گئے اور باوجود مولوی حبیب الرحمٰن مرحوم کے اصرار اور درخواست کے انھوں نے دیوبند چھوڑ دیا اور یہ سفر حضرت نے صرف اس لیے اختیار کیا کہ کہیں میسٹن سے ان کو ملاقات کرنی اور اس کی صورت دیکھنی نہ پڑے۔

آج انھی کے شاگرد رشید اس امر پر فخر کناں ہیں کہ انگریز ہر معاملہ میں مسلمانوں کو پوچھنے اور منہ تو لگانے لگا۔ مسلم لیگ کی کیسی شاندار خدمت کا اعتراف کیا ہے۔ جب مسلمانوں کے ذہن کو اس طرح غلامی کی جانب تبدیل کیا جائے گا اور گورنمنٹ کے ان احسانات کا تذکرہ کر کے اس کو انگریزی حکومت کا شکر گذار بنایا جائے گا تو وہ انگریزی حکومت کے اقتدار کو زائل کرنے والی جماعتوں میں آئے گا یا انگریزی حکومت کی خیر منائے گا۔ ان بزرگوں کے کلمات طیبات کی روشنی مسلمان کو ہر اس تحریک سے دور لے جائے گی جو حکومت متسلطہ کے خلاف ہو یا اس کو حکومت کی مخالفت پر آمادہ کرے گی۔ اگر اس ملک میں چند اور اسی شان کے بزرگ مسلم لیگ کے قصیدہ خواں پیدا ہو گئے تو وہ دن دور نہیں جبکہ مسلمان بخاری شریف کا ختم پڑھ پڑھ کر انگریزی حکومت کی بقا اور استحکام کے لیے دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مصالحت کی کوشش

اسی سوقیانہ روش کی موجودگی میں چاہتے ہو کہ لیگ اور جمعیۃ میں مصالحت ہو جائے۔ کیا مجھ سے بھی کوئی زیادہ اس امر کا خواہشمند ہوسکتا ہے کیا میں نے بار بار کوشش نہیں کی اور مسٹر جناح کی کوٹھی تک جمعیۃ کے لیڈروں کو نہیں پہنچایا۔ کیا میں نے صوبہ کی جمعیۃ علماء کی طرف سے ان کی خدمت میں دعوت نامہ نہیں بھیجا۔ میری خط وکتابت تو اب شائع بھی ہو چکی ہے وہ کون سا دن تھا جس دن میں نے اس کی کوشش نہیں کی لیکن مسٹر جناح میں یہ صلاحیت کہاں وہ تو ہر جماعت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ صلح صفائی کے آدمی ہی نہیں ان کو واحد نمایندگی کے زعم باطل نے آسمان پر چڑھا رکھا ہے۔ بین الاقوامی معاملات کیا اس طرح چلا کرتے ہیں۔ انگریز سے لڑنے کی تو خدا نے انھیں توفیق ہی نہیں دی۔ ہندو سے لڑنے چلے ہیں اور اپنے گھر میں اتفاق نہیں تم کو اپنوں سے لڑنے سے فرصت نہیں تم غیروں سے کیا خاک لڑو گے۔

ترا کے میسر شود ایں مقام
کہ با دوستانت خلافست و جنگ

اور اب تو تمہیں مصالحت کی ضرورت ہی نہیں۔

جمعیۃ علماء اسلام کا قیام

تم نے جمعیۃ علماء ہند کے مقابلہ میں ایک اور جمعیۃ علماء کی بنیاد رکھ دی ہے۔ جس جمعیۃ علما کی بنیاد ہندوستان کے مجاہد اعظم حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی۔ تم اس کے مقابلہ میں ایسے علماء کی ایک جماعت قائم کرنا چاہتے ہو جنھوں نے ہمیشہ علمائے حق کو کافر اور مرتد کہا ہے۔ وہ تو پیشہ ور کفر ساز ہیں۔ اب تمھارے پلیٹ فارم سے بھی وہ اپنا قدیم شغل پورا کریں گے۔

جمعیۃ علما یا مسجد ضرار

تم یقین مانو! کہ جمعیۃ علماء ہند کے مقابلہ میں جمعیۃ علماء اسلام کا قیام ایسا ہی ہے جیسے مسجد نبوی کے مقابلہ میں مسجد ضرار کا قیام! بھلا جس جمعیۃ کی بنیاد حکومت متسلطہ کی مخالفت اور اعلاء کلمۃ الحق کی حمایت کی غرض سے رکھی گئی تھی تم اس کا مقابلہ اس جماعت سے کرنا چاہتے ہو جو کاسہ لیسان ازلی کے کندھوں پر قائم کی جارہی ہے۔

اَسَّسَ بُنۡيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانۡهَارَ بِهٖ فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ (سورہ توبہ:۱۰۹)

کہاں حضرت شیخ الہند، کہاں مسٹر جناح، نواب زادے۔ سر رضا علی، سر فیروز خاں نون اور سر شفاعت۔ اگر مسلم لیگ واقعی ہندوستان کی آزادی کی خواہشمند ہے تو اس میں یہ دنیا بھر کی مردہ اور مفلوج لاشیں کیوں جمع کی جارہی ہیں۔ تمام دنیا کے نائٹ اور خان بہادر اور حکومت برطانیہ کے نیازمند اور تمام دنیا کے پیرزادے اور خانوادے مسلم لیگ کے جنازے پر کیوں اُمنڈ اُمنڈ کر آرہے ہیں۔ ایک طرف مسٹر جناح علماء کے اقتدار کو ختم کرنے کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف اپنے ڈھب کے علماء کو منظم کرتے پھرتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا طریقہ کار ہے۔ جن علما کی تم جماعت بنارہے ہو وہ جب اپنی برادری کے نہ ہوئے تو تمہارے کیا خاک ہوں گے۔ مولانا آزاد سبحانی اسکیمیں تو بہت اچھی بنا سکتے ہیں لیکن کیا آج تک کوئی جماعت بھی ان کے ہاتھوں پروان چڑھی ہے جن سے حلقہ ربانی اور گاڑھا کانفرنس سرسبز نہ ہو سکے جو شخص حلقہ ربانی کو کامیاب نہ کر سکے۔ وہ حلقہ شیطانی کی کیا رہنمائی کرے گا۔ بہرحال مسلم لیگ یہ حسرت بھی پوری کرلے اور لیگ کے جھنڈے تلے اس قسم کے مشہور بزرگوں کو جمع کر کے دیکھ لے۔

اِنَّ اللّٰهَ سَيُبۡطِلُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ (سورہ یونس:۱۰)

مسلم پارلیمنٹری بورڈ

میرے معزز دوستو! مجھے تو نہ زیادہ باتیں کرنی آتی ہیں اور نہ مجھے کوئی لمبی تقریر کرنی

ہے۔ میں تو تم سے صرف ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ الیکشن کے لیے ایک بورڈ مسلم لیگ نے قائم کیا ہے اس لیگ میں سر فیروز خان نون بھی ہیں۔ سر رضا علی بھی ہیں، سر ضیاء الدین بھی ہیں۔ راجہ محمود آباد بھی ہیں۔ نواب زادے لیاقت علی بھی ہیں۔ پیر جماعت علی شاہ بھی ہیں اور پیر گولڑہ بھی ہیں۔ غرض دنیا بھر کے سر اور سرکار پرست، پیر اور سجادے اور نوابزادے اور خانوادے اور مست قلندر اور راجہ اور مہاراجہ ہیں اور ایک طرف جمعیۃ علماء ہند کے علماء نے ایک الیکشن بورڈ بنایا ہے اس بورڈ میں ہمارے انصاری بھائی ہیں۔ کرشک پرجا پارٹی ہے اور دوسرے ہندوستان کے آزاد خیال مسلمان ہیں۔ جمعیۃ علماء کی خواہش یہ ہے کہ جمعیۃ علماء کے بورڈ کی طرف سے ایسے مسلمان منتخب کیے جائیں جو حکومت کے اقتدار سے جنگ کرنے والے ہوں۔ مذہب کا تحفظ چاہتے ہوں جو قانون بنائیں وہ مذہب کی روشنی میں جمعیۃ علماء کے مشورے سے بنائیں۔ اب مجھے بتاؤ اگر مسلم لیگ اور اس کے سرکاری حمایتی اور سرکاری ٹولی کامیاب ہوئی تو حکومت کو خوشی ہوگی یا رنج ہوگا (آوازیں آئیں حکومت کو خوشی ہوگی) اور اگر جمعیۃ علما اور آزاد خیال مسلمانوں کا بورڈ کامیاب ہوا تو حکومت کو مسرت ہوگی یا افسوس ہوگا (آوازیں۔ افسوس ہوگا) تو بس اب معاملہ صاف ہے۔ جو حکومت متسلطہ کو خوش کرنا چاہتا ہے اور حکومت کا طرف دار ہے وہ مسلم لیگ کی طرف چلا جائے اور جو حکومت کی خوشی سے بیزار ہے اور ملک کو آزاد کرانا چاہتا ہے اور علماء اسلام کا ساتھ دینا چاہتا ہے اور مذہب کی بقا کا حامی ہے وہ جمعیۃ علماء کے ساتھ آجائے۔

حسن اتفاق دیکھیے

کہ آج قاری صاحب نے قرآن کی آیت بھی وہی تلاوت کی جو ہمارے مقصد کو بالکل واضح کرتی، ارشاد ہوتا ہے، اے ایمان والو! تم خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ (۱) (یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصٰدقین (سورہ توبہ:۱۱۹)۔ اب تم ہی غور کرو کہ سچا کون ہے۔ کیا وہ اہل علم حق و صداقت کے پیکر ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تبلیغ کرتے ہیں یا وہ حضرات صداقت کے مجسمے ہیں جن کا نہ اعتقاد صحیح ہے اور نہ جن کی صورتیں اسلامی تہذیب

کے موافق ہیں۔ جو حضرات یورپین تہذیب کے دلدادہ ہیں جن کا کھانا، پینا، اُٹھنا، بیٹھنا، وضع قطع سب یورپین طرز کی ہے وہ قرآن کے نزدیک قابل اتباع ہیں یا وہ لوگ جن کی عمریں اسلام کی اور قرآن کی خدمت میں گزر گئی ہیں وہ سچے اور قابل اتباع ہیں؟ جنہوں نے ہمیشہ انگریزی قانون کی حمایت کی وہ خدا کے نزدیک قائد اور متبوع ہو سکتے ہیں یا وہ لوگ قائد ہونے کے اہل ہیں جن کی صورت اس تہذیب کے موافق ہے جو منزل من اللہ ہے۔ اسی رکوع میں آگے چل کر فرماتے ہیں وَلَا يَطَئُوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّار (ایضاً ۱۲۰)۔ تم کوئی قدم بھی ایسا اُٹھاؤ گے جو تمہارے دشمنوں کو غیظ و غضب میں مبتلا کرنے والا ہو تو اس قدم پر بھی تمہارے لیے نیک عمل لکھا جائے گا۔ تم نے ابھی اقرار کیا ہے کہ جمعیۃ علماء اور آزاد خیال لوگوں کی کامیابی حکومت متسلطہ کے لیے موجب پریشانی ہوگی اور اسی قسم کی پریشان کن کارروائی پر قرآن وعدہ کرتا ہے کہ تمہارے لیے عمل صالح لکھا جائے گا۔ پھر اس سے زیادہ اور بشارت کیا چاہتے ہو۔

پاکستان یا السٹر

میں اپنے لیگی دوستوں سے دریافت کرتا ہوں مجھے سچ بتاؤ کہ تم پاکستان چاہتے ہو یا ہندوستان میں السٹر کی بنیاد رکھنا چاہتے ہو؟

میرے عزیزو! اس پاکستان میں کیسی حکومت ہوگی؟ کیا ایسی حکومت ہوگی جیسی خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کیا کرتے تھے؟ اچھا خلفاء راشدین کو جانے دیجیے مسٹر جناح اور راجہ محمود آباد کی موجودگی میں تو خلفاء راشدین کا تصور اور ان کا نام لینا بھی گناہ ہے۔ بتاؤ کیا پاکستان میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز جیسی حکومت ہوگی؟ عمر بن عبدالعزیز کو بھی جانے دو کیا ویسی حکومت ہوگی جیسی ہارون الرشید کی تھی؟ ہارون رشید کو بھی چھوڑیئے پاکستان میں ویسی حکومت ہوگی جیسی شاہجہاں اور اورنگزیب حکومت کیا کرتے تھے؟ اگر شاہجہاں اور عالمگیر کی سی حکومت ہوگی اور تم اس کا ذمہ دارانہ اعلان کر دو تب بھی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہوگی اور میں تمہارے ساتھ مل کر ایسی حکومت قائم کرنے کی سعی کروں گا لیکن اگر وہ پاکستانی حکومت اسی انگریزی جمہوریت کی حکومت ہو اور وہ پاکستان گورنمنٹ

برطانیہ کی زیر سرپرستی قائم ہو اور اس میں پینتالیس یا چالیس ہندو اور سکھ شامل ہوں اور سر چھوٹو رام اور سر ٹیکا رام اور سیٹھ بھنجو رام کے ساتھ مل کر حکومت چلانی پڑے تو وہ پاکستان نہیں وہ تو السٹر ہوگا۔ ایسے گندے پاکستان کے لیے مسلمانوں کو کیوں تباہ کر رہے ہو اور تم کیوں مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہو اور تم نے کیوں نوجوانوں کو مغالطہ میں مبتلا کر رکھا ہے اور اس السٹر کے لیے کیوں علماء حق کی عزت و آبرو کے درپے ہوتے ہو۔ ایک موثر اقلیت کو لے کر اپنی حکومت کے دامنوں میں پرورش کرنا اور مسلمانوں کی تین کروڑ غیر مؤثر اقلیت کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا کیا تمہارے نزدیک مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس مسلم کش پالیسی کو جس میں تین کروڑ مسلمانوں کو تباہ کرنے کا اعلان کیا جا رہا ہے تم زبردستی تسلیم کرانا چاہتے ہو۔

جبر و اکراہ کی پالیسی

میرے عزیزو! تم نے یہ جبر و اکراہ کی پالیسی اختیار کی ہے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جبر و اکراہ سے کوئی بات منوائی جا سکتی ہے۔

ارے بھلے آدمیو! جبر و اکراہ سے حق تو منوایا ہی نہیں جا سکتا۔ بھلا باطل کیوں کر قبول کیا جا سکتا ہے۔ کہیں زبردستی گالیاں دے کر اور چاقو اور چھریاں دکھا کر باطل کو تسلیم کرایا جا سکتا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذَالِکَ اور کیا تم مسٹر جناح کے پاکستان کو کوئی وحی الٰہی یا قرآن کی آیت سمجھتے ہو کہ جو اس کے خلاف بولے وہ قابل گردن زدنی ہے۔ تم بھی ایک فارمولا پیش کر رہے ہو جمعیۃ علماء بھی ایک فارمولا پیش کرتی ہے۔ ہم تو دونوں یہ چاہتے ہیں کہ آزاد ہندوستان میں مسلمان نقصان سے محفوظ رہیں اور ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر نہ کریں۔

اسی مقصد کے پیش نظر آپ کی وہ تجویز ہے جو آپ نے لاہور میں پاس کی ہے۔ جس کا نام اب "پاکستان تجویز" ہو گیا ہے اور اسی مقصد کے پیش نظر جمعیۃ علما نے ایک تجویز لاہور میں پاس کی ہے اور پھر اس کی مزید تشریح دہلی میں اس کی مجلس عاملہ نے کی ہے۔ جس کا نام صوبوں میں حق خود ارادیت اور مرکز میں مساوات ہو گیا ہے۔ یہ دو تجویزیں آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی حفاظت کے لیے پیش ہیں۔ ایک مسلم لیگ کی ہے اور ایک جمعیۃ علماء کی ہے۔ ہم

کو جو جناب کی تجویز پر اعتراض ہے وہ ہم نے بارہا کہہ دیا ہے۔ ہم مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ جس میں تین کروڑ مسلمانوں کو قربانی کا بکرا بنایا جائے اور ان کو ایک غیر مؤثر اقلیت بنا کر ہندوؤں کی بھاری اکثریت کے سپرد کر دیا جائے اور مسلمانوں کو سب طرف سے سمیٹ کر براعظم کے ایک گوشہ میں ڈال دیا جائے اور اس حیثیت سے ڈالا جائے کہ وہ ایک مؤثر اقلیت کے ساتھ جس کی تعداد چالیس یا اس سے کچھ کم و بیش ہو مل کر حکومت کریں۔ میرے عزیزو! اگر تم اس قسم کا پاکستان مسلمانوں کے لیے مفید سمجھتے ہو تو مجھے کیوں نہیں سمجھاتے آخر۔

کیا یہ کوئی تمہارا گھریلو معاملہ ہے!

میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا پاکستان کا معاملہ تمہارا کوئی گھریلو معاملہ ہے؟ جس میں کسی دوسرے کو بولنے کا حق نہیں ہے۔ آخر آٹھ یا نو کروڑ مسلمانوں کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ انگریزوں کو اس ملک سے نکال کر مسلمانوں کے آزاد زندگی بسر کرنے کا معاملہ ہے۔ اس طریقہ کا پاکستان جس طریقہ کا تم بنانا چاہتے ہو ہم تو دو ہی مطلب سمجھتے ہیں یا تو تم کو مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور یا تم انگریزوں کو اس ملک سے نکالنا نہیں چاہتے۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ جمعیۃ اور لیگ کی تجویزوں کو قرآن کی آیتیں نہ سمجھو بلکہ آپس میں مل کر اور سب سر جوڑ کر غور و فکر کرو کہ کون سی راہ مسلمانوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ صرف مولوی ہی پاکستان کے مخالف نہیں ہیں بلکہ بے شمار آزاد خیال اور تعلیم یافتہ مسلمان علماء کی تجویز کے حامی اور پاکستان کے خلاف ہیں۔ آخر پاکستان میں کوئی تو ایسی خرابی ہے جس سے مسلمانوں کا مذہبی اور روشن خیال طبقہ مطمئن نہیں ہوتا۔ اگر غور سے دیکھو تو تمہارے ساتھ یا تو سرکار پرست اور کاسہ لیسان ازلی کی کثرت ہے اور یا پھر کمیونسٹوں اور لامذہبوں کی چہل پہل ہے۔ ان کے علاوہ جناب کے پاکستان کو کون سپورٹ کر رہا ہے۔ سرکار پرستوں کی خواہش یہ ہے کہ گورنمنٹ کے ہاتھ سے ملک نہ نکلنے پائے اور کمیونسٹوں کی تمنا یہ ہے کہ کسی طرح ملک میں روسی نظام جاری ہو جائے اور مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اسلام کے نام پر کمیونزم کو ترقی دی جائے۔ یہی وہ

جذبات ہیں جو آپ کی مسلم لیگ میں نمایاں اور اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر یہ باتیں نہیں ہیں جو میں نے عرض کیں تو پھر آخر یہ شور و ہنگامہ کیا ہے؟ اور علماء اُمت کی یہ توہین و تذلیل کیوں ہے؟ علماء اُمت سے اس قدر نفرت کیوں ہے؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم مسلمانوں کے دشمن ہیں؟ کیا ہم اسلام کے بدخواہ ہیں؟ جس اسلام کے نام پر ہم کو روٹی ملتی ہے کیا ہم اس کو ہندوستان سے مٹانا چاہتے ہیں؟ کیا معاذ اللہ ہم اُمت ابراہیمی کو کفر کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اگر حاکم بدہن اس ملک سے علما کو اور علماء کے وقار کو ختم کر دیا گیا تو اس ملک میں مذہب کا کیا حال ہوگا؟ جس ملک کے مسلمانوں کی مذہبی حالت تمام دنیا کے مسلمانوں سے بہتر ہے تم ان ہی مسلمانوں کو ختم کرنا چاہتے ہو؟ اگر تمہارا یہ مقصد نہیں ہے اور تم اسلام کے دشمن نہیں ہو تو تم مذہب کے نام لیواؤں کے ساتھ یہ کافرانہ سلوک کیوں کر رہے ہو۔ جلسوں میں شور کرنا علماء پر قاتلانہ حملے کرنا، غل مچا کر اور لاٹھیاں چلا کر جلسوں کو درہم برہم کرنا کیا یہ مسلمانوں کا شیوہ ہے یا کافروں کا؟ یہ طریقہ تو ابوجہل اور ولید بن مغیرہ کا ہے، یہ طریقہ صدیق اکبرؓ اور بلالؓ کا نہیں ہے۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے؟ کیا تم علماء حق کی توہین و تذلیل کر کے اسلام اور مسلمانوں کی کوئی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہو۔ کیا ہندوستان کے تمام مسلمان یا ننانوے فیصدی مسلمان اسی خیال کے ہیں کہ مذہب اور اہل مذہب کی توہین کی جائے اور جلسوں میں اسی طرح شور مچایا جائے جس طرح کفار مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں غل مچایا کرتے تھے یا جس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تقریر میں خارجی شور مچایا کرتے تھے۔ کیوں کہ آپ کی جماعت تو نو کروڑ مسلمانوں کی نمایندہ ہے یا کم از کم ننانوے فیصدی کی نمائندہ ہے۔ تو گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ تمام مسلمان ہی مذہب اور اہل مذہب کے دشمن ہو گئے۔ آپ کی نمایندگی بھی خوب ہے۔ جمعیۃ علماء آپ کے ساتھ نہیں اور احراری آپ کے ساتھ نہیں، خاکساری آپ کے ساتھ نہیں، یونینسٹ آپ کے ساتھ نہیں، خدائی خدمتگار آپ کے ساتھ نہیں، شیعہ من حیث الجماعت آپ کے ساتھ نہیں۔ انصاری آپ کے ساتھ نہیں۔ انڈی پنڈنٹ اور امارت شرعیہ بہار آپ کے ساتھ نہیں، کرشک پرجا پارٹی آپ کے ساتھ نہیں۔ آل انڈیا مسلم مجلس آپ کے ساتھ نہیں۔ مگر آپ تمام ہندوستان کے واحد نمائندہ

ہیں۔ الیکشن میں ہر سیٹ پر آپ کا مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ مگر آپ ہیں تمام مسلمانوں کے واحد نمایندے۔ سبحان اللہ! کیا واحد نمایندگی ہے۔ قربان جایئے اس واحد نمایندگی کے۔

مسلم لیگ سے صلح

میں ابھی عرض کر رہا تھا کہ مجھ سے بڑھ کر کون صلح کا حامی ہوسکتا ہے۔ اگر مسٹر جناح کی جگہ کوئی اور معاملہ فہم اور حق شناس اور مسلمانوں کا ہمدرد صدر ہوتا تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اب تک کبھی کی صلح ہو چکی ہوتی اور اب بھی اگر تم مسلمانوں کو متفق کرنا چاہتے ہو تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔ جس طرح سر آغا خاں نے ایک آل پارٹیز کانفرنس کی تھی اسی طرح مسٹر جناح ایک آل پارٹیز کانفرنس مدعو کریں اور سب جماعتوں کے افراد ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اگر ایسا ہو تو کیا سمجھتے ہو کہ باہمی اتحاد نہیں ہوسکتا۔ تم کو جب تک واحد نمایندگی کے خواب پریشاں سے نجات نہیں ملے گی یاد رکھو کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ یہ پالیسی کہ سب کو ختم کر دو بس ہمیں ہم ہیں اور دنیا میں باقی سب بیوقوف ہیں یہ پالیسی تمہارے لیڈر کی کوئی کامیاب پالیسی نہیں ہے۔ تمام دنیا کے سرکاری اور ناپاک روحوں کو تم گلے لگا سکتے ہو لیکن تم سے مولانا سیّد حسین احمد اور مولانا مفتی کفایت اللہ جیسے مقدس لوگ برداشت نہیں ہو سکتے۔ اگر تمہارے دل میں واقعی مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کی تڑپ ہے تو تم ایک آل پارٹیز (کانفرنس) فوراً مدعو کرو تمہاری بھی عجیب حالت ہے۔ جب سر آغا خاں آل پارٹیز مدعو کریں تو مسٹر جناح اس کا بائیکاٹ کر دیں اور جب مسٹر جناح سے کہا جائے کہ تم آل پارٹیز بلا کر سب سے گفتگو کرو تو فرمائیں پہلے پاکستان کو مان کر مسلم لیگ میں آ جاؤ بعد میں بات کروں گا۔ سبحان اللہ! جناب کے لیڈر کی بھی کیا شان ہے۔

عذر آنے میں بھی ہے اور بلاتے بھی نہیں!

کوئی بلائے تو آئیں نہیں اور جب انسے بلانے کو کہا جائے تو کہیں لیگ کے جھنڈے تلے آ جاؤ اور وہ پاکستان جو شرمندہ معنی نہیں ہوا اور صرف مسٹر جناح کے دماغ کی پیداوار ہے۔ اس کو تسلیم کر لو تب ہم تم کو بلائیں گے اور بات کریں گے اور جب ایک خط کے بعد کوئی

دوسرا خط بھیجے تو کہہ دو کہ میں جو کچھ پہلے خط میں کہہ چکا ہوں اس سے زائد نہیں کہنا چاہتا۔ تم تو دوسروں کو دعوت دیتے پھرتے اور مجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ اگر یہی لیل و نہار رہے اور تمہارے لیڈر کے دماغی توازن کی یہی کیفیت رہی تو اس الیکشن کے بعد چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خان اور نواب زادے لیاقت علی خان بھی اس سے اسی طرح نکل جائیں گے۔ جس طرح حضرت ظفر الملۃ والدین مولانا ظفر علی خاں اس سے نکل گئے اور اتحادِ ملت کا نیلگوں جھنڈا لے کر گشت کرتے پھرتے ہیں یا اگر کوئی شریف آدمی اپنی وضعداری کو رہ بھی گیا تو اس کا حشر وہی ہوگا جو مولانا حسرت موہانی کا ہو رہا ہے۔

ہندوؤں سے ملنے کا طعنہ

عام طور سے یہ کہا جا رہا ہے کہ مولوی مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ کر ہندوؤں کی جماعت سے مل گئے ہیں۔ یہ کس قدر غلط تعبیر اور غیر ذمہ دارانہ بات ہے۔ کیا تم ان الفاظ کے ادا کرنے میں صادق القول ہو۔ کیا تم یہ ایمانداری کے ساتھ کہتے ہو۔ سیدھی بات تو یہ ہے کہ مولوی سرکار پرستوں اور گورنمنٹ کے وفاداروں سے کنارہ کش ہو کر حکومت کا اقتدار مضمحل کرنے کی غرض سے نیشنلسٹ ہندو اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی مشترکہ جماعت کا ساتھ دے رہے ہیں۔ جس طرح ۱۹۱۴ء میں خلیفۃ المسلمین نے قیصر جرمنی کا ساتھ دیا تھا اور جس طرح اب بھی مسلم لیگی وزارتیں ہندوؤں سے مل کر وزارتیں چلا رہی ہیں اور جس طرح آپ کے صوبہ یوپی میں بہت سی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں ہندو اکثریت کے باوجود مسلمان ہندوؤں سے ملے ہوئے کام کر رہے ہیں۔ کچھ ہندو مسلمان وہ ہیں جو باہم مل کر حکومت کی مشنری چلا رہے ہیں اور کچھ ہندو مسلمان وہ ہیں جو کانگریس کے پلیٹ فارم پر مل کر حکومت کے اقتدار سے جنگ کر رہے ہیں۔ اگر وہ مسلمان کافر ہیں تو یہ مسلمان بھی کافر ہیں اور اگر ٹیکا رام جھنجو رام والے مسلمان مسلمان ہیں تو جواہر لال سے مل کر کام کرنے والے مسلمان بھی مسلمان ہیں۔ غضب خدا کا کونسلوں میں ہندوؤں سے مل کر کام کرو تو مسلمان۔ اسمبلی میں جا کر ہندوؤں سے مل جاؤ تو مسلمان۔ میونسپلٹیوں میں ہندوؤں کے دوش بدوش بیٹھ کر کام کرو تو مسلمان، ڈسٹرکٹ

بورڈوں میں ہندو اکثریت کے ساتھ بیٹھ کر کام کرو تو مسلمان، وائسرائے کی ایگزیکٹوکونسل میں مسٹر...... کے ساتھ مل کر کام کرو تو مسلمان، وائسرائے کے ڈنر میں ہندو کے ساتھ مل کر ایک میز پر کھانا کھاؤ تو مسلمان، ہندوؤں اور گورکھوں کے ساتھ مل کر انگریزی اقتدار پر میدانِ جنگ میں قربان ہو جاؤ تو مسلمان، ہندوؤں سے مل مل کر سپلائی کے ٹھیکے لو تو مسلمان، ہندوؤں سے مل کر چھوٹی چھوٹی یونین بناؤ تو مسلمان، کرانہ یونین، کلاتھ یونین، غلہ یونین، ہوزری یونین، سوداگروں کی یونین، غرض ہر یونین میں ہندوؤں کے ساتھ مل جاؤ تو تم مسلمان ہی رہو، راشن یونین میں ہندوؤں سے مل جاؤ تب بھی مسلمان لیکن اگر کوئی خوش قسمت مسلمان کانگریس یونین میں شریک ہو جائے تو اسی وقت اس پر کفر کا حکم لگا دو۔ تِلْکَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (سورہ نجم ۲۲)۔ سیدھی بات کہو کہ تم اصل میں انگریز سے جنگ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ بلکہ انگریزی اقتدار کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ تم ہیر پھیر کے بات کیوں کہتے ہو۔ صاف کہو نا کہ ہم انگریز سے جنگ کرنے پر آمادہ نہیں ہیں جو انگریزی اقتدار سے جنگ کرنے کی غرض سے ہندو کا ساتھ دے گا ہم اُسے کافر کہیں گے۔ تم بھی جانتے ہو کہ ہم کسی لالچ یا ذاتی منافع کی غرض سے ہندو کے ساتھ نہیں ہیں۔ نہ ہمیں ہندو سے کوئی رشتہ داری کرنی ہے نہ ہم کفر کی تہذیب کو پسند کرتے ہیں بلکہ تم جس طرح اسے کافر سمجھتے ہو اسی طرح ہم بھی اُسے کافر اور بت پرست سمجھتے ہیں اور ہمیں تم سے بھی کوئی دشمنی نہیں بلکہ ہم تم کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں، تم سے ہم علیحدہ اس لیے نہیں ہیں کہ تم کافر ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت متسلطہ کے اقتدار کو مضمحل کرنا میرا ایمان ہے۔ میں ہندو سے اس لیے اشتراک عمل کر رہا ہوں کہ وہ میرے مقصد کی تکمیل کر رہا ہے یا کم از کم میرا مقصد پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور تم سے اس لیے بیزار ہوں کہ تم بلا واسطہ یا بالواسطہ، قصداً یا بلا قصد، دانستہ یا نادانستہ انگریزی اقتدار کو اس ملک میں مضبوط کر رہے ہو۔ خدا شاہد ہے کہ میں نے ہندو سے اس کے کفر کی وجہ سے اشتراک عمل نہیں کیا ہے اور نہ تم سے تمہارے اسلام کی وجہ سے ناراض ہوں۔ بلکہ ہندو سے اس لیے اشتراک عمل کرتا ہوں کہ وہ حکومت کے اقتدار کا مخالف ہے اور تم سے اس لیے بیزار ہوں کہ تم حکومت کے اقتدار کے حامی ہو۔ اس میں کفر اور اسلام کی بحث کیا ہے۔ تم ایسی غلط بات کیوں

کہتے ہو جس دن تم کو خدا تعالیٰ اس قابل کردے گا اور تم انگریزی اقتدار کے ختم کرنے کی غرض سے میدان میں آؤ گے تو میں انشاء اللہ تمہاری فوج کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں گا۔

آخر کلام

بہرحال باتیں بہت سی عرض کرنی تھیں لیکن ایک طرف میری طویل علالت اور دوسری طرف میری خانہ نشینی۔ نہ اب میں کوئی سفر کرتا ہوں نہ کہیں تقریر کرتا ہوں یہ مختصر سی تقریر بھی میں نے یہاں کی جمعیۃ علماء کے بعض ارکان کی فرمائش پر کردی۔ میں تو آج کل قرآن شریف کا ترجمہ اور ایک مختصر تفسیر لکھنے میں (مصروف) ہوں۔ الحمدللہ ترجمہ پورا ہوگیا ہے۔ اب صرف نظر ثانی اور مختصر تفسیر لکھنی باقی ہے۔ میں آپ سے چلتے وقت صرف اتنا ہی عرض کرجاتا ہوں کہ آئندہ الیکشن میں جمعیۃ کی بات نیچی نہ ہونے پائے۔ اگر تم کو اسلام سے محبت ہے اور تم مذہب اور اہل مذہب سے اُلفت رکھتے ہو تو تم کو علماء حق کا ساتھ دینا چاہیے۔ میں نے بات صاف کردی ہے تم کو غلط اور جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہونا چاہیے بلکہ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔ بشرطیکہ تم نے اس کے دین کی مدد کی۔

اس وقت بدقسمتی سے موجودہ الیکشن نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ دین کی عزت اور اسلام کی آبرو کا سوال پیدا ہوگیا ہے۔ ایک طرف لادینی اور دین کے مٹانے کا حال آپ کے سامنے ہے جو کچھ ہو رہا ہے اور علماء کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے وہ جناب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔

ہر طرف کفر است جوشاں ہم چو افواجِ یزید
دین حق بیمار و بے کس ہم چو زین العابدین

اگر مسٹر جناح سرکار پرستوں اور ناسمجھ طالب علموں اور کمیونسٹ نوجوانوں کی ہمت افزائی نہ کرتے تو شاید یہ نوبت نہ آتی لیکن انھوں نے خود ایسی فضا پیدا کردی جو دین حق کے لیے سخت خطرناک ہے اور اب مجھے دیکھنا ہے کہ مسلمان حق کی طرف جاتے ہیں یا باطل کی طرف۔

ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے۔ پروپیگنڈے کی طاقت بھی نہیں ہے۔ سرکاری اثر و رسوخ

سے بھی ہم تہی دست ہیں۔ہاں صرف دین حق اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت گذار ہیں۔اسی کے نام پر مسلمانوں کو بلاتے ہیں اور اسی کی دعوت دیتے ہیں اور ہمارا تجربہ ہے کہ جب کبھی مسلمانوں کو خدا اور اس کے رسول کا نام لے کر بلایا ہے تو وہ والہانہ اور عاشقانہ اور دیوانہ وار بڑھے ہیں۔یہ دعوت اور پکار صرف میری نہ سمجھو بلکہ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ یہی پکار عرب لیگ کی ہے اور یہی پکار فلسطین کے شہیدوں کی ہے جو کچھ میں تم سے سہارنپور کے مسلمانو کہہ رہا ہوں یہ الجیریا اور جاوا کے مسلمانوں کی آواز ہے۔جو میں جناب سے درخواست کرر ہا ہوں۔یہ درخواست صرف میری درخواست نہیں ہے بلکہ تمام عالم اسلام کی اس وقت یہی درخواست ہے۔دنیا کے ہر مظلوم مسلمان کی آنکھیں صرف آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔اگر آپ نے اس وقت مذہب اور اہل مذہب کا ساتھ دیا تو یقین مانو! تم سے خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوں گے اور اگر اس وقت تم نے مذہب کے بچاؤ اور تحفظ کی کوشش نہ کی تو تم قیامت میں جوابدہ ہو گے۔

میں نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا۔میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔کاش میری صحت مجھے موقع دیتی تو میں آپ کی مزید خدمت انجام دے سکتا۔مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے اپنی دعاؤں میں فراموش نہ کریں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

خطبۂ صدارت

سحبان الہند حضرت مولانا حافظ احمد سعید دہلوی
کمشنری میرٹھ کی جمعیت علماء کانفرنس میں

مورخہ

۶/۷ ربیع الاوّل ۱۳۶۵ھ مطابق ۹/۱۰ فروری ۱۹۴۶ء کو

بمقام

شہر میرٹھ (صوبہ متحدہ)

پیش کیا

مطبوعہ

ہمدرد پریس۔ دہلی

۱۹۴۶ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ

برادرانِ اسلام! اس پرآشوب و پرفتن دور میں آپ کا ایک سیاسی کانفرنس کی صدارت کے لیے مجھ جیسے کم علم، کم زور اور بیمار آدمی کو منتخب کرنا ایک ایسا پراسرار اور معمہ بردوش فیصلہ ہے جس کو کم از کم میں تو سمجھنے سے قاصر اور عاجز ہوں۔

غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ میں صدر بننے اور صدارت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا اہل نہیں ہوں اور اسی لیے میں تمام عمر اس سے بچتا رہا۔ اگر کبھی احباب نے کسی کانفرنس یا کسی مجلس کی صدارت کے لیے مجبور کر دیا تو بادل ناخواستہ اس کو قبول کر لیا۔

بہرحال اس انتخاب صدارت کی مصلحت تو آپ خود ہی سمجھتے ہوں گے۔ اب آپ نے جب یہ بوجھ میرے کاندھوں پر باوجود میرے انکار کے رکھ ہی دیا ہے تو آپ کو میرے ساتھ پورا تعاون کرنا چاہیے اور تا اختتام کانفرنس میری پوری مدد کرنی چاہیے۔ میں حضرت حق جل مجدہ کی خدمت میں نہایت عاجزانہ التجا کرتا ہوں:

رَبِّ اَعِنِّیۡ وَلَا تُعِنۡ عَلَیَّ وَانۡصُرۡنِیۡ وَلَا تَنۡصُرۡ عَلَیَّ وَامۡکُرۡلِیۡ وَلَا تَمۡکُرۡ عَلَیَّ رَبِّ یَسِّرۡلِیۡ وَلَا تُعَسِّرۡ عَلَیَّ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ

معزز حاضرین! اس انتخاب صدارت کے سلسلے میں خواہ میری ذاتی رائے کچھ بھی ہو لیکن بہرحال میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس رسمی اور آئینی شکریہ کے بعد مجھے جس امر کی جانب آپ کو توجہ دلانی ہے وہ یہ ہے کہ صوبجاتی انتخابات کا زمانہ قریب آ لگا ہے اور ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ماتحت صوبوں کا یہ دوسرا الیکشن ہے۔ ہر چند کہ انتخاب کی عمر قانون میں پانچ سال رکھی گئی ہے لیکن جنگ عظیم بلکہ اعظم کی وجہ سے انتخابات تاخیر سے ہو رہے ہیں اور لوگوں کی دیرینہ تمنائیں اور فرسودہ حسرتیں بہت دیر سے پوری ہو رہی ہیں۔

میرے معزز دوستو! آپ جانتے ہیں کہ یورپ کی ملعون جمہوریت اور منحوس طرز حکومت

کی یہ الیکشن پیداوار ہیں اور جب ان الیکشنوں کا زمانہ قریب آتا ہے خواہ وہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے الیکشن ہوں، یا صوبجاتی اسمبلی کے ہوں، یا مرکزی اسمبلی کے ہوں تو اس وقت رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے عجیب عجیب حرکتیں کی جاتی ہیں نئی نئی جماعتیں رونما ہوتی ہیں اور قوم کی خدمات کے نئے نئے طریقوں کا اعلان ہوتا ہے۔ غرض ہر ایک کنڈیڈیٹ اپنی خوبیاں بیان کرتا ہے اور اپنے مخالف کی برائی اور کمزوری ظاہر کرنے میں ذرا رواداری اور ہمدردی سے کام نہیں لیتا۔ ہر ان ہوئی اور ناممکن بات کی اُمید دلاتا ہے اور دوسرے کی بڑی سے بڑی خدمت کو بے حقیقت اور لغو قرار دیتا ہے۔ بہتر سے بہتر تحریک کو احمقانہ کہتا ہے اور بدتر سے بدتر تحریک کو سراہتا ہے۔ ان انتخابات کے موقعہ پر شیعہ سنی سوال بھی زندہ کیا جاتا ہے۔ برادری غیر برادری کی بحثیں بھی ہوتی ہیں۔ حنفی اور اہل حدیث، بدعتی اور وہابی کی شخصیتوں پر بھی طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ ہندو مسلمان کے فرقہ وارانہ سوال کو بھی ہوا دی جاتی ہے۔ گائے کی قربانی اور گئو ہتھیا کا چرچا بھی ہوتا ہے۔ ہندی اُردو کو بھی تختۂ مشق بنایا جاتا ہے اور آپ کے صوبہ میں کاشتکار اور زمیندار کے حقوق و مفاد پر بھی خوب گرما گرم بحثیں ہوتی ہیں۔ سرمایہ دار اور مزدور کے تذکرے بھی خوب ہوتے ہیں اور اسلام کو بچاؤ اور اسلام خطرے میں ہے اور دس کروڑ فرزندان توحید کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے، یہ تو وہ الفاظ ہیں جو ہر مقرر کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور ہر سننے والے کے کان ان پر فریب آوازوں سے گونج رہے ہیں۔ غرض ہر قسم کی فرقہ پرستی کا دل کھول کر مظاہرہ کیا جاتا ہے اور جس طرح ان سب مکروہات ولایعنی باتوں کا اظہار کیا جاتا ہے اسی طرح ہر ذی اثر آدمی کے اثر کو بھی استعمال کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ ہر گوشہ نشین پیر اور مولوی کو اس الیکشن کی بدولت اس کے گوشۂ عافیت سے گھسیٹ لایا جاتا ہے اور اس غریب سے اپنی من مانی باتیں کہلوائی جاتی ہیں اور پھر اپنے مخالف سے کہا جاتا ہے، فلاں بزرگ بھی ہمارے ساتھ ہیں اور فلاں سجادے صاحب بھی ہمارے ہی ہم نوا ہیں اور دیکھئے فلاں عالم بھی ہماری ہی سی کہہ رہا ہے۔

اس قدر تائید اور اتنی بڑی اکثریت کے بعد آپ کے پاس کون سی حجت ہے کہ آپ ہمارے کنڈیڈیٹ کا ساتھ نہ دیں اور ہمارے غول بیابانی کے ہمراہ نہ ہوں۔

غرض تقریباً ۳۰ سال سے ہم اس الیکشن گردی کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور اس تمام عارضی کشمکش اور ہڑبونگ کا آخر میں جو نتیجہ نکلتا ہے اس کو بھی ہم عبرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں ہمارا ہر قدم اور ہماری ہر سعی اور ہماری تمام دوڑ دھوپ اور ہمارے تمام انتخابات کا فائدہ ہمیں کچھ پہنچے یا نہ پہنچے مگر حکومت متسلطہ کے اقتدار کو اس سے ضرور فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ ہمارے بہترین مقرر خواہ کیسی ہی اسلامی چادریں اوڑھ کر آئیں اور حدیث وفقہ کی کتنی ہی موشگافیاں کرتے ہوئے مسلمانوں کے مفاد پر تقریریں کریں لیکن وہ سب تقریریں بدقسمتی سے نتیجہ کے اعتبار سے انگریزوں ہی کے لیے مفید اور سودمند ہوتی ہیں۔ گویا ان کی ہر تقریر کا ہر جملہ مسلمانوں کے لیے مفید ہونے کی بجائے انگریزوں ہی کے حق میں مفید ہوتا ہے۔ خواہ ان کی نیت کتنی ہی بخیر ہو۔ اکبر مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے:

اُنہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں   زبان میری ہے، بات ان کی
اُنہی کی محفل سنوارتا ہوں   چراغ میرا ہے، رات ان کی
سنے جو اس کو اُسے تردد   جو اس کو دیکھے، اُسے تحیر
ہماری نیکی اور ان کو برکت   عمل ہمارا، نجات اُن کی

اور یہ بات تو بالکل ہی ظاہر ہے کہ جس قدر کوئی مقرر اپنی تقریر میں فرقہ وارانہ جذبات کو اُچھالے گا اور کفر واسلام کا نام لے کر ووٹروں سے اپیل کرے گا اور اپنی خطابت کا تمام زور ہندو مسلمانوں کی منافرت پر خرچ کر دے گا۔ اُسی قدر وہ حکومت متسلطہ کی بنیادوں کو سیسہ پلائے گا۔ خواہ اس کو اپنی سادہ لوحی سے اس کا احساس ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ مقرر کوئی گورنمنٹ کا پیشہ ور نمک خوار عالم ہو یا کوئی نیک اور سادہ لوح بزرگ ہو جو کسی وجہ سے شیطان کے فتنہ میں مبتلا ہو گیا ہو۔

موجودہ دور کے الیکشن

حضرات! جب سے یورپین جمہوریت کا دور اس بدقسمت ملک میں جاری ہوا اور انتخابات کا سلسلہ شروع ہوا تو ابتدا میں الیکشن کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی لیکن جس قدر بیداری

بڑھتی گئی اور نیم سرکاری اداروں کے اختیارات بڑھتے گئے اسی قدر الیکشن کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ شروع شروع میں تو یہ کام صرف حکومت کی پارٹی کے ہاتھ میں رہا۔ ووٹروں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ الیکشن کب ہوا اور کون ممبر بن گیا۔ گورنمنٹ برطانیہ ایک طرف تو آہستہ آہستہ ہندوستانیوں کی طرف اختیارات منتقل کرتی رہی اور دوسری طرف اپنے کنٹرول کو قائم رکھنے کی غرض سے مختلف تدبیروں اور سازشوں کا جال پھیلاتی رہی اور ہندوستانی قوموں کے مابین نفرت اور باہمی تصدیق کا بیج بوتی رہی جب کبھی کوئی اسکیم انگلستان سے ڈھل کر آئی تو وہ اپنے ہمراہ ایک نئے فتنہ کا سامان لے کر آئی اور آج ہر سمجھدار آدمی کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی بدقسمتی کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا منحوس دن وہ تھا جس دن مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب تجویز کیا گیا۔ ایک طرف تقسیم بنگال کی تنسیخ پر قلم پھیر کر ہندوؤں کو خوش کیا گیا اور دوسری طرف بھولے بھالے مسلمان کو یہ اشارہ کیا گیا کہ تم اپنا وفد شملہ لے کر آؤ اور ہم سے جداگانہ انتخاب طلب کرو۔ چنانچہ دعا گوؤں کا ایک وفد بارگاہ حکومت میں حاضر ہوا اور اپنی پولیٹکل اہمیت کو تسلیم کرا کے چلا آیا اور جداگانہ انتخاب کی لعنت گلے میں ڈال دی گئی۔ بھلا وہ درخواست کیوں قبول نہ ہوتی جس کا مسودہ خود گورنمنٹ ہی نے مرتب کیا تھا۔

میرے عزیزو! وہ دن ہے اور آج کا دن اس انتخاب کی تفریق نے جو جو گل کھلائے وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ جب گورنمنٹ مسلمانوں کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کر چکی تو اس نے سکھوں کو مخصوص نشستیں عطا کیں، پھر مرہٹوں پر توجہ کی گئی اور آخر میں اچھوتوں کے سر پر ہاتھ رکھا گیا۔ غرض اس ملک میں انگریز اپنے مفاد کے لیے تفریق اور منافرت کے بیج بوتا چلا جاتا ہے۔ ہندو چونکہ سمجھدار ہے وہ تو حکومت کی ان سازشوں کا کم وبیش کچھ مقابلہ کر لیتا ہے اور ہم چوں کہ اتنے سمجھدار نہیں ہیں اس لیے گورنمنٹ کی ان خفیہ سازشوں کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہم میں کبھی مسلم کانفرنس بنتی ہے، کبھی جناح لیگ اور شفیع لیگ کی تقسیم ہوتی ہے۔ کبھی خود مسلم لیگ ہی میں سرکاری آدمیوں کو داخل کر دیا جاتا ہے۔ پھر مسلم لیگ کچھ سرسبز نہیں ہوتی معلوم ہوتی تو ''جمعیۃ علماء اسلام'' کے نام سے فوراً ایک جماعت بنا لی جاتی ہے اور

پاکستان کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے اور دو قوموں کی تھیوری پر زور دیا جاتا ہے اور اس مطالبہ کو کچھ ایسا رنگ دیا جاتا ہے کہ اچھے اچھے ذی فہم عالم بھی مخلصین اور مجاہدین کی برگزیدہ جماعت سے کٹ کر بزدلوں، نامردوں، بد دینوں، بے عملوں اور کاسہ لیسان ازلی کی ٹولی میں جا داخل ہوتے ہیں اور دشمنانِ دین کی محفل میں "نقل محفل" کا کام دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ملت ابراہیمی کی کوئی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اور یہ کیوں ہو رہا ہے محض اس لیے کہ باطل نے اس مرتبہ "اسلامی حکومت" اور "حکومت مستقلہ" کی وہ خوش نما چادر اوڑھ کر لوگوں کو مسحور کیا ہے کہ بڑے بڑے ناتجربہ کار عالم بھی اپنے ہوش و خرد کو ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں۔

میرے عزیزو! اس موجودہ دور الیکشن میں جو چیز مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط کر دی گئی ہے۔ وہ ایک تو یہی کہ جس کو عوام کی اصطلاح میں پاکستان کہا جاتا ہے اور دوسرے دو قوموں کا مسئلہ۔ اصل یہی دو چیزیں ہیں جن کو اُلٹ پلٹ کر بار بار مختلف عنوانات سے کہا جا رہا ہے اور ایسے ایسے خوشنما انداز میں کہا جا رہا ہے کہ اُس سے مسلمانوں کے عوام اور خواص برابر متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ان مباحث کو اس طرح منظر عام پر لایا جا رہا ہے کہ ہندو مسلمانوں میں منافرت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے اور یہ تمام کھیل اس لیے کھیلا جا رہا ہے کہ کسی طرح وہ مسلمان اسمبلیوں میں نہ چلے جائیں جو ہندوؤں سے مل کر انگریزی اقتدار کے لیے مصیبت بن جائیں۔ وہ مسلمان جنہوں نے قید و بند کے مصائب برداشت کیے جنہوں نے آزادی وطن کے لیے ہر قسم کی تکالیف برداشت کیں اور بڑی بڑی سختیاں اُٹھائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مسلمان کامیاب ہو جائیں اور اسمبلیوں میں جا کر کسی معاملہ پر حکومت برطانیہ سے برسر پیکار ہو جائیں اور ملک میں کوئی اور جھگڑا شروع کر دیں۔

سستی اور معصوم شہرت

آج کل جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ سب اسی ایک منحوس جذبہ کے ماتحت کیا جا رہا ہے، خواہ اس کو پاکستان کا نام لے کر کیا جائے یا اس کا کوئی اور نام رکھ لیا جائے اور خواہ اس قسم کی تحریکات

سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہو یا نہ پہنچتا ہو لیکن انگریزی اقتدار کو کسی طرح ٹھیس نہ لگتی ہو۔ ورنہ آپ ہی فرمایئے آخر اس کا کیا مطلب ہے کہ جو ''بزرگ'' مسلمانوں کی کسی مصیبت اور تکلیف کے وقت کام آنے والے نہیں تھے اور جو تحریک خلافت بلکہ ''مچھلی بازار کان پور کی مسجد'' سے لے کر آج تک ہمیشہ حزم واحتیاط سے کام لیتے رہے۔ وہ آج سب کے سب اپنی خانقاہوں اور عبادت خانوں سے نکل نکل کر پاکستان کا نعرہ کیوں لگا رہے ہیں اور بڑے بڑے عالم جو ہمیشہ ''شیطان اخرس'' بنے رہے آج ان کی زبانیں یکا یک کیسے کھل گئیں۔ انگریز کے خلاف جن کو لب کشائی کی آج تک کبھی ہمت نہ ہوئی اُمت اسلامیہ پر بڑے بڑے الم انگیز مصائب آئے، خود ہندوستان کے مسلمانوں پر بڑی بڑی آفتیں نازل ہوئیں لیکن نہ تو ان پر کبھی حق منکشف ہوا اور نہ ان کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ حق نکلا۔ یہ اُمت کے کھیون ہار ہمیشہ اپنے ذکر وشغل اور درس وتدریس میں مشغول رہے لیکن آج کونے کونے کے سجادے اور خان وادے اور گوشہ گوشہ کے ''خانہ نشین'' اور قریب المرگ عالم پاکستانی ڈرامہ میں جمع ہو کر ایک ہی اسٹیج پر اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ خدارا آخر سوچو تو یہ کیا بات ہے اور اسلام پر آخر کون سا ایسا وقت آپڑا ہے۔ جس نے ہمدردان اسلام کو بے چین اور مضطرب کر دیا ہے اور یہ گوشہ گم نامی اور گوشہ عافیت سے باہر نکل آئے ہیں اور بلا امتیاز شیعہ اور سنی اور قادیانی اور غیر قادیانی اور بلا امتیاز بدعتی اور وہابی اور بلا امتیاز بے دین ودیندار سب کے سب ایک پلیٹ فارم پر جمع نظر آتے ہیں۔ کیا یہ سب مشائخ عظام اور علماء ذوی الاحترام اور حضرات میلاد خوان اور جماعت سوگواران اور اُمت قادیان اور سرکاری پارٹی اور ''دیوبند کے سابق صدر محترم'' اور پیر جماعت علی شاہ ایران کی حمایت میں جمع ہوئے ہیں؟ کیا یہ ٹرکی کو روس کی دست برد سے بچانے کے لیے جمع ہوئے ہیں؟ کیا یہ حضرات فلسطین کی حمایت میں جہاد کرنے نکلے ہیں؟ کیا یہ پیر پگاڑو اور اس کے متبعین کی تحقیقات کرنے اور گورنمنٹ کو نا انصاف قرار دینے کی غرض سے جمع ہوئے ہیں؟ کیا یہ مدراس کے بہتر ۷۲ موپلہ جن کو بے آب ودانہ محبوس کر کے شہید کیا گیا تھا۔ ان موپلوں کا انتقام لینا چاہتے ہیں؟ کیا یہ تمام بزرگوار اور تمام سر اور خان بہادر اور نوابزادے اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ مقدس حجاز کی سرزمین سے امریکہ کے اقتدار کو زائل کریں؟ کیا جاوا کو

انگریزی اقتدار سے رہا کرانا چاہتے ہیں؟ کیا یہ مذکور بالا حضرات لبنان اور مراکش اور الجیریا کے مسلمانوں کی حمایت وصیانت کی غرض سے مجتمع ہوئے ہیں۔ کیا ہندوؤں نے شوکت اسلامی کو مٹانے کی غرض سے کوئی ہلہ بول دیا ہے جس کی وجہ سے مسلمان خوارج اور بد دینوں کی مدد کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کیا یہ سب عافیت پسند اس لیے نمودار ہوئے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ سے ہندوستان کو آزاد کرائیں اور اُسے مجبور کر کے مکمل آزادی حاصل کریں۔

معزز حضرات! آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ حضرات حاشا وکلا انگریز سے لڑنے نہیں نکلے، نہ یہ امریکہ سے جھگڑنے نکلے ہیں اور نہ یہ اس سے ٹکرانا چاہتے ہیں، اور خدانخواستہ نہ کبھی یہ ایسا تصور کر سکتے ہیں۔ بلکہ یہ تو ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے اور اس ملک کے ہندو، بلکہ اس مسلمان سے بھی لڑنے کے لیے نمودار ہوئے ہیں جو ان کو تقسیم کے نقصانات بتا کر ان سے کوئی حل تلاش کرنے کی درخواست کردے۔

یہ نہ قادیانیوں کے مخالف ہیں نہ شیعوں کے نہ بدعتیوں کے اور نہ مرتدین ملحدین کے مخالف ہیں۔ ہندوستان کے یہ عباد و زہاد نہ سرکار برطانیہ کے مخالف ہیں اور نہ روس و امریکہ کے بلکہ یہ تو ہر اس مسلمان کلمہ گو کے مخالف ہیں جو مسٹر جناح کو کالمعصوم سمجھ کر ان کی قیادت پر ایمان نہ لائے اور پاکستان کا نعرہ بلند نہ کرے۔

چار کروڑ مسلمانوں کی قربانی

میرے عزیزو! موجودہ الیکشن کے دور میں جو چیز حیرت افزا ہے وہ اپنی جماعت کے بعض سادہ لوح بزرگوں کا جماعت کو چھوڑ کر، غیروں کی جماعت میں داخل ہو جانا یا ''جمعیۃ علماء اسلام'' کی صدارت قبول کر لینا ہے بلکہ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد کم ہے اور جن صوبوں میں مسلمان ایک غیر موثر اقلیت ہیں ان صوبوں کے مسلمان بھی پاکستان کے نعرے بلند کر رہے ہیں اور یہ غریب اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ نعرہ تو خود ان کی تباہی اور بربادی کا موجب ہے۔ ان میں سے بعض خاصے اچھے پڑھے لکھے مسلمان کہتے ہیں کہ ہم چار کروڑ مسلمان تباہ ہو جائیں تو ہو جانے دو۔ مگر ہمارے پانچ کروڑ بھائی تو زندہ ہو

جائیں گے۔ گویا پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد اور بنگال کا مسلمان زندہ ہو جائے، چاہے ہم ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہ جائیں یا ہم تباہ و برباد ہو جائیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی بے وقوفی اور سفاہت ہو سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی کوئی خسارے کا سودا ہو سکتا ہے۔

اگر چار کروڑ مسلمان قربانی کے ایسے شائق اور دلدادہ ہیں تو میں عرض کرتا ہوں، پھر آپ صرف ایک چوتھائی ہندوستان کو کیوں پاکستان بناتے ہیں؟ چار کروڑ تو بہت بڑی اور بے پناہ تعداد ہے، آپ صرف ایک کروڑ قربان ہونے کو تیار ہو جائیے، پھر دیکھئے آج کی شام سے پہلے تمام ہندوستان ''پاکستان'' بنا جاتا ہے۔

یہ کس قدر بے مروّتی اور طوطا چشمی ہے کہ چار کروڑ مسلمانوں کے خون پر پاکستان کی بنیاد رکھی جائے اور کیا وہ ''پاکستان'' جو چار کروڑ یا بقول آپ کے ڈھائی کروڑ مسلمانوں کو بے کس اور بے بس بنا کر، تعمیر کیا جائے گا اور وہ پاکستان کتنے دن قائم رہے گا اور وہ انگریزی حکومت کا کس قدر محتاج ہوگا۔

جس پاکستان کو مسلمان لیگ کا آخری اور حقیقی ''نصب العین'' کہا جارہا ہے وہ درحقیقت انگریزی حکومت کی مضبوطی اور درازیٔ عمر کا سامان ہے۔

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر، سحر ہے، صیاد کے اقبال کا

مسلم لیگ کی حقیقت

حضرات! جس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کا لقب دیا جارہا ہے، اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ سرمایہ دار عافیت پسندوں کی ایک ٹولی ہے، جو نہ خود انگریزوں کا جم کر مقابلہ کرنا چاہتی ہے اور نہ دوسرے آزاد خیال لوگوں کو حکومت متسلطہ کے بالمقابل صف آرا ہونے دیتی ہے۔ میں اس ملک میں ایک عرصہ سے یہ تماشا دیکھ رہا ہوں کہ جب گورنمنٹ اس ملک کو کچھ دینا چاہتی ہے، اور کوئی ''رفارم'' انگلستان سے ڈھل کر آتی ہے

اور ہندوستان کے باشندوں کو کچھ اختیارات ملنے لگتے ہیں۔ تب ہی ان عافیت پسندوں کی کوئی نہ کوئی ٹولی مسلمانوں کی حمایت اور مسلمانوں کے حقوق کا نعرہ لگاتی ہوئی پلیٹ فارم پر آ جاتی ہے اور آزادی کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کی سرپرستی کا دعویٰ کرنے لگتی ہے۔ سادہ لوح مسلمان یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ ہمارے حقیقی رہنما اور خیر خواہ ہوں گے ان کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور وطن کے سچے خیر خواہوں کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس ''ٹولی'' کے پیش نظر صرف اپنا اور سرکار برطانیہ کا مفاد ہوتا ہے۔

انگریز اس ''نوزائیدہ ٹولی'' کا اس لیے پاس کرتا ہے کہ یہ اس کی ہم نوا اور ہم زبان ہو کر بولتی ہے اور یہ ٹولی اس طرح اپنا مطلب پورا کر لیتی ہے۔ یہ آزادی کا نام ضرور لیتی ہے اور آزادی کی تعریف بھی کرتی ہے، اور آزادی پر مر مٹنے کا ذکر بھی کرتی ہے، لیکن اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہوتی جیسے کوئی مشرک یا کافر توحید باری کی تعریف کرنے لگے، یا جیسے کوئی قادیانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''خاتم النبیین'' کہنے لگے یا کوئی شیعہ شیخین کی محبت کا اظہار کرے اور شیخین کی تعریف کرے، یہی وجہ ہے کہ اس خود غرض ٹولی کے افراد آزادی کا نعرہ تو بلند کرتے ہیں، لیکن اس نعرہ کے پیچھے غلامی کا بے پناہ سیلاب پنہائی ہوتا ہے۔ بیچارے عوام ان کو اپنا خیر خواہ اور مسلم حقوق کا محافظ سمجھ کر ان کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور کانگریسی مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھ لیتے ہیں اور جب انگریز اس خود غرض ٹولی سے اپنا مقصد حاصل کر لیتی ہے تو یہ عافیت پسند گروہ آرام سے پھر اپنے عشرت خانوں میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد بھی اسی قسم کا تماشا ہو چکا ہے اور اس دفعہ بھی یہی ہونے والا تھا لیکن خدا بھلا کرے آپ کی ''مسلم لیگ'' کا کہ اس دفعہ اس کی بدولت کوئی نئی ٹولی نہیں بنی اور بنتی ہی کیوں؟ جب انگریز کا کام اس کے حسب دل خواہ مسلم لیگ ہی پورا کر رہی ہے۔ جو پارٹ گزشتہ دنوں مسلم کانفرنس نے ادا کیا تھا، وہی پارٹ آج مسلم لیگ ادا کر رہی ہے۔ وہی حقوق مسلمین کا نعرہ ہے، وہی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے، وہی قوم پرور مسلمانوں کو گالیاں ہیں، وہی کانگریس پر حملے ہیں۔ غرض مسلم لیگ کے سارے انداز وہی ہیں جو مسلم کانفرنس کے تھے۔ جب مسلم لیگ ہی اس خدمت کو انجام دے رہی ہے جس کے لیے حکومت نے کبھی مسلم

کانفرنس بنائی تھی، تو اب کسی نئی جماعت کے بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی، بلکہ مسلم لیگ کے مطالبات تو مسلم کانفرنس سے بھی دو قدم آگے ہیں، مسلم کانفرنس کا مطالبہ تو محض پنجاب و بنگال کے لیے اکیاون اکیاون نشستوں کا تھا، وہ تو صرف یہی کہتی تھی کہ مسلمانوں کو بنگال اور پنجاب میں اکیاون اکیاون نشستیں دے دی جائیں لیکن مسلم لیگ تو ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کر رہی ہے اور اس پر ایسی مصر ہے کہ اس مسلم کش مطالبہ پر بعض بزرگ تو اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کو آمادہ ہیں۔

اللہ، اللہ! جن لوگوں کی اس راہ میں کبھی نکسیر تک نہیں پھوٹی جنہوں نے کبھی ایک رات بھی جیل خانے میں بسر نہیں کی، وہ آج جیل جانے والوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس دن جیل خانے گئے تھے، گویا جیل جانا بھی ایک خلاف سنت فعل ہے۔

میں نہایت ادب کے ساتھ ان ''خود فراموش'' حضرات کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ تین سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ''شعب ابی طالب'' میں نظر بند رہنا، کیا اسیری کی زندگی نہ تھی، جہاں آپ کے سارے خاندان کو قید کر کے کھانا بند کیا گیا تھا، اور رات کو جب بنی ہاشم کے بچے بھوک سے روتے تھے تو میلوں ان کے رونے کی آواز جاتی تھی، یہ قید نہیں تو اور کیا چیز تھی۔

کیا حضرت یوسف علیہ السلام جن کے جیل خانے کا قرآن میں ذکر موجود ہے، وہ جیل خانہ نہیں تھا؟ کیا حضرت امام ابوحنیفہ کو محبوس نہیں کیا گیا؟ کیا حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا منہ کالا کر کے اونٹ پر نہیں پھرایا گیا؟ کیا بنی ہاشم کے نونہال حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کو قید میں نہیں رکھا گیا؟ اور کیا حضرت موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ جیل میں نہیں رہے؟ اور کیا حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ گوالیار کے قلعہ میں نظر بند نہیں کیے گئے؟ اور کیا اس آخری دور میں حضرت شیخ الہند اور سید مولانا حسین احمد مصر کے جیل خانے میں اور پھر مالٹا میں قید نہیں رہے؟ اور مولانا حسین احمد صاحب ''علی برادران'' مرحوم و مغفور کے ہمراہ کراچی جیل میں نہیں رہے؟ اور کیا مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ دو سال ملتان جیل میں قید نہیں رہے؟ کیا یہ

تمام جیل جانے والے خلاف سنت فعل کے مرتکب ہوئے تھے۔

لیکن آج مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے جیل جانے والوں کا مذاق اُڑایا جارہا ہے اور جن کی زندگیاں کبھی ایک دن کے لیے بھی وقف جیل نہ ہوئیں، وہ خون کا آخری قطرہ، پاکستان کی بنیادوں میں دینے چلے ہیں، اوران کو یہ خبر نہیں کہ ان کے خون کا آخری قطرہ، پاکستان کو نہیں، بلکہ انگریزی اقتدار کو ہمیشہ کے لیے مضبوط و مستحکم کرنے کے کام آئے گا۔ ان بزرگوں کی سادگی کے قربان جایئے کہ جن کے خون کا آخری قطرہ، اپنے اکابر اور اپنے اساتذہ کے کام نہ آیا اور انہوں نے اپنے خون سے اپنے بڑوں کے نام کو روشن نہیں کیا۔ وہ خون دینے بھی چلے تو کہاں اور کس پر؟

افسوس، اس بدنصیب خونی قطرے پر جو مولانا ''شاہ ولی اللہ'' کی جماعت کے کام آنے کی بجائے، شیعوں، قادیانیوں اور کمیونسٹوں اور سرکار پرسوں کی خواہشات نفسانی پر بلکہ انگریزی اقتدار کے استحکام پر قربان ہو۔

بہرحال مسلم لیگ آج دنیا بھر کے مبتدعین، شیعہ، قادیانی، بے دین وملحدین، فساق و فجار اور حکومت کے ہوا خواہ، غرض ان سب کی نمائندہ جماعت ہے لیکن اگر یہ بدقسمت جماعت نمائندہ نہیں ہے تو علماء حق اور آزادی خواہ اور حکومت متسلطہ کے مخالف اور غریب مسلمانوں کی نمائندہ نہیں ہے۔

یہ خود غرض جماعت ملک میں اپنا اقتدار چاہتی ہے اور دوسرے تمام مسلمانوں کی جماعتوں کو اپنے سامنے بے حقیقت اور ہیچ سمجھتی ہے اور جو ان کی جماعت، اور ان کے جھنڈے کو قبول نہ کرے، یہ اُسے ''عبداللہ بن سبا'' کی طرح فنا کردینا چاہتی ہے۔

ان کی صحیح پوزیشن اور ان کی صحیح حقیقت اگر آپ کو معلوم کرنی ہو تو ''جی ایم سیّد'' کے وہ دونوں بیان پڑھ لیجیے جو انہوں نے مسلم لیگ کو ''الوداع'' کہنے کے وقت دیے تھے۔

جی ایم سیّد کا انکشافِ حقیقت

جی ، ایم سیّد کے اس وقت تک اخبارات میں دو بیان شائع ہو چکے ہیں ۔ ایک بیان میں انہوں نے نواب زادے لیاقت علی خاں اور قاضی عیسیٰ کی خود غرضی اور وعدہ خلافی کا تذکرہ کیا ہے اور مسلم لیگ نے جن اُمیدواروں کو سندھ اسمبلی کا ٹکٹ دیا ہے، ان کی سابقہ بداطواریوں اور رشوت ستانیوں کا اظہار کیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ مسلم لیگ کے ''ارباب حل وعقد'' صرف اپنے متعلقین سرمایہ داروں کو'' آگے بڑھا کر، مفاد عامہ اور غریب مسلمانوں کو کچلنا چاہتے ہیں۔

دوسرے بیان میں مسٹر جے، ایم سید نے نہایت وضاحت سے اپنے ان احساسات کا اظہار کیا ہے جو انہوں نے مسلم لیگ کے متعلق قائم کیے ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''لیکن ہمارے خواب محض وہم وگمان ثابت ہوئے اور ہمیں کسی قدر دیر سے یہ احساس ہوا کہ ہمیں عوام کی بہبود کے لیے نہیں بلکہ مسلم جاگیرداروں کے اقتدار کو قائم رکھنے اور عوام کو ''برطانوی نوکر شاہی'' کے مسلم کاسہ لیسوں کے قدموں تلے دبائے رکھنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے اور جس طرح ہم ہندو سرمایہ داروں سے حمایت حاصل کرنے پر مجبور تھے، اسی طرح لیگ نے ہماری حالت کو کنوئیں سے نکل کر، خندق میں گر جانے کی بنا دی۔''

مسٹر سیّد کے دونوں بیان طویل ہیں، اس لیے ان کو نقل کرنا دشوار ہے لیکن اخبار بیں حضرات سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ جی ایم سید کے بیانات نے مسلم لیگ کی صحیح حالت کو نمایاں کر دیا ہے اور چونکہ جی ایم سیّد خود بھی سندھ لیگ کے صدر ہیں، اور مسلم لیگ کی مجلس عمل کے ممبر بھی تھے، جس سے انہوں نے اب استعفا دے دیا ہے، اس لیے ان سے بڑھ کر کس کی شہادت معتبر ہو سکتی ہے۔

یہی میں جناب سے عرض کر رہا ہوں کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، اور کھانے کے

اور ہیں۔ یہ بننے کوتو ہر مسلمان کے نمائندہ بننے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ ایک مخصوص سرمایہ داروں اور سرکار پرستوں کی ٹولی ہے، جو مختلف طریقوں سے عوام کو دھوکہ دے کر، فریب میں مبتلا کرنا چاہتی ہے اور نئی نئی دلفریب اور خوش کن باتوں سے عام مسلمانوں کو دھوکہ دیتی رہتی ہے ان کا سلوک غیروں کے ساتھ تو کیا خاک ہوگا، جب یہ اپنوں ہی کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک سے پیش آنے کو تیار نہیں ہیں۔ ''جی ایم سید'' جو مسلم لیگ کا ایک ''دیرینہ خدمت گذار اور وفادار'' تھا، اس کے ساتھ بھی نواب زادے اچھا برتاؤ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور اپنے دوستوں اور چاہیتوں کے مقابلہ میں ایک پرانے خدمت گذار کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔

بہرحال جی ایم سید کے بیان کا مذکورہ بالا اقتباس بار بار پڑھیے اور خدا کے واسطے غور کیجیے کہ آپ کدھر جارہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس صاف اور واضح بیان کے بعد مسلم لیگ کو سمجھنے کے لیے کچھ اور عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سچی بات زبان سے نکل ہی جاتی ہے۔ اب میں آپ کو مسلم لیگ کے اس مطالبہ کی حقیقت سے بھی آگاہ کرنا چاہتا ہوں، جو آج کل ''پاکستان'' کے نام سے شہرت حاصل کر چکا ہے۔

پاکستان کیا ہے؟

آج تک بار بار تقاضہ کرنے کے باوجود کوئی صحیح اور قابل اعتماد مفہوم اس مطالبہ کا متعین نہیں کیا گیا، جس پر کوئی سیر حاصل تبصرہ کیا جا سکے۔ اب تک جو کچھ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے وہ اتنا متضاد اور لایعنی ہے کہ اگر اس کو دیوانے آدمی کا خواب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک مسلم لیگ کے ارباب حل وعقد کا دماغ اس معاملہ میں صاف نہیں ہے، ورنہ کوئی بات تو ان کی آخری بات ہوتی، جس پر انسان کوئی رائے قائم کرتا۔ اب تک جس قدر معلوم ہو سکا ہے اس کا خلاصہ ملاحظہ کیجیے:

''حضرات! احمد آباد میں تقریر فرماتے ہوئے مسٹر جناح نے ارشاد فرمایا

''مسلم اقلیت والے صوبوں پر جو گزرتی ہے، اُسے گزر جانے دو، لیکن

آؤ ہم اپنے بھائیوں کو آزاد کرادیں، جو اکثریت کے صوبوں میں ہیں تا کہ وہ شریعت اسلامی کے مطابق وہاں آزاد حکومت قائم کرسکیں۔''

(ایمان کا پاکستان نمبر، اخبار ''ڈان'' کی تشریح ملاحظہ ہو،)

''مسٹر جناح نے ہمیشہ کہا ہے کہ پاکستان کوئی دینی و مذہبی حکومت ہرگز نہ ہوگی بلکہ خالصاً ایک دنیوی حکومت ہوگی اور مسلمانوں کے ''حکومت الٰہیہ'' کے نظریے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کو ''عالمگیر اسلامی قومیت'' (پان اسلام زم) سے دور کا واسطہ بھی ہے، ان سے مسٹر جناح کو ہرگز اتفاق نہیں۔'' (۲۷/ اکتوبر ۴۵ء)

مسٹر جناح نے نیوز کرانیکل کے نمائندہ کو بیان دیتے ہوئے فرمایا:

''پاکستان کی حکومت یورپین جمہوریت کے طریقے پر ہوگی۔ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی آبادی اور مردم شماری کی حیثیت سے رائے شماری کر کے فیصلہ صادر کریں گے، وزارتوں اور لیجس لیجر میں سب حصہ دار ہوں گے۔''

پھر نواب زادے لیاقت علی خاں نے ۲۳/ ستمبر ۴۵ء کو مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''پاکستان ایک جمہوری ریاست ہوگی، اس کا دستور اساسی اس کے باشندے ہندو، مسلمان، سکھ وغیرہ خود اپنے دستور ساز اداروں کے ذریعہ بنائیں گے اور ان اداروں کی تشکیل وہ خود کریں گے۔''

(منشور ۲۶/ ستمبر ۴۵ء)

میاں بشیر احمد صاحب ممبر ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے دسمبر ۱۹۴۲ء میں اعلان کیا۔

''پاکستانی طرز حکومت، خلفائے راشدین کی حکومت کے مطابق ہوگی۔'' (مدینہ یکم جنوری ۱۹۴۲ء)

میاں ممتاز دولتانہ نے لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

''انتخاب میں کامیاب ہو کر، مسلم لیگ اور کانگریس کو مشترکہ وزارتیں بنانی چاہئیں۔ مجھے اُمید ہے کہ الیکشن کے بعد ہر جگہ کانگریس اور لیگ کی وزارتیں بنیں گی۔'' (قومی جنگ ۱۳/اگست ۱۹۴۵ء)

میاں بشیر احمد صاحب ممبر ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے دو نومبر ۱۹۴۵ء کو لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''ہمارے قائداعظم'' بار بار کہہ چکے ہیں کہ پاکستان میں بلالحاظ مذہب عوام کی حکومت ہوگی، پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو برابری اور آزادی دی جائے گی۔'' (منشور ۱۱ نومبر ۱۹۴۵ء)

۸ نومبر ۴۵ء کو بمبئی میں ایسوسی ایٹ پریس آف امریکہ کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے مسٹر جناح نے فرمایا:

''پاکستان ایک جمہوری حکومت ہوگی اور مجھے اُمید ہے کہ پاکستان کی بڑی بڑی صنعتیں اور کارخانے، سوشلسٹ اصول پر قوم کے قبضہ میں دے دیے جائیں گے۔'' (منشور، انجام)

۹/نومبر ۱۹۴۵ء کو الٰہ آباد میں نواب اسماعیل خاں صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا!

''مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان ہے اور وہ اس بات پر تلی ہوئی ہے کہ اس سرزمین میں اسلام کی سیاسی بنیادوں پر، شریعت مطہرہ کی حکومت قائم ہوگی۔''

''شد پریشاں خواب من، از کثرت تعبیر ہا''

معزز حاضرین! یہ نو قسم کا پاکستان تو میں بڑی تتبع اور تلاش سے حاصل کر سکا ہوں، لیکن یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو جاری ہے، ہر شخص بھانت بھانت کی بولیاں بولتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان گم کردہ راہوں کے سامنے، کوئی صحیح روشنی نہیں ہے، جو ان کی رہنمائی کر سکے۔

کبھی مسلمانوں کو دھوکا دینے کی غرض سے خلفائے راشدین کا نام لیتے ہیں، کبھی اسلام اور اسلامی حکومت سے اس پاکستان کی تفسیر کر دیتے ہیں، کبھی قرآن کا نام لے کر قرآنی حکومت کا ڈھونڈورا پیٹنے لگتے ہیں، کبھی اس پاکستان کو مسلمانوں کی مستقل حکومت بناتے ہیں اور جب سکھ اور ہندو کہتے ہیں کہ ہم تمہاری حکومت میں نہیں رہیں گے تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ وہ تو عوام کی حکومت ہوگی اور سب مل کر اپنا قانون بنائیں گے۔

مسلمان جو عرصہ سے اسلامی حکومت کا خواب پریشاں دیکھ رہے اور وہ سادہ لوح عالم جو مسلمانوں کے استقلال اور اسلامی برتری کے متمنی ہیں، ان ''گندم نما'' اور ''جوفروشوں'' کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ صرف انگریزی حکومت اور اس حکومت میں اپنا اقتدار اور اپنا اثر ورسوخ چاہتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں نہ قرآن ہے اور نہ اسلام، اور نہ خلفائے راشدین! بھلا خلفا کے تو یہ دشمن ہیں، خلفائے راشدین کی حکومت کو تو یہ بدترین حکومت سمجھتے ہیں، اور ابوبکر وعمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تو کھلم کھلا اور سربازار توہین کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ جن کے دسترخوانوں پر پانی کی بجائے شراب پی جاتی ہو، اور جو نماز سے ناآشنا اور طہارت و پاکیزگی کے دشمن، اور خدا تعالیٰ کا مذاق اُڑانے والے ہوں، وہ اور قرآن کی حکومت، وہ اور اسلامی حکومت، وہ اور اسلامی استقلال!

خدا عام مسلمانوں کو ہدایت عطا فرمائے اور ہمارے سادہ لوح علماء پر رحم فرمائے۔

تم کو ان سے ''خدا کی'' ہے اُمید
جو نہیں جانتے ''خدا'' کیا ہے!

کیا اسی لغو ولایعنی اور بے معنی پاکستان کو ڈھائی کروڑ مسلمانوں کی قربانی کر کے حاصل کر رہے ہو؟

مسلم اقلیت کے صوبوں کا مطالبہ

معزز حضرات! جن صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد کم ہے، ان صوبوں کے مسلمانوں کا مطالبہ تو مسلم لیگ سے یہ تھا کہ ہمارے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور ہم کو کانگریسی حکومتوں کے

مظالم سے بچایا جائے، اس قسم کا مطالبہ ان لوگوں کی طرف سے تھا جو صوبہ متحدہ بہار اڑیسہ، متوسط، مدراس اور بمبئی کے باشندے تھے۔ مسلم لیگ نے ان کی چیخ و پکار اور غل شور کا حل یہ نکالا کہ ان کو تو یہ مشورہ دیا کہ تم قربانی کا بکرا بن جاؤ، اور ہندو حکومتوں کے ماتحت غیر ملکی بن کر رہو، اور پنجاب، بنگال، سندھ اور سرحد کے مسلمانوں کو آزاد کرا دو۔

آپ نے دیکھا! جس عضو میں تکلیف تھی، اس کی صحت کا کیا خوب مداوا کیا کہ اس کو کاٹ کر پھینک دو، اور جن صوبوں کے مسلمانوں کو کوئی شکایت نہیں تھی ان میں پاکستان قائم کر دو اور اس لغو علاج کی دلیل یہ بیان کی کہ تھوڑا نقصان بڑے فائدے کی غرض سے اُٹھایا ہی جاتا ہے۔ ڈھائی کروڑ مسلمان مرتے ہیں تو مر جانے دو، اگر ڈھائی کروڑ مر کر، پانچ کروڑ بچ جائیں تو بھی مسلمان فائدہ میں رہے گا۔ یہ دلیل بظاہر خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ اس دلیل نے بڑے بڑے سمجھداروں کو مسحور بنا دیا ہے۔ عوام کا تو قصہ ہی کیا ہے جب خواص ہی گمراہ ہو جائیں تو دوسروں کا گلہ ہی بے کار ہے۔ یہ لوگ اتنی بات نہیں سوچتے کہ جن مسلمانوں کی تم زندگی کا سامان کر رہے ہو، ان کو تم ایک نئے مرض میں مبتلا کر رہے ہو۔ بنگال میں چھیالیس فیصدی ہندوؤں اور چون فیصدی مسلمانوں کو ملا کر، اسلامی حکومت قائم کر رہے ہو اور پنجاب میں چھپن فیصدی مسلمانوں کو، چوالیس فیصدی سکھوں اور جاٹوں کے ساتھ ملا کر، قرآن کی حکومت قائم کر رہے ہو۔

کیا یہی مسلمانوں کی زندگی کا سامان ہے اور انہی مشترکہ حکومتوں کا نام ''اسلامی حکومت'' ہے؟ خدا جانے تم واقعی بے وقوف ہو، یا جان بوجھ کر اپنی اغراض فاسدہ کے لیے مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہو۔

اگر پہلی صورت ہے تو خدا تم پر رحم کرے اور تم کو ہدایت دے اور اگر دوسری صورت ہے تو خدا سے ڈرو اور یہ سمجھ کر ڈرو کہ تم کو اس کے سامنے جانا ہے۔

یہ مسلمانوں کی موت و زندگی کا معاملہ ہے، یہ ایسا آسان نہیں ہے کہ تم اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی تکلیف بھی گوارا نہ کرو، غیر ''موثر اقلیت'' کو ہندوؤں کے حوالے کر رہے ہو اور ''مؤثر اقلیت'' کے حقوق کے ضامن بن رہے ہو، اور پھر تم دیانت دار ہو اور دنیا کے بیوقوفوں

کے سامنے سرخرو ہو۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ بنگال کے مسلمانوں کو بنگالی ہندوؤں پر اور پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں اور جاٹوں پر حکومت کرنا ایسا ہی آسان ہے جیسا یوپی، بہار، سی پی اور اڑیسہ کے ہندوؤں کو، ان صوبوں کے مسلمانوں پر حکومت کرنا سہل اور آسان ہے؟ پانچ فیصدی سات فیصدی، دس فیصدی اور پندرہ فیصدی پر حکومت کرنے والا ہندو تو اپنی حکومت کو ''ہندو حکومت'' کہہ سکتا ہے لیکن چوالیس فیصدی اور چھیالیس فیصدی ہندو اور سکھ پر حکومت کرنے والا مسلمان اپنی حکومت کو ''اسلامی اور قرآنی حکومت'' نہیں کہہ سکتا۔

جناب کی دلیل کا یہ خلاصہ اور تجزیہ ہے، یہ اچھا علاج ہے کہ ایک ناک یا کان کے مریض کا کان اور ناک یہ کہہ کر کاٹ دیا جائے کہ ناک اور کان کی پروانہ کرو، باقی جسم کو بچاؤ، اور جس جسم پر سے ناک اور کان کو کاٹا جائے اس جسم کو دق کے مرض میں مبتلا کر دیا جائے، تو کیا ایسا علاج کوئی معقول اور سمجھ دار طبیب کر سکتا ہے؟

پھر جن مسلمانوں کو مسلم لیگ تباہ کرنے اور موت کے گھاٹ اُتارنے کو تیار ہے، وہ تو ہندوستان کے مسلمانوں کا ''دماغ'' ہیں۔ اگر ہندوستان میں یوپی اور بہار کے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے، تو پھر رہ ہی کیا جاتا ہے۔ ہندو ہندوستان کے مسلمان تو ہندوستان کا اصلی دماغ ہیں، اگر خدانخواستہ اس دماغ کو قربان کر دیا گیا، تو کیا بے سر کا دھڑ، جبکہ اس دھڑ کو چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے بھی لپٹے ہوئے ہوں، وہ اسلام کی اور قرآن کی حکومت کا فریضہ انجام دے گا؟

اور یہ تو اس وقت ہے جب بنگال کا ہندو، بنگال کے مسلمان سے مل کر اور پنجاب کا سکھ اور جاٹ، پنجابی مسلمان سے مل کر حکومت کرنے اور حکومت بنانے پر آمادہ ہو جائے اور اگر کہیں صوبہ بنگال اور پنجاب کی بھی تقسیم ہوگئی تو پھر پاکستان کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اِدھر بنگال میں ایک ہندو حکومت، مسلمانوں کے دوش بدوش قائم ہوگی اور دوسری طرف پنجاب میں جاٹوں کی اور سکھوں کی دو حکومتیں قائم ہو جائیں گی۔

اب میں پوچھنا چاہتا ہوں، کیا یہ ''تقسیم در تقسیم'' جس کا خطرہ روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے

اور بڑھتا رہے گا۔ کیا یہ سلسلہ مسلمانوں کے لیے مفید ہوگا یا اس تقسیم کے منافع ''انگریزوں'' کے لیے سودمند ہوں گے اور مسلمانوں کے لیے یہ تقسیم در تقسیم ایک بلائے بے درماں بن جائے گی؟

پاکستان کا فیڈریشن

اس موقع پر نامناسب نہ ہوگا اگر آپ ''پاکستانی فیڈریشن'' پر تھوڑا سا غور کرلیں۔ اسی فیڈریشن کو ''دوسرا مرکز'' بھی کہتے ہیں۔ گویا بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد کو ملا کر، ایک فیڈریشن بنایا جائے گا اور وہی اسلامی حکومت ہوگی۔ اس فیڈریشن میں چالیس فیصدی ہندو جاٹ سکھ اور بنگالی ہندو، سندھی ہندو شامل ہوں گے، اسی مرکز کو یہ کہہ کر مسلمانوں کو فریب میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں ہماری حکومت ہوگی اور وہ خاص مسلمانوں کی حکومت ہوگی۔ مسلمان جو چاہیں گے کرسکیں گے یہی وہ ہندو مسلمانوں کی مشترک مرکزی حکومت ہوگی جو ڈھائی کروڑ مسلمانوں کے حقوق کی ضامن ہوگی اور اگر ہندو ہندوستان میں مسلمانوں پر ظلم ہوا تو یہ اس کا بدلہ سکھوں، جاٹوں اور ہندو بنگالیوں سے اور سندھ کے ہندوؤں سے لے گی اور موقعہ ہوگا تو یہی ''مشترک حکومت'' ہندو ہندوستان کے خلاف، جہاد کا اعلان کر کے یلغار بھی کردے گی۔

آپ فرمایئے! ان باتوں کو شیخ چلی کی ہزلیات نہ کہا جائے تو اور اس کا کیا نام رکھا جائے۔ اوّل تو بنگالی اور پنجابی مسلمانوں کا جوڑ ملاحظہ کیجیے، وہ بنگالی مسلمان جو اب تک بنگلہ زبان چھوڑنے پر بھی آمادہ نہیں ہے اور اُردو زبان کو اختیار کرنے پر تیار نہیں ہے، پھر پنجابی اور بنگالی مسلمانوں کی ایک عام ذہنیت ہے، جس کا تجربہ ہمیں روزمرہ ہوتا رہتا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ اپنے اپنے صوبہ کے آدمی کو، دوسرے لوگوں پر ترجیح دیتے ہیں حتیٰ کہ بنگالی مسلمان، بنگالی ہندو کو اور پنجابی مسلمان، پنجابی ہندو کو، دوسرے صوبہ کے مسلمانوں پر ترجیح دیتا ہے۔

اس ذہنیت کی موجودگی میں ان کا باہمی جوڑ لگنا ہی مشکل ہے اور اگر انہوں نے مل کر ایک فیڈریشن بنا بھی لیا تو کیا سندھی مسلمان اور سرحدی مسلمان اپنے اپنے صوبہ کو ایک ایسے

مرکز کے ماتحت سپرد کرنے کو تیار ہو جائے گا جس میں بنگالی اور پنجابی ہندو مسلمانوں کی یقیناً اکثریت ہوگی۔ کیونکہ حق "خود ارادیت" کا تو لامحالہ آپ کو بھی اعلان کرنا ہوگا اور جس طرح آپ کو مرکزی حکومت سے علیحدگی کا حق حاصل ہے اسی طرح آپ کے "مرکز" سے سندھ اور سرحد کو علیحدہ ہو جانے کا حق حاصل ہوگا، تو جناب خود اپنے مرکز کے ماتحت صوبوں سے لڑیں گے، یا ہندو ہندوستان کے مسلمانوں کا اپنی ہندو رعایا سے بدلا لیں گے اور ہندو ہندوستان پر یلغار کریں گے۔ اس پاکستانی فیڈریشن کا جو مضحکہ خیز حشر ہوگا وہ دنیا دیکھ لے گی۔

آج کل ایک بزرگ نے اس پاکستان کا ایک اور نام تجویز کیا ہے ان کی اصطلاح میں اس پاکستان کو مسلمانوں کی حصہ رسدی آزادی کہتے ہیں یہ اصطلاح بظاہر بڑی کدوکاش کے بعد تجویز کی گئی ہے لیکن اس میں بھی وہی تلبیس ہے جس کو میں ظاہر کر چکا ہوں، مسلمان کا نام لے کر مسلمانوں کو فریب میں مبتلا کرنا اسی کو کہتے ہیں۔

کیا جب ہندوستان کو آزادی نصیب ہوگی، تو کیا اس کا فائدہ صرف ہندو کو پہنچے گا یا "حصہ رسدی" یہاں کے ہر باشندے کو ملے گا۔ میں تو عرض کروں گا، جس دن انگریزوں کے قدم اس ملک سے باہر نکل جائیں گے اس دن کیا ہندو اور کیا مسلمان بلکہ یہاں کے گھوڑے اور گدھے، کتے اور بلیاں پیٹ بھر کر کھانے لگیں گے۔ آپ تو مسلمانوں کا "حصہ" تلاش کرتے ہیں اور میں عرض کرتا ہوں، اس آزادی سے جانور بھی، حصہ رسدی فائدہ حاصل کریں گے یہ "حصہ رسدی" کی اصطلاح خوب ہے، گویا مسلمان اس ملک کے باشندے ہی نہیں ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو ہر کھیت اس سے سیراب ہوتا ہے، جب اس ملک پر آفتاب طلوع ہوتا ہے تو ہر شخص اس سے روشنی حاصل کرتا ہے، جب اس ملک پر چاند نکلتا ہے تو ہر شخص کو اس کی ٹھنڈک پہنچتی ہے، اسی طرح جب اس ملک میں "آزادی کا آفتاب" طلوع ہوگا تو بلا کسی تقسیم اور بلا کسی حصہ رسدی کے ہر باشندۂ ملک کو اس سے فائدہ پہنچے گا۔

یہ بزرگ غالباً یہ سمجھ رہے ہیں کہ انگریزوں کے جانے کے بعد جب غلہ سستا ہوگا تو شاید ہندو کو ایک من فی روپیہ ملے گا اور مسلمان کو ایک روپیہ کا تیس سیر ملے گا۔ اس لیے یہ بزرگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہی حصہ رسدی ملے اور مسلمانوں کا غلہ یا مسلمانوں کے لیے کھیت

علیحدہ کر دیے جائیں۔ یہ حصہ رسدی کی بہت کہی اور حصہ رسدی بھی پانچ کروڑ مسلمانوں اور دو کروڑ ہندوؤں کے لیے باقی ڈھائی کروڑ مسلمان، اس حصہ رسدی سے خارج کر دیے جائیں۔

اس کا تو یہ مطلب ہے کہ ہندو ہندوستان کے مسلمان گائے کے گوشت کو ترس جائیں، اور پاکستان میں ''سوَر'' کتنا رہے اور جھٹکہ کا گوشت بکتا رہے۔ ان غریب مسلمانوں کی تو وہی حالت ہو جائے جو اس وقت ہندو ریاستوں کے مسلمانوں کی ہے، اور تم چالیس فیصدی غیر مسلم رعایا کو دودھ پلا پلا کر موٹا کرتے رہو اور جب کبھی کوئی قدم اپنی غیر مسلم رعایا کے خلاف اُٹھاؤ تو وہ بغاوت کی دھمکی دیں یا بغاوت کر دیں۔ پھر تم انگریزوں سے درخواست کرو کہ سرکار ہمارا پاکستان خطرہ میں ہے آپ ہماری مدد فرمایئے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مناسب ہوگا اگر اس وقت مفکر اعظم حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب، نائب امیر شریعت صوبہ بہار کے اس مضمون سے کچھ اقتباسات پیش کر دوں جو مولانا ممدوح نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر مسلم لیگ کی تجویز لاہور پر لکھا تھا اور جو اسی زمانہ میں نقیب کے صفحات پر شائع ہوا تھا۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کی ذات گرامی اور ان کی اصابت رائے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ ان کی معاملہ فہمی، دور رسی اور موقعہ شناسی سے نہ کسی اپنے کو انکار ہے اور نہ پرائے کو۔ لیگی حضرات بھی ان کی خوبیوں اور ان کے کمالات علمی کے معترف ہیں، اس لیے مولانا مرحوم کے مضمون سے اقتباسات پیش کرنا ہر اہل فہم و بصیرت کے لیے مفید ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں:

> ''اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ دو ڈھائی سال سے کانگریس اور ہندو اکثریت کے اصلی یا فرضی مظالم پر صرف ''ماتم'' کر رہی ہے اور اس کے علاج کی کوئی تجویز آج تک پیش نہیں کر سکی تھی۔ حالانکہ اس سے کانگریسی لیڈروں نے بار بار پوچھا کہ آخر لیگ کیا چاہتی ہے۔ یوپی، بہار، سی پی میں جو شکایتیں مسلم لیگ کو

تھیں، اگر اس کو کلیتاً صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے، تو ان صوبوں کے مسلمانوں کی فرحت بخش زندگی کے لیے، کن اصولوں کے وضع واختیار کو پسند کرتی ہے مگر لیگ کوئی ایک بات مسلم اقلیت والے صوبوں یا یوں کہیے کہ ہندو اکثریت والے صوبوں کی بابت لاہور اجلاس تک نہیں بتا سکی۔

میں بہت خوش ہوں اور مسٹر جناح کا شکر گزار ہوں کہ لیگ نے اپنے اجلاس میں دو ڈھائی سال کے سوچ بچار کے بعد ایک بات تو کہہ دی جو مسٹر جناح کے خیال کے مطابق ایک آخری حل ہے۔

اب مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو خصوصیت سے غور وفکر کا موقعہ مل گیا ہے کہ وہ لیگ کی مجوزہ اسکیم پر ''مسٹر جناح'' اور لیگ کے دوسرے لیڈروں کے توضیحی بیانات کی روشنی میں غور کریں کہ دو ڈھائی سال سے جن امور پر قائم کیا جا رہا تھا کیا اس اسکیم میں اس کے انسداد و اصلاح کا کوئی امکان بھی موجود ہے؟

ہر معمولی سمجھ کا انسان لیگ کی مجوزہ اسکیم اور مسٹر جناح کے توضیحی اعلان کو سامنے رکھ کر صاف طور سے دیکھ سکتا ہے کہ اس اسکیم میں ہندو اکثریت والے صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے مزید تسکین کا کوئی ایسا ذریعہ تجویز نہیں کیا گیا ہے جو ان کے لیے قابل اطمینان ہو، بلکہ مسلم لیگ کی اسکیم کو جو کچھ تعلق ہے وہ مسلم اکثریت کے صوبوں سے ہے اور یہ معلوم ہے کہ مسلم لیگ نے گزشتہ دو ڈھائی سال کے عرصہ میں ان صوبوں کے مسلمانون کے متعلق کوئی شکایت بھی نہیں کی، گویا موجودہ ناقص جمہوری دستور حکومت اور ناقص صوبجاتی خودمختاری اور مرکزی وحدانی حکومت کے ماتحت بھی، مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ مسلم لیگ کے نزدیک پنجاب، بنگال، سندھ وصوبہ سرحد کے مسلمان بھی موجودہ

ناقص دستور حکومت کے عمل درآمد میں کچھ بھی مظلوم ہوتے تو لیگ واحد نمائندگی کی بنا پر کچھ نہ کچھ ضرور شکایت کرتی، مگر عدم شکایت کے باوجود مسٹر جناح جو اسکیم تجویز کرتے ہیں، اس کا مفاد یہ بتاتے ہیں کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کے مسلمان ہندو اکثریت کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے، مگر یہ نہیں فرماتے کہ اس اسکیم کے ماتحت برطانیہ کی غلامی سے بھی آزاد ہوں گے۔

مسلم اقلیت کے حقوق کی ضمانت

باقی رہے مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمان، جن کو وہ صرف دو کروڑ فرماتے ہیں (حالانکہ تقریباً تین کروڑ ہیں) ان کو ہندو اکثریت کی غلامی پر رضامند ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور اس کی تسکین کے لیے زیادہ سے زیادہ جو بات کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کی مجموعی طاقت اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی حفاظت کی ضمانت ہوگی۔

ضمانت کے دو فرضی نظریے

اور اس ضمانت کی عملی شکل صرف دو نظریوں پر مبنی ہے۔ اوّل تو یہ کہ اگر ہندو اکثریت، مسلم اقلیت پر ظلم کرے گی تو مسلم اکثریت بھی ہندو اقلیت پر ظلم کرے گی۔

مگر یہ نظریہ محض خیالی اور وہمی ہے، جس کا وجود کبھی نہیں ہوگا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی حکومت اپنی پرامن اور وفادار رعایا پر محض اس لیے ظلم نہیں کر سکتی ہے کہ دوسری حکومت میں اس کے ہم مذہبوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ اس دنیا کے موجودہ عہد میں ایسا خیال صرف کوئی ''احمق'' یا ''مجنون'' ہی کر سکتا ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ ترکوں نے ''ترکی عیسائیوں پر'' آج تک محض اس لیے کبھی ظلم نہیں کیا کہ برطانوی حکومت یا دوسری عیسائی حکومتیں، اپنی حکومت میں مسلمانوں پر ظلم کرتی رہی ہیں، اس

کے علاوہ ''اسلامی احکام'' کی رو سے، مسلم حکمران مجبور ہیں کہ اپنے محکوم غیر مسلموں سے ہمیشہ بہتر سلوک کریں، جب تک وہ وفادار ہیں اور شرعاً یہ امر کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی غیر مسلم حکومت میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے تو وہ اس کا انتقام اپنے ان محکوم اور ان وفادار غیر مسلموں سے لیں جو مسلمانوں پر ظلم کرنے میں کسی طرح شریک نہیں تھے۔

دوسرا ''فرضی نظریہ'' یہ ہے کہ مسلم اکثریت والے، اپنی مجموعی طاقت سے ہندو اکثریت والے صوبوں پر یلغار کر دیں گے، اگر ان صوبوں کے مسلمانوں پر ظلم ہوگا یا ان کے مجوزہ مفاد کو کوئی نقصان پہنچے گا اور اسی فرضی حملہ کے خوف سے مسلم اقلیت کی حفاظت ہو جائے گی۔

میں یقین اور بصیرت کے ساتھ کہتا ہوں، اس دنیا کے موجودہ ماحول میں، یہ ''فرضی نظریہ'' بھی کبھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ کیا مسلمانانِ ہند ناواقف ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر اس وقت تک مسلمانانِ ہند پر کیا کیا مصیبتیں نازل نہیں ہوئیں۔ مگر مسلمانوں کی آزاد اور طاقتور حکومتوں، خاص کر ''خلافت اسلامیہ'' نے اس ظلم سے بچانے کے لیے کبھی ہندوستان پر حملہ نہیں کیا، حملہ تو بڑی چیز ہے، کبھی انہوں نے اس کے متعلق نوٹس بھی نہیں دیا۔ دور کیوں جایئے ابھی کے تازہ واقعات ہیں، البانیہ کی اسلامی ریاست پر جابرانہ قبضہ کر لیا گیا مگر تمام آزاد اور نیم آزاد اسلامی حکومتیں، تماشہ دیکھتی رہیں کسی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ مسلمانانِ فلسطین نے اپنی داستان غم تمام دنیا کے مسلمانوں کو بار بار سنائی، اسلامی حکومتوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کیا، جہاد بالسیف کے لیے اعلان کیا، مگر دنیا جانتی ہے کہ لفظی ہمدردی جس طرح ہندوستان کے مسلمان کرتے رہتے ہیں، اسی طرح آزاد مسلم حکمرانوں نے بھی کی اور اس سے زیادہ کسی نے کچھ نہیں کیا۔

کیا ان واقعات کے بعد بھی کسی شخص کو یہ وہم ہو سکتا ہے کہ اس ''فرضی نظریہ'' کا کبھی وجود بھی ہوگا۔

مسلم اسٹیٹ کے اجزاءِ ترکیبی اور اس کی طاقت

اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی سامنے رکھا جائے کہ مسٹر جناح کی اسکیم کے ماتحت ان

کے مفروضہ مسلم اسٹیٹ کے باشندے، صرف مسلم ہی نہیں ہوں گے بلکہ غیر مسلم بھی ہوں گے، جیسا کہ مسٹر جناح نے اپنے بیان میں خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ غیر مسلم باشندے بھی حکومت کے شریک کار ہوں گے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس قسم کا ''مشترک اسٹیٹ'' جس کو مسٹر جناح غلط طور پر ''مسلم ریاست'' کہہ رہے ہیں، دوسرے ''مشترک اسٹیٹ'' پر جس کو مسٹر جناح ''ہندو اسٹیٹ'' کہتے ہیں حملہ کردے یا اپنے ہی اسٹیٹ کے اندر بے قصور ہندوؤں سے کوئی انتقام لے گا۔

الغرض اس قسم کے وہمی تصورات اس دنیا میں مجنون یا بدترین احمق کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر جناح ان حقائق سے ناواقف نہیں ہیں اور وہ یقین کرتے ہیں کہ ان کی مجوزہ اسکیم کے ماتحت بھی، اگر وہ بروئے کار آئے تو بھی ہندو اکثریت والے صوبوں میں ''مسلم اکثریت'' کے حقوق اور اس کی حفاظت کی کوئی ضمانت بعض مسلم ریاستوں کے قیام سے نہیں ہو سکتی۔

مسلم اقلیت کے حقوق سے دست برداری

اس لیے وہ اعلان کرتے ہیں کہ مسلم اقلیت والے صوبوں کو چھ کروڑ مسلمانوں کی آزادی میں رکاوٹ پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ دو کروڑ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی غلامی پر قناعت کر کے چھ کروڑ مسلمانوں کو ان کے ''مفروضہ اسٹیٹ'' کے قیام کا موقعہ دینا چاہیے۔ چاہے ان دو کروڑ مسلمانوں کے مذہب، تمدن، معاشرت اور جان و مال کو کسی قدر خطرات پیش آئیں اور خواہ وہ تباہ ہو جائیں۔

لیگ کی جدید اسکیم کی تاریخ

یہ ان کی اختیار کردہ اسکیم کچھ آج کی پیداوار نہیں ہے، سب سے پہلے ۱۹۲۲ء میں جبکہ کانگریس جمعیۃ علماء خلافت کانفرنس کے اجلاس ''گیا'' میں ہو رہے تھے۔ بیرون ہند سے یہ اسکیم آئی تھی جس کو مسلمان لیڈروں نے ناقابل التفات سمجھا، پھر ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم

نے اس اسکیم کو اپنا کر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے آواز بلند کی۔ بھائی پر مانند بھی جیل سے رہائی کے وقت اس اسکیم کو اپنے ساتھ لائے۔ خدا جانے اپنی فکر سے لائے یا کسی اور نے دی تھی۔ مگر جب لندن میں گول میز کانفرنس ہوئی تو ''ہندو مسلم'' حل کے لیے یہ اسکیم نہ مسٹر جناح کو یاد آئی اور نہ ڈاکٹر اقبال مرحوم، اور دیگر مسلم لیگی اور مسلم کانفرنسی لیڈروں کو، جو گول میز کانفرنس میں شریک ہوتے رہے حالانکہ اس اسکیم کے پیش کرنے کا بہترین موقعہ وہی تھا۔ اگر یہ اسکیم مسلم لیگ کے نزدیک اہل ملک اور مسلمانوں کے لیے تسلی بخش تھی، تو عین اس وقت کیوں خاموش رہے اور بار بار یورپین طرز کی مشترکہ جمہوری حکومت اور چودہ نکات پر کیوں زور دیتے رہے؟

لیگ کی جدید اسکیم کا پس منظر

چونکہ لیگ کی نئی زندگی، صرف کانگریسی حکومتوں کے اصلی یا فرضی مظالم کی داستان پر مبنی تھی اور انہیں مظالم کو بار بار بیان کر کے لیگ کے جھنڈے کے نیچے مسلمانوں کو جمع کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی، لیکن حسن اتفاق سے جب یورپین جنگ کے شروع ہوتے ہی کانگریسی حکومتیں خود بخود مستعفی ہوگئیں، تو عوام مسلمانوں کو کانگریس کے مظالم سے نفرت دلا کر لیگ کی طرف مائل کرنے کا بہانہ ہی ختم ہوگیا، اور عوام الناس کے جذبات کو مشتعل کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا، تو مسلم لیگ کے لیے سر دست کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ ''مسلم انڈیا، اور ہندو انڈیا'' کا پرفریب لفظ بول کر نا سمجھ مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کر کے لیگ کے جھنڈے کو گرانے سے بچایا جائے۔ کیونکہ غریب، جاہل مسلمان جو برطانوی حکومت میں بالکل مفلس ہو گیا ہے خود دانہ دانہ کا محتاج ہے۔ وہ بھی یہ تصور کر کے کہ مسلم لیگ ہندوستان کے ایک بڑے رقبہ میں ''اسلامی راج، قائم کر رہی ہے جس کے ذریعہ مذہب کی حفاظت ہوگی اپنی تمام جسمانی، روحانی تکلیفوں کو بھول کر مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع رہے گا۔ تا آنکہ اسمبلیوں اور کونسلوں کے انتخابات کا زمانہ آئے تو اس اسلامی حکومت کی اقامت کے نظریہ پر الیکشن میں کامیابی ہو اور اسی تخیل پر عوام کو لیگ کے جھنڈے میں پھنسائے رکھا جائے اور اسی ترکیب سے عرصہ دراز تک غریبوں کو گمراہ رکھا بھی جا سکتا ہے۔

ایک ضروری تنبیہ

لیگ کے ہائی کمانڈ کو یقین کرنا چاہیے کہ یہ ترکیب اور پالیسی بھی زیادہ دنوں تک کام نہیں دے گی اور ایک دن اس تدبیر باطل کا پردہ چاک ہو کر رہے گا۔ بہر حال اگر لیگ کے ہائی کمانڈ اس اسکیم پر اعتماد بھی رکھتے ہیں تو تین کروڑ سے زیادہ مسلمانوں کا یہ سوال بدستور قائم ہے کہ آخر ہمارا ماتم کیوں ختم کیا گیا؟ ہم پر تو آج بھی مظالم اسی طرح ہو رہے ہیں جس طرح کانگریسی حکومتوں کے زمانہ میں تھے۔ فسادات بھی ہو رہے ہیں، مسلمان شہید اور زخمی بھی ہو رہے ہیں، قربانی گاؤ پر پابندیاں بھی عائد ہوتی رہتی ہیں، اب ہم پر کیوں رحم نہیں کیا جاتا؟ اور پہلے کیوں کیا جاتا تھا۔ بلکہ اب ہم سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے چھ کروڑ بھائیوں کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دو، یہ بات تو پہلے بھی کہی جا سکتی تھی، دو ڈھائی سال تک خواہ مخواہ کیوں پریشان کیا گیا۔

مسٹر جناح سے ضروری سوال

اسی کے ساتھ یہ تین کروڑ مسلمان، مسلم لیگ کے ہائی کمانڈ سے یہ بھی سوال کر سکتے ہیں کہ جب چھ کروڑ مسلمانوں کی آزادی کے مقصد سے دو کروڑ مسلمانوں کے لیے ہندوؤں کی غلامی قبول کی جا سکتی ہے تو اسلامی ممالک کے تقریباً ۲۰-۲۵ کروڑ مسلمانوں کی کامل آزادی اور برطانوی شہنشاہیت کی ہوس جہانگیری سے نجات دلانے کے لیے پورے آٹھ، نو کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ہندو اکثریت کی غلامی کیوں گوارا نہیں کی جا سکتی ہے؟

عقلی اور شرعی نقطہ نظر سے اس صورت میں اور مسٹر جناح کی تجویز کردہ صورت میں کیا فرق ہے؟ اس کو واضح کریں۔

اس وقت لیگ اور مسٹر جناح سے مسلم اقلیت والے صوبوں کے تین کروڑ مسلمان اس سوال کا جواب دریافت کرنے میں اس لیے حق بجانب ہیں کہ تحریک خلافت اور تحریک آزادی سے مسلمانوں کو علیحدہ رکھنے کے لیے ہمیشہ یہی دلیل بیان کرتے رہے کہ ہندوستان کے

مسلمان ہندوؤں کے غلام ہو جائیں اور ان کی اس دلیل کا جواب آزادی پسند اور سرفروش مسلم جماعتوں اور افراد کی طرف سے ہمیشہ یہی دیا گیا کہ ہم اولاً تو اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہم ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے، اگر بفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ایسا ہی ہوگا، جب بھی ہندوستان کی آزادی سے اسلامی ممالک کے ۲۰-۲۵ کروڑ مسلمان تو ''برطانوی شہنشاہیت'' کے تسلط سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائیں گے، مگر اس جواب سے مسٹر جناح کی ٹائپ کے لوگ جو اس وقت لیگ کے رہنما ہیں کبھی مطمئن نہیں ہوئے اور اسی وجہ سے یہ لوگ تحریک آزادی کے مخالف رہے اور علیحدہ رہے۔

مکمل آزادی اور فرقہ وارانہ مسائل

پس اگر آج بیس برس کے بعد مسٹر جناح اور ان کے ہم خیالوں کو آزادی پسند مسلمانوں کی دلیل کی سچائی پر یقین ہو گیا ہے تو پھر وہ کیوں تحریک آزادی میں بلا چون و چرا حصہ لینے کے لیے تیار نہیں ہوتے؟ اور کیوں کانگریس اور ہندوؤں سے صدق دل سے نہیں کہتے کہ ہندوستان کی کامل آزادی کی جدوجہد شروع کرو، ہم ساتھ ہیں یا یہ کہیں کہ ہم شروع کرتے ہیں تم ساتھ دو اور خواہ مخواہ کے لیے کیوں وہ فرقہ وارانہ مسائل کے عدم انفصال کو آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔ اگر برطانوی حکومت ایسا کرتی ہے تو اس کے لیے یہ زیبا نہیں ہو سکتا ہے، مگر مسٹر جناح جیسے لوگوں کے لیے تو اب خود ان کی دلیل کی روشنی میں فرقہ وارانہ مسائل کے عدم انفصال کو آزادی کی راہ میں رکاوٹ قرار دینے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ بہر حال مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کو جن کی تعداد بقول مسٹر محمد علی جناح دو کروڑ ہے، یقین کر لینا چاہیے کہ دو ڈھائی سال سے جس کے لیے مسلم لیگ ماتم کر رہی ہے، اب لیگ انہیں ہمیشہ کے لیے فراموش کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ بشرطیکہ ان کی مجوزہ اسکیم بروئے کار آئے اور لوگوں کو ان سوالوں کا مسٹر جناح یا ان کے ہم خیال تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے، جن کی طرف اس مضمون میں اشارات کیے گئے ہیں اور سمجھدار لوگوں کے لیے لیگ کی مجوزہ اسکیم میں، دل خوش کن الفاظ کے سوا کوئی معنی نہیں ہیں۔

تاہم اس کی ''لغویت'' کو سمجھنے اور اسلامی ضرر رسانی کا یقین کرنے کے لیے حسب ذیل امور پر غور کرنا چاہیے۔

مسلم اسٹیٹ کے پرفریب لفظ کی حقیقت

اگر ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں غیر مسلموں کی بھی آبادی باقی رکھی گئی اور ان غیر مسلم آبادیوں کو بھی وہاں کے نظام حکومت میں حصہ دیا گیا جیسا کہ مسٹر جناح کے توضیحی بیان سے ظاہر ہے، خاص کر اس حصہ سے جہاں انہوں نے سکھوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے تو اس صورت میں ان منطقوں اور حصوں کو ''مسلم انڈیا'' اور وہاں کی حکومت کو ''اسلامی حکومت'' قرار دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

اگر اس قسم کے قطعات کا نام مسلم انڈیا اور اسلامی حکومت ہے تو وہ آج بھی موجود ہے۔ اگر ان لفظوں سے اپنے دل کو یا جاہل مسلمانوں کو خوش کرنا ہے تو وہ آج بھی پنجاب، بنگال، سندھ، صوبہ سرحد کو مسلم انڈیا اور اسلامی حکومت کہتے ہیں۔

ہاں اگر ان کی اسکیم یہ ہو کہ وہ ان حلقوں سے ایک ایک غیر مسلم کو نکال دیں گے یا یہ کہ ان حلقوں میں غیر مسلم باشندوں کو نظام حکومت میں کوئی حصہ بھی نہیں دیں گے اور ان کو ''محکوم محض'' بن کر رہنے کی اجازت دیں گے، تو بلا شبہ اس صورت میں وہ ان حلقوں کو مسلم انڈیا اور مسلم اسٹیٹ یا ریاست کہہ سکتے ہیں۔ مگر ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ایسی صورت نہیں ہوگی اور نہ لیگ کے ہائی کمانڈ کے دماغ کے کسی گوشہ میں یہ تصور موجود ہے، تو پھر مسلم انڈیا اور مسلم ریاست کے بے معنی الفاظ بول کر غریب مسلمانوں کو کیوں پریشان کیا جا رہا ہے؟

''دفاع، کسٹم اور خارجی پالیسی، فیڈریشن کے ''اختیار'' میں ہوں گے یا اس کے اجزاء ترکیبی کے؟''

(۲) مسٹر جناح مسلم اکثریت والے صوبوں یا حصوں کو علیحدہ و مستقل خود مختار ریاست تجویز کرتے ہوئے، ان سب کا ایک فیڈریشن تجویز کرتے ہیں۔ یعنی ایک مرکزی اسلامی فیڈرل حکومت بھی ان کے خیال میں ہونی چاہیے۔ اسی طرح ہندو اکثریت والے صوبوں یا

حصوں میں ہندو خود مختار حکومت تسلیم کرتے ہوئے ان کا ایک فیڈریشن اور فیڈرل حکومت تجویز کرتے ہیں۔

اسی طرح خود مختار دیسی ریاستوں کا فیڈریشن ہوگا، یا ریاستیں اپنی خود مختاری قائم رکھتے ہوئے، ان ہی مذکور الصدر ''اسلامی فیڈریشن'' یا ''ہندو فیڈریشن'' میں شریک ہو جائیں گے۔ اسی کے ساتھ جناح صاحب ''ہر دو'' یا ''ہر سہ'' فیڈریشن کی خود مختار ریاستوں کے لیے دفاع، خارجی پالیسی اور کسٹم کے حقوق واختیارات دینا چاہتے ہیں جیسا کہ مسلم لیگ کی تجویز کے آخری الفاظ سے ظاہر ہے۔ مگر ہر معمولی سمجھ کا آدمی جان سکتا ہے، کہ کسی فیڈریشن کے ''اجزاء ترکیبیہ'' اور خود مختار ریاستوں کو یہ حقوق براہ راست نہیں دیے جاسکتے، کیونکہ اس صورت میں فیڈریشن اور فیڈرل حکومت کا کوئی وجود ہی نہیں ہوسکتا ہے۔ اسی لیے مسلم لیگ کی تجویز کا مطلب صرف یہی لیا جاسکتا ہے کہ مسلم فیڈریشن، ہندو فیڈریشن اور دیسی ریاستوں کے فیڈریشن کے ہاتھ میں دفاع، خارجی پالیسی اور کسٹم کے کامل اختیارات دیں گے، لیکن ان امور میں ہر دو یا ہر سہ فیڈریشن کے استقلال اور مطلق العنانی کی صورت میں کوئی فیڈریشن، خاص کر مسلم فیڈریشن اطمینان کے سانس نہیں لے سکتا ہے، فرض کیجیے کہ ہندو فیڈریشن جاپان و چین یا برطانیہ سے اپنے روابط دوستانہ قائم کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے اور مسلمان فیڈریشن اپنے اندرونی و بیرونی مفاد کو پیش نظر رکھ کر افغانستان، ایران، مصر، حجاز ترکوں کے ساتھ روابط کو ترجیح دیتا ہے اور برطانیہ کے روابط کو مضر سمجھتا ہے۔ ایسی صورت میں تمام ہندوستانیوں، خاص کر مسلم فیڈریشن والوں کو جن مشکلات کا سامنا ہوگا اس کے تصور سے ہر سمجھدار انسان حیران و ششدر ہو جاتا ہے۔

مرکزی فیڈریشن اور اس کی نوعیت

ان مشکلات پر نظر کرتے ہوئے، لامحالہ ایک ایسے مرکزی فیڈریشن کی صورت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے جس میں ہندو فیڈریشن، مسلم فیڈریشن اور دیسی اسٹیٹ فیڈریشن برابر کے شریک ہوں اور اسی کے ہاتھ میں دفاع، خارجہ پالیسی اور کسٹم وغیرہ کے معاملات ہوں تاکہ

ہندوستان پر خارجی حملوں کی صورت میں مرکزی فیڈرل حکومت کی رہنمائی میں ہندوستان متحدہ طور پر اپنی آزادی کو قائم رکھ سکے، اسی طرح بیرونی حکومتوں سے تجارتی معاملات وغیرہ تمام ہندوستان کے لیے اسی ایک مرکز سے متعلق ہو ورنہ ہندوستان خاص کر مسلم فیڈریشن کے حصے اقتصادی حیثیت سے گھاٹے میں رہیں گے۔

جب خود مسلمانوں کے مفاد اور ہندوستان کی ترقی و امن کے لیے ایک اور مرکزی فیڈرل حکومت کی ضرورت ہو جائے گی تو یہ بات سمجھنے کی ہے کہ "مسلم انڈیا" پر کس قدر کافی بار پڑ جائے گا، صوبجاتی خودمختاری کے اخراجات کے علاوہ ایک "بار عظیم"، مسلم فیڈرل حکومت پر ہوگا اور ایک بڑی رقم مرکزی فیڈرل کو ادا کرنی پڑے گی۔

اسی کے ساتھ مسلم صوبجات کے حلقوں کی وسعت اور اس کے مالی مسائل پر بھی غور کیجیے تو اندازہ ہو جائے گا کہ مسلم حلقوں کو اپنی موجودہ حالت قائم رکھنا بھی مشکل ہو جائے گا، چہ جائیکہ تعلیمی، اقتصادی اور تمدنی ترقی کرنا!!

مرکزی فیڈریشن اگر نہ ہو؟

اگر مسلم فیڈریشن، ہندو فیڈریشن اور دیسی ریاستوں کی فیڈریشن کی کوئی مرکزی فیڈریشن نہ ہو تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان تمام فیڈریشنوں پر ایک بالا دست طاقت مسلط ہو اور وہ "برطانیہ" ہوگی۔ گویا برطانیہ کی غلامی بدستور قائم رہے گی اور مسٹر جناح کے بیان میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے اور وہ یہ کہ وہ برما اور سیلون سے ہندوستان کے تعلقات کو بیان کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح برطانیہ کی طاقت برما اور سیلون اور ہندوستان کو باہم وابستہ رکھے ہوئے ہے، اسی طرح مسلم فیڈریشن اور ہندو فیڈریشن کو بھی وہ وابستہ رکھے گا۔ گویا مسلم لیگ اور مسٹر جناح کو برطانیہ کی غلامی بہر حال منظور ہے۔

ان حالات میں مسلمانوں کو اچھی طرح سوچنا چاہیے کہ مسٹر جناح انہیں کدھر لے جا رہے ہیں؟" (ماخوذ از نقیب)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم کی اس تفصیل اور ان تشریحات کے بعد جو ہم نے ان کے مضمون سے حاصل کی ہیں، ایک سمجھدار شخص کو کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے اور اس سے

علماء کی اس سیاسی بیداری اور سوجھ بوجھ کا بھی پتہ چل جاتا ہے، جس سے جاہل اور بے خبر انسان ناواقف ہیں۔

اب تو پاکستان کے خلاف بہت سے خطرات ظاہر کیے جارہے ہیں، لیکن اس وقت تو حضرت مولانا سجاد صاحب کی پہلی آواز تھی جو مسلم لیگ کے ریزولیوشن کے خلاف نکلی تھی۔ ادھر لاہور میں تجویز پاس ہوئی اور مسٹر جناح نے اس کی توضیح میں بیان دیا اور ادھر مولانا سجاد مرحوم کے دوررس دماغ نے ان تمام خطرات اور مصائب و آلام کو متحضر کر دیا جو پاکستان کے دامن میں پوشیدہ تھے اور جس کو نادان لوگ اپنی بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں اور بے وقوف مسلمان اس زہر کے پیالے پر اس طرح گرے پڑتے ہیں جیسے وہ شہد کا پیالہ پینے کو دوڑ رہے ہیں اور ان کو معلوم نہیں کہ یہ ایک جال ہے جس میں مسلم لیگ جس کو اب سرکاری لیگ کہنا کسی طرح بھی بے جا نہیں، عوام مسلمانوں کو پھانس کر اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس سے زیادہ اس پاکستان کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ اقتدار کے بھوکے مسلم اقلیت کے صوبوں سے مایوس ہو چکے ہیں، اس لیے یہ عزت واقتدار کے متلاشی، مسلم اکثریت کے صوبوں کو اکھاڑہ بنانا چاہتے ہیں۔ اور میں آپ سے نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اگر ان کو پنجاب، بنگال اور سرحد وغیرہ میں ان کے حسبِ منشا اقتدار میسر آ گیا، جیسا کہ اس کی توقع ہے، تو یہ جاٹوں اور سکھوں سے نہیں اُلجھیں گے بلکہ یہ مسلمانوں ہی پر ظلم کریں گے اور انہی چنگیز خانی مظالم کا اعادہ کریں گے جو انہوں نے اب تک کیے ہیں۔

میرے عزیزو! بنگال کے قحط کو یاد کرو اور لاکھوں انسانوں کا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا دیکھو، سرکاری لیگ کے ذی اقتدار حضرات کے حسن انتظام کی داد دو، یہ سب کچھ مسلم لیگی وزارت میں ہوتا رہا۔ کیا دنیا کے ممالک کی کوئی ایک مثال پیش کر سکتے ہو کہ حکومت کے گودام غلہ سے بھرے ہوئے ہوں اور پھر رعایا کے لاکھوں انسان بھوک کا شکار ہو رہے ہوں، کیا اس سے بڑھ کر سفاکی کی کوئی مثال بتا سکتے ہو؟ اور نفع اندوزی کی اس سے بدتر کوئی نظیر ہو سکتی ہے۔ یہ ظلم بنگالی مسلمانوں پر ہوا، یا بنگالی ہندوؤں پر؟ یہ انتقام مسلمانوں سے کس جرم کی پاداش میں لیا گیا؟ کیا یہ لوگ مسلم اقلیت کے صوبوں کا ''انتقام'' اپنی ہندو رعایا سے لیں گے۔

''شیر بنگال'' کا نعرہ

مسٹر فضل حق جس زمانہ میں ''شیر بنگال تھے'' انہوں نے لکھنؤ میں ایک ایسا احمقانہ اعلان کیا تھا کہ اگر ہندو حکومتوں میں مسلمانوں پر ظلم ہوا تو میں اس کا انتقام اپنے صوبے کے ہندوؤں سے لوں گا لیکن اس کے بعد جب شیر بنگال وائسرائے سے ملے تو اپنی دماغی خرابی کا ذکر کر کے وائسرائے سے معذرت کر آئے اور پھر بنگال پہنچ کر ایک بیان دے دیا کہ تقریر کرتے وقت میرا دماغی توازن قائم نہیں رہتا۔ کیا یہ لوگ ہندوؤں سے انتقام لیں گے؟

اور جناب کے نقطہ نگاہ سے تو کانگریسی حکومتوں میں بڑے سنگین مظالم ہوئے، پھر ان ''سورماؤں'' کا اب کس نے ہاتھ پکڑا تھا، انہوں نے اپنے اپنے صوبوں کے غیر مسلموں سے اس کا انتقام کیوں نہیں لیا؟ جب انہوں نے اب انتقام نہیں لیا تو کیا پاکستان بن جانے کے بعد، جب ان کی ذمہ داری اور بڑھ جائے گی، اس وقت یہ انتقام لے کر دکھلائیں گے۔

حضرات! میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ لوگ انگریزوں کے مقابلہ میں تو بزدل ہیں ہی، لیکن یہ ہندو کا مقابلہ کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتے، ہاں! یہ اپنوں پر خوب ظلم کرنا جانتے ہیں۔

خدا کے واسطے مجھے بتاؤ، بنگال میں قحط کی مصیبت سے مسلمان زیادہ مرے یا ہندو؟ صوبہ سندھ میں پیر پگاڑو اور اس کے متعلقین جو تباہ کیے گئے وہ ہندو تھے یا مسلمان؟ وہ کیسے ہی برے تھے، لیکن خوارج سے تو زیادہ برے نہ تھے۔ پھر امام محمد کی ''سیر کبیر'' سے فتوا دینے والے اس وقت کہاں تھے؟ ان کی آنکھوں کے سامنے صوبہ سندھ کی ایک مسلم قوت بنوذی رعب و ہیبت تھی، ختم کی جارہی تھیں لیکن یہ بزرگ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے اور ''سیر کبیر'' ان کو میسر نہ آئی۔ آج نہ جبکہ کوئی تباہی ہے، نہ جہاد بالسیف ہے، نہ کہیں مسلمانوں کی شوکت کو صدمہ پہنچ رہا ہے، یہ بزرگ اپنے گوشے سے امام محمد کی سیر کبیر سے استدلال کرتے ہوئے، قادیانیوں اور کمیونسٹوں اور علی الاعلان فاسقوں کی حمایت کرنے اور ان کے جھنڈے تلے بھولے بھالے مسلمانوں کو جمع کرنے کی غرض سے نکل آئے ہیں۔

اچھا اگر صوبہ سندھ کے "حر" خوارج سے بھی بدتر تھے اور ان کی حمایت کرنا اسلام کے خلاف تھا تو کیا خاکسار بھی خوارج سے برے تھے کہ ان کا خون لاہور کی سڑکوں پر بہتا ہوا دیکھ کر، تم خاموش رہے اور تم کو سیر کبیر کا جزئیہ نظر نہ آیا۔

اچھا، اگر خاکسار برے تھے تو کیا "آلے" کے مسلمان اور "پانی پت" کے مسلمان بھی خارجیوں سے بدتر اور زیادہ گناہگار تھے؟

سبحان اللہ! کیا لوگ ہیں، کہ جب کبھی ان پر حق ظاہر ہوتا ہے تو انگریزوں کی حمایت میں ظاہر ہوتا ہے یا سرکاری پارٹی کی حمایت میں ظاہر ہوتا ہے۔

میرے عزیزو! تم لاکھوں مسلمانوں کو بھوکا مار دو، تو تم پر کوئی الزام نہیں، تم حروں کی جماعت کو تباہ کر دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں، تم خاکساروں کو لاہور کی سڑکوں پر اور "آلے" کے مسلمانوں کو اور پانی پت کے مسلمانوں کو لہولہان کرا دو اور شہید کرا دو تو بے قصور ہو۔ تمہاری حکومت صوبہ سرحد میں سکھوں کا مندر تعمیر کرا دے تو قابل تحسین وصد مبارک باد، بھلا تم اور غریب مسلمانوں کا بدلہ تم اور مسلم اقلیت کا انتقام، تم اور اسلامی حکومت، تم اور قرآنی حکومت کا استقلال، اللہ اللہ "یہ منہ اور مسور کی دال"

قرآن نے تمکین فی الارض کی یہ شرط بیان کی ہے۔

الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۃ الحج ۲۲:۴۱)

"ان لوگوں کو اگر ہم زمین میں اختیار دے دیں، تو وہ نمازوں کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک باتوں کا حکم کریں اور بری باتوں سے لوگوں کو منع کریں۔"

اب آپ خیال کیجیے جو لوگ نماز اور زکوٰۃ کا مذاق اُڑائیں، علی الاعلان فسق و فجور کا ارتکاب کریں، نیک کاموں کو جانتے ہی نہ ہوں اگر ایسے بزرگوں کو کسی حصۂ زمین میں حاکمانہ اختیارات مل جائیں تو یہ کیا کریں گے؟

آپ کے اسی میرٹھ میں حضرت مولانا شبیر احمد مدظلہ نے لیگی لیڈروں کو جو پندونصائح

اپنے خاص انداز میں فرمائے ہیں۔ اگر یہ لوگ مولانا کی پچیس فیصدی نصیحتوں پر عمل کر کے بھی دکھادیں تو میں سمجھوں کہ یہ واقعی اسلام کی خدمت کرنے والے ہیں اور واقعی یہ اسلام سے محبت کرتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو حضرت مولانا مدنی مدظلہٗ سے نفرت و دشمنی ہے تو مولانا شبیر احمد صاحب سے تو محبت ہے، ان کو تو سچا اور پکا عالم مانتے ہیں۔ ان کے ہی کہنے پر عمل کر کے دکھاؤ، ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے محض ایک گوشہ نشیں عالم کو اپنی اغراض مشئومہ کا آلہ کار بنایا ہے اور تم اس کو اس کے ضعف و ناتوانی، اور بیماری کے باوجود اس لیے، لیے لیے پھرتے ہو کہ شومیٔ قسمت سے وہ تمہارے مطلب کی کہہ رہا ہے۔ ورنہ تم تو علماء کے سایہ سے بھاگنے والے لوگ ہو۔ تم نے تو علماء کے وقار کو ختم کرنے اور مٹانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ سرسیّد کے منحوس دور سے آج تک تمہارا ایک ہی مطمح نظر رہا ہے کہ جس طرح ہو سکے مذہب کی آواز کو دباؤ اور اسی فریضہ کی آج کل کمیونسٹ نوجوانوں سے تکمیل کرائی جارہی ہے۔

یہ لوگ مولانا شبیر احمد صاحب سے بھی جب ہی تک عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں، جب تک وہ اُس پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں جس کا تخیل ان کے اکابر سے چلا آرہا ہے اور وہ اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھ کر اس کی تائید کر رہے ہیں کہ مسٹر جناح بھی شمال مغربی ہندوستان میں وہی پاکستان قائم کرنا چاہتے ہیں جو مولانا (شاہ) اسماعیل (دہلوی) اور حضرت سیّد احمد بریلوی قائم کرنے تشریف لے گئے تھے، یا جس پاکستان کو قائم کرنے کی غرض سے حضرت مرشدی و مولائی شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان اور ترکستان بھیجا تھا۔ جس دن مولانا شبیر احمد صاحب کو اس حقیقت کا انکشاف ہو جائے گا کہ لیگیوں کے تصور میں بھی وہ پاکستان نہیں ہے جو ان کے بزرگوں کے پیش نظر تھا۔ یہ تو بدترین قسم کی یورپین جمہوریت کا ایک مشترکہ ملک ہوگا، جس میں عوام کی حکومت ہوگی اور ہندو، مسلمان اور سکھ مل کر اپنا قانون بنائیں گے اور وہ ایسا ہی پاکستان ہوگا جیسا انگلستان میں ''السٹر'' ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ مولانا شبیر احمد صاحب ایک منٹ بھی اس سرکاری لیگ کے پیچھے پیچھے دوڑتے نہ پھریں گے اور وہ وقت انشاء اللہ جلد یا بدیر ضرور آکر رہے گا اور مجھ کو توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا اسماعیل شہید اور مولانا شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ اجمعین کے نام لیواؤں کو زیادہ دنوں تک

گمراہی اور کج روی پر قائم نہیں رکھے گا۔ کیونکہ اس خاندان کے بعض شاگرد غیر مقلد تو ضرور ہو گئے ہیں لیکن انگریز پرست اور انگریزی اقتدار کے حامی یا سرکار پرستوں کے طرف دار نہیں ہوئے ہیں اور اگر کبھی ان بزرگوں کا کوئی نام لیوا، بے راہ ہوا بھی ہے تو ان بزرگوں کے روحانی تصرفات نے اس کو سنبھال لیا ہے، مگر یہ کہ وہ اپنی قسمت ہی میں گمراہی درج کرانے والا ہو، تو دوسری بات ہے خدا تعالیٰ جس دن وہ مبارک ساعت لائے گا اور مولانا شبیر احمد صاحب اس سرکاری ٹولی سے کٹ کر اپنے بزرگوں کے سچے نام لیواؤں کی طرف آئیں گے، اُس دن دیکھنا، یہ مولانا شبیر احمد صاحب کے ثنا خواں کیسی گل فشانی کرتے ہیں اور میرٹھ کے مولانا عارف اللہ صاحب مولانا شبیر کی منقبت میں کیسا قصیدہ پڑھتے ہیں۔ تربصوا فانی معکم من المتربصین۔(۱) (تو اب نتیجے کا انتظار کرو، ہم بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں۔) (سورۃ التوبہ (۹):۹۳)

دو قوموں کا نظریہ

حضرات! چونکہ پاکستان کی بحث میں ہندوستان کی دو قوموں کا تذکرہ بھی آتا ہے اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس پر بھی آپ سے کچھ عرض کروں۔ علیحدگی کی وجوہ بیان کرنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں، اس لیے ان کو الگ الگ ہونا چاہیے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ دلیل بھی بہت کمزور ہے۔

دو قومیں ہونے کے باوجود بھی آپس میں مل جل کر رہ سکتی ہیں اور ہمیشہ رہا کرتی تھیں۔ اگر یہ قاعدہ بنا لیا جائے کہ دو قومیں ایک ملک، یا ایک سرزمین میں آباد ہی نہیں ہوسکتیں تو سب سے پہلے پارسیوں کی ایک حکومت قائم کیجیے، پھر سکھوں کو علیحدہ کیجیے۔ بھلا یہ بھی کوئی دلیل ہے کہ جن دو قوموں کے کھانے، پینے، مرنے جینے کے ڈھنگ جدا ہوں، ان کو زمین کے الگ منطقوں پر بساؤ۔ اگر دو قوموں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی سرزمین پر مل کر بیٹھ ہی نہیں سکتیں تو آخر کونسلوں اور میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں تم دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کیوں بیٹھے ہو؟ یہ کیسی لغو اور پوچ دلیل ہے جس کو تم نے پاکستان کا مبنیٰ قرار دیا ہے۔

دوقوموں کا معیار کیا ہے؟

میرے عزیزو! سب سے پہلے ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ قوم کا اصلی معیار کیا ہے اور قومیں تقسیم کس طرح ہوتی ہیں؟ یوں تو آپ سب ہی جانتے ہیں کہ ہم سب ایک نفس واحدہ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد اور سب ایک باپ کے بیٹے ہیں، یا بقول مؤرخین ساری دنیا کے انسان، حام، سام، یافث کی اولاد ہیں۔ ان سب کو متحدہ قومیت کا لقب بھی دیا جا سکتا ہے اور ان کی علیحدہ علیحدہ تقسیم بھی کی جا سکتی ہے۔ دنیا کی کسی قوم میں بھی آپ کوئی چیز ایسی نہیں بتا سکتے جو "مابہ الاشتراک" نہ ہو اور ایسی بھی کوئی دو قومیں نہیں، جن میں کوئی چیز "مابہ الامتیاز" نہ ہو پھر ایسی حالت میں کہ جب ہر قوم یا ہر گروہ میں کوئی نہ کوئی چیز ایسی مخصوص موجود ہے جو دوسرے فرقہ یا گروہ میں نہیں، نہ تو اس طرح ہندو مسلمانوں کا کیا سوال ہے، خود مسلمانوں میں سینکڑوں قومیں نکل آئیں گی، اور ہندوؤں میں تو اس قسم کی قوموں کا کوئی شمار ہی نہیں۔

اگر "وطن" کا اعتبار کرو، تو ہندو مسلمانوں کو "دو قومیں" کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر "نسل" کا اعتبار کرو، تو جو قومیں ہندوؤں سے مسلمان ہوئی ہیں، ان کی متحدہ قومیت میں تو کوئی شک ہی نہیں، البتہ جو قومیں عرب سے آئی ہیں ان کو دوسری قوم کہہ دو تو مضائقہ نہیں۔ اگر "زبان" کے اعتبار سے دو قومیں بنتی ہیں تو بنگال کے ہندو مسلمان ایک قوم، رہا "مذہب" کے اعتبار سے قوموں کی تقسیم، تو وہ بھی ایسی کمزور بات ہے جو چلنے والی نہیں، اور خود قرآن حکیم کی تصریحات اس کے منافی ہیں۔

غرض میں نے اس مسئلہ پر جس قدر غور کیا میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے موافق جب چاہتا ہے تقسیم کر لیتا ہے اور جب چاہتا ہے متحد کر بیٹھتا ہے۔ لوگوں کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں جس سے ابولہب اور ابو طالب اور حضرت عباس اور حضرت حمزہ دو قوموں کے افراد بن جائیں اور نہ ایسا کوئی معیار ہے جس سے انصار اور مہاجرین ایک قوم سمجھے جائیں۔

اگر کھانے پینے کی مطابقت سے ایک قوم بنتی ہے، تو پھر مسلمان اور عیسائی ایک قوم شمار

کیے جائیں اور اگر تدفین کی مناسبت سے قوم بنتی ہو تو جاپانی اور ہندوستان کے مسلمان اور عیسائیوں کو ایک قوم سمجھنا چاہیے اور اگر چھوت چھات کی بنا پر کسی ملک کے باشندوں کو دو قومیں کہا جا سکتا ہے تو پھر ہندو بھی ایک قوم نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوؤں میں چھوت چھات کا ایسا مرض ہے کہ وہ صرف مسلمانوں ہی کے ساتھ ایسا نہیں کرتے بلکہ خود آپس میں بھی ان کے ہاں یہ چھوت چھات جاری ہے۔

یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ ہندو مسلمان دو قومیں ہیں، مسلمان ایک قوم، ہندو ایک قوم، لیکن جناب نے کبھی اس کی تحقیقات بھی کی ہے اگر اس قسم کے معمولی فرق پر قوموں کی تقسیم رکھی گئی تو خدا جانے ہندوستان میں کس قدر قومیں پیدا ہو جائیں گی۔ اس لیے ہمیں جذبات سے علیحدہ ہو کر غور کرنا چاہیے۔

سرسیّد کا نظریہ

سرسیّد مرحوم نے ایک موقعہ پر پنجاب کے سفر میں ہندوؤں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ''آپ نے جو لفظ اپنے لیے ''ہندو'' کا استعمال کیا ہے وہ میری رائے میں درست نہیں ہے، کیونکہ ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں ہے، بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں ہندو نہیں سمجھتے۔'' (روشن مستقبل ص ۱۷۲)

سرسید کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وطن کے اشتراک کو ایک قوم ہونے کے لیے کافی سمجھتے تھے اور یہ بات بڑی حد تک ہے بھی صحیح۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اگر معمولی فرق سے قوموں کی تقسیم شروع ہو جائے تو بڑی مشکل ہوگی۔ آپ مسلمانوں ہی میں دیکھئے، انصاری ایک قوم، پنجابی ایک قوم، قریشی ایک قوم، شیعہ ایک قوم، سنی ایک قوم، قادیانی ایک قوم، بنگالی ایک قوم۔ جب آپ کے ہاں یہ حالت ہے، تو ہندوؤں کا کچھ کہنا ہی نہیں۔ ان کے

ہاں تو خدا جانے کتنی قومیں شامل ہیں، اگر ان تمام قوموں کو علیحدہ علیحدہ ایک قوم مان لیا جائے اور ان میں سے ہر ایک یہ مطالبہ شروع کردے کہ جناب مجھے بھی ''حصہ رسدی'' آزادی ملنی چاہیے، میں کسی دوسری اکثریت کے ماتحت زندگی نہیں گزار سکتا، تو میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک ایک ضلع بھی، اس ملک کی ایک ایک قوم کو دیا گیا، تو ہندوستان پورا بٹ جائے گا اور قومیں باقی رہ جائیں گے۔

پھر بقول مولانا سجاد مرحوم ''تم کتنی ہی ریاستیں، یا حکومتیں یا فیڈریشن بنالو پھر تمہیں ایک مرکزی حکومت بنانی ہی پڑے گی، جو تم سب پر کنٹرول رکھے گی۔ ورنہ آپس میں لڑو گے یا کسی کو روس کھا جائے گا اور کسی کو جاپان وچین کھا جائے گا اور کسی کو نیپال دبالے گا۔ غرض ان چھوٹی ریاستوں کا تحفظ کون کرے گا یا پھر انگریز کو قیامت تک یہاں مسلط رکھنا پڑے گا''۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ مذہب کے اعتبار سے بھی قوموں کی تقسیم کرنا غلط ہے۔ قرآن نے ان تمام پیغمبروں کو جن قوموں کی طرف بھیجا گیا ہے ان کو ان کا ہم قوم و ہم زباں بتایا ہے۔ فرماتے ہیں:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَسُوْلٍ اِلَّا بلسان قومِهٖ (سورہ ابراہیم (۱۴):۴)

یعنی ''ہم نے کسی رسول کو بھی نہیں بھیجا، مگر یہ کہ وہ اپنی قوم کا ہم زبان ہوتا تھا۔''

اور یہ تو آپ کو ہر پیغمبر کی تقریر میں ملے گا۔

یاقوم انی لکم نذیر مبین (سورہ نوح (۷۱):۲)

''اے میری قوم! میں تم کو صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔''

یہ قوم کا لفظ جیسا کہ آپ کو دس ہزار سال پیشتر کے پیغمبر حضرت نوح کی تقریر میں ملے گا، اسی طرح خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے کلماتِ طیبات میں بھی ملے گا۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِ قومِیْ فانهم لا یعلمون

یا اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما یہ لوگ نا سمجھ ہیں۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں تو قوم سے بڑھ کر قرابت کے نام پر بھی اپیل موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

قُلْ لَا اسئلکم عَلَیْهِ اجراً اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی. (سورۃ الشوریٰ (۴۲):۲۳)

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اپنے ترجمہ میں فرماتے ہیں۔تو کہا میں مانگتا نہیں تم سے اس پر کچھ نیگ، مگر دوستی چاہیے ناتے میں۔مولانا تھانوی فرماتے ہیں: آپ یوں کہیے میں تم سے اور کچھ مطلب نہیں چاہتا، بجز رشتہ داری کی محبت کے۔

تو اگر کافر رشتہ داروں سے قرابت اور ناتے کا نام لے کر اچھے برتاؤ اور محبت و ہمدردی کی اپیل کی جاسکتی ہے، تو قوم کا لفظ تو اس سے ہلکا ہی ہے۔ہاں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک متحدہ قومیت اور ہم وطن ہونے کے باوجود، اس مغایرت کی وجہ سے جو اسلامی تمدن اور تہذیب نے پیدا کردی ہے، ان کو ''کفارِ ہند'' اور ہم کو اسلامیانِ ہند کہا جائے۔''جیسا کفارِ مکہ'' اور ''مسلمانانِ مکہ'' یا جیسے کفارِ عرب اور ''مسلمانانِ عرب'' یا جس طرح کفارِ قریش اور قریشی مسلمان۔

اس اصطلاح پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ بکثرت شائع اور ذائع ہے۔کفارِ عرب کو ان کے کفر نے ''عربی'' ہونے سے خارج نہیں کیا، نہ ان کو ''مکی'' ہونے سے خارج کیا۔ بلکہ ان کو قریشی ہونے سے بھی خارج نہیں کیا بلکہ پیغمبر کی قرابت داری اور رشتہ داری سے بھی نہیں نکالا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اسلام نے ہم کو ایک خاص تہذیب و تمدن کا مالک بنادیا ہے اور اعمال و عقائد میں ہماری خاص رہنمائی کی ہے اور اسلام سے ہم نے وہ وہ نعمتیں حاصل کیں جس سے افسوس ہے کہ ہماری ہم وطن قوم ابھی تک محروم ہے، مگر ہم نا اُمید نہیں ہیں، اور ہم کو یقین ہے کہ ہمارے ہندو بھائی جس قدر اسلامی تعلیم کا مطالعہ کریں گے اسی قدر وہ اسلامی تہذیب کے قریب ہوتے جائیں گے۔

میں ہندوؤں سے نا اُمید نہیں ہوں، کیونکہ میری تعداد اور میری مردم شماری کو، مشرکوں نے اسلام قبول کر کے بڑھایا ہے۔اس لیے میں ہندوؤں سے برسرِ پیکار ہونے کو اسلامی تبلیغ کے لیے ضرر رساں سمجھتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوؤں نے اسلام قبول کرنے میں جس قدر تاخیر کی، اس کی بہت بڑی ذمہ داری ہماری بداعمالی اور بداخلاقی پر ہے۔ورنہ اسلام بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ اس کو قبول کرنے سے کوئی سمجھدار اور شریف انسان انکار کرسکتا ہے؟ اور

مجھے تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ جو لوگ ہندوؤں سے منافرت پیدا کرنے میں پیش پیش ہیں اور مسلمانوں کے تمدن اور کلچر کے محافظ بننے کے مدعی ہیں، خود ان کی حالت یہ ہے کہ وہ یورپین تہذیب وتمدن کے یہاں تک دلدادہ ہیں کہ انہوں نے انگریزوں کا صرف فیشن ہی نہیں قبول کیا، بلکہ اپنے ملازموں کو بھی حکم دے رکھا ہے کہ ہم کو ''صاحب'' کہا کرو۔ جب اُن کی کوٹھی پر جایئے تو چپڑاسی کہتا ہے ''صاحب سو رہا ہے''، ''صاحب گیا ہوا ہے''، ''صاحب اس وقت ملنا نہیں چاہتا''۔ تم میں اور انگریزوں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ وضع قطع، چال ڈھال، بول چال، کوٹ پتلون، سگرٹ اور سگار، شراب اور ڈنر، وہ کون سی بات ہے جس میں تم یورپین لوگوں کے ہم شکل نہیں ہو۔ تو کیا تم اور انگریز ایک قوم ہو۔

اگر صورت قدرتی طور پر تمہاری سیاہ نہ ہوتی تو تم نے انگریز بننے میں کون سی کسر اُٹھا رکھی ہے۔ اس تہذیب وتمدن کی یکسانیت اور یگانگت کے باوجود تم کو کانگریس اور گاندھی ٹوپی سے نفرت ہے۔ ہر پلیٹ فارم پر ہندوؤں کے ساتھ بیٹھتے ہو، ملتے جلتے ہو، مشترکہ سب کمیٹیوں میں شریک ہوتے ہو، دعوتوں میں جاتے ہو، ایک میز پر گوشت خور ہندوؤں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہو، مگر کانگریسی پلیٹ فارم پر بیٹھنے والے مسلمانوں کو کافر کہتے ہو، کیونکہ تم نے ایک نئی قسم کا کفر ایجاد کیا ہے اور وہ کفر گورنمنٹ برطانیہ کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے منکر، حضرت سیّدنا صدیق اکبر اور فاروق اعظم کے دشمن تمہارے نزدیک مسلمان، مذہب کا مذاق اُڑانے والے، قرآن اور شریعت اسلامی کو فرسودہ کہنے والے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خدائے برتر وبزرگ کی شان میں گستاخی کرنے والے، غرض ہر قسم کا کافر تمہارے نزدیک مسلمان اور گورنمنٹ برطانیہ کا نکالنے اور اپنے ملک کو حکومت متسلطہ سے آزاد کرانے والا مسلمان کافر!! بہر حال میں نے آپ کے سامنے تفصیل عرض کر دی ہے۔ اگر آپ ہندو مسلمانوں کو دو قومیں سمجھتے ہیں جس کا کوئی شرعاً، عقلاً اور عرفاً ثبوت نہیں ہے، تب بھی میں کہتا ہوں کہ علیحدگی ضروری نہیں، کیا دو قومیں مل کر نہیں رہا کرتیں اور کیا دو قوموں کا اشتراک عمل حرام وناجائز ہے اور اگر یہ ایسا حرام وناجائز ہے تو اس وقت اس حرام کا ارتکاب کیوں کیا جا رہا ہے اور کیوں مسلمان میونسپلٹیوں، ڈسٹرک بورڈوں، اسمبلیوں اور مرکزی اسمبلی سے یہ کہہ

کر باہر کیوں نہیں نکل آتے کہ ہم ہندوؤں کے ساتھ مل کر حکومت نہیں چلا سکتے، کیونکہ یہ ہمارے نزدیک ناجائز ہے۔ غضب خدا کا دونوں مل کر ''انگریزی حکومت'' تو چلا رہے ہیں، لیکن جب اپنی حکومت ہو جائے گی تو ہندوؤں سے مل کر اس اپنی حکومت کا چلانا حرام ہو جائے گا اور مسلمان شرعاً اس بات کے لیے مجبور ہوں گے کہ ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر حکومت کریں۔ اس قسم کے رکیک دلائل کو اسلامی دلائل کہتے ہوئے ان ''علماءِ سو'' کو شرم نہیں آتی اور جب دو قومیں تسلیم کرتے ہوئے بھی علیحدگی ضروری نہیں تو متحدہ قومیت کی حالت میں علیحدگی تو بالکل ہی بے معنی اور مضحکہ خیز چیز ہے۔

میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ اسلام نے اپنی ایک برادری قائم کی ہے اور ایک خاص تہذیب اور تمدن کا پابند کر دیا ہے اور سب مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیا ہے اور ان میں سیاہ و سفید اور عرب و عجم کا فرق مٹا دیا ہے لیکن باوجود اس اسلامی یگانگت اور برادری کے پھر بھی کوئی ایسی تصریح ابھی تک نظر سے نہیں گزری، جس سے کفر و ایمان کی تفریق کے علاوہ، کسی قومی تفریق کا اظہار ہوتا ہو، یہ ہو سکتا ہے کہ ایک قوم یا ایک نسل، یا ایک وطن کے چند افراد مسلمان ہوں اور چند افراد کافر ہوں لیکن میرے نزدیک یہ کوئی اہم چیز نہیں ہے، ہندوستان کی رہنے والی آبادی کو آپ ایک قوم سمجھیں یا دو قومیں کہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ مسلم لیگ کے مطالبہ کے بموجب ہندوستان کی تقسیم مسلمانوں کے لیے مفید ہے یا مضر؟ آپ کو اس وقت صرف اسی بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور آپ کو اپنے ضمیر کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ جس مفروضہ پاکستان کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، وہ کس حد تک مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے اور کہاں تک نفع رساں ہے۔

ایک اصولی اختلاف

معزز حاضرین! اس تمام کشمکش کے پس منظر ایک ایسا اصولی اختلاف کارفرما ہے جس کا طے کرنا ضروری ہے اور وہ ایک ایسا اختلاف ہے جس میں بڑے بڑے معقول اور اچھے اچھے لوگ مبتلا ہیں اور اس کا کوئی حل...... ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا جس سے فریقین مطمئن ہو سکیں۔

تم میں سے ایک فریق تو وہ ہے جو ہندو کے اقتدار کو پسند نہیں کرتا اور ہندو کے اقتدار کے مقابلے میں، انگریزی اقتدار کو بہتر سمجھتا ہے اور دن رات اسی کی کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح انگریز کا جھنڈا اور اس کا اقتدار نیچا نہ ہونے پائے۔ وہ یہی غرض لے کر اسمبلی میں جانا چاہتا ہے۔ انہی اغراض کے ماتحت قانون ساز کونسلوں میں جانے کی سعی کرتا ہے اور انہی جذبات کے ماتحت میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے اندر جانا چاہتا ہے۔ مرکزی اسمبلی کی کارروائیاں تو آپ کے سامنے ہیں، کس طرح مسلم لیگ کے ممبروں نے کھلم کھلا حکومت کا ساتھ دے کر بار بار کانگریس کو نیچا دکھانے کی ناکام کوشش کی۔ تحریکِ صدارت سے لے کر ۳۰ جنوری ۱۹۴۶ء تک کی کارروائی پڑھیے، آپ کو ہر موقع پر انگریزی حکومت کی حمایت کا جذبہ کار فرما ملے گا، اور آخر ایک دن مسلم لیگ کی جدوجہد نے کامیابی حاصل کر ہی لی، اگرچہ جس تحریک پر کامیابی حاصل کی وہ کامیابی نہایت قابل افسوس ہے۔ کیونکہ لیگی ممبروں نے ایک ایسے ظلم اور ناانصافی کی حمایت کر کے گورنمنٹ کی بات اونچی کی جسے مسلمان تو مسلمان کوئی باغیرت انسان بھی پسند نہیں کر سکتا اور تحریکوں میں بھی لیگی ممبر گورنمنٹ کی حمایت کرتے رہے۔ مگر مجھے ان پر اس قدر افسوس نہیں جتنا بہادر گڑھ کیمپ کے ہندوستانی فوج کے اُن مظلوم قیدیوں کے خلاف گورنمنٹ کی حمایت کرنے کا افسوس ہے۔ جن پر واقعی نہایت بے دردانہ مظالم برپا کیے جا رہے ہیں اور ان مسلمانوں نے یہ جانتے ہوئے حمایت کی کہ ان قیدیوں میں چالیس فیصدی وہ مسلمان بھی ہیں جو ہندوستان کی آزادی کے لیے مسٹر سوباش کی آزاد ہند فوج میں شریک ہوئے تھے اور لطف یہ ہے کہ رائے شماری کے وقت دیوان چمن لال نے ان بدنصیبوں کو آگاہ بھی کیا کہ ان میں مسلمان بھی ہیں لیکن ان بے رحموں کو انگریزوں کی خوشنودی اور اپنی عزت کے مقابلہ میں کسی مظلوم مسلمان کی پرواہ کب ہو سکتی تھی۔ یہی وہ ناپاک جذبہ ہے جس پر مسلم لیگ فخر و مباہات کا اظہار کرتی ہے اور انگریزوں کو جتوا کر تالیاں بجاتی اور ''مبارکباد'' قبول کرتی ہے۔ آپ کبھی اسمبلی میں جا کر تماشہ دیکھیے تو آپ کو معلوم ہو کہ یہ مسلمانوں کی ہمدردی اور خیر خواہی کے مدعی کس طرح انگریزی حکومت کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جب انگریز ہارتا ہے تو کانگریس بنچ والے تالیاں بجا کر نعرے ہائے تحسین

تم میں سے ایک فریق تو وہ ہے جو ہندو کے اقتدار کو پسند نہیں کرتا اور ہندو کے اقتدار کے مقابلے میں، انگریزی اقتدار کو بہتر سمجھتا ہے اور دن رات اسی کی کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح انگریز کا جھنڈا اور اس کا اقتدار نیچا نہ ہونے پائے۔ وہ یہی غرض لے کر اسمبلی میں جانا چاہتا ہے۔ انہی اغراض کے ماتحت قانون ساز کونسلوں میں جانے کی سعی کرتا ہے اور انہی جذبات کے ماتحت میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے اندر جانا چاہتا ہے۔ مرکزی اسمبلی کی کارروائیاں تو آپ کے سامنے ہیں، کس طرح مسلم لیگ کے ممبروں نے کھلم کھلا حکومت کا ساتھ دے کر بار بار کانگریس کو نیچا دکھانے کی ناکام کوشش کی۔ تحریکِ صدارت سے لے کر ۳۰ جنوری ۱۹۴۶ء تک کی کارروائی پڑھیے، آپ کو ہر موقع پر انگریزی حکومت کی حمایت کا جذبہ کار فرما ملے گا، اور آخر ایک دن مسلم لیگ کی جدوجہد نے کامیابی حاصل کر ہی لی، اگرچہ جس تحریک پر کامیابی حاصل کی وہ کامیابی نہایت قابل افسوس ہے۔ کیونکہ لیگی ممبروں نے ایک ایسے ظلم اور ناانصافی کی حمایت کر کے گورنمنٹ کی بات اُونچی کی جسے مسلمان تو مسلمان کوئی باغیرت انسان بھی پسند نہیں کر سکتا اور تحریکوں میں بھی لیگی ممبر گورنمنٹ کی حمایت کرتے رہے۔ مگر مجھے ان پر اس قدر افسوس نہیں جتنا بہادر گڑھ کیمپ کے ہندوستانی فوج کے اُن مظلوم قیدیوں کے خلاف گورنمنٹ کی حمایت کرنے کا افسوس ہے۔ جن پر واقعی نہایت بے دردانہ مظالم برپا کیے جا رہے ہیں اور ان مسلمانوں نے یہ جانتے ہوئے حمایت کی کہ ان قیدیوں میں چالیس فیصدی وہ مسلمان بھی ہیں جو ہندوستان کی آزادی کے لیے مسٹر سوباش کی آزاد ہند فوج میں شریک ہوئے تھے اور لطف یہ ہے کہ رائے شماری کے وقت دیوان چمن لال نے ان بدنصیبوں کو آگاہ بھی کیا کہ ان میں مسلمان بھی ہیں لیکن ان بے رحموں کو انگریزوں کی خوشنودی اور اپنی عزت کے مقابلہ میں کسی مظلوم مسلمان کی پرواہ کب ہو سکتی تھی۔ یہی وہ ناپاک جذبہ ہے جس پر مسلم لیگ فخر و مباہات کا اظہار کرتی ہے اور انگریزوں کو جتوا کر تالیاں بجاتی اور ''مبارکباد'' قبول کرتی ہے۔ آپ کبھی اسمبلی میں جا کر تماشہ دیکھیے تو آپ کو معلوم ہو کہ یہ مسلمانوں کی ہمدردی اور خیر خواہی کے مدعی کس طرح انگریزی حکومت کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جب انگریز ہارتا ہے تو کانگریس بنچ والے تالیاں بجا کر نعرے ہائے تحسین

بلند کرتے ہیں اور جب انگریز جیتتا ہے تو آپ کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے ارکان خوب تالیاں بجاتے ہیں اور ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور ہوم ممبر کی طرف دیکھتے جاتے ہیں۔ غرض ایک فریق کے اقوال وافعال بالکل اس اندرونی جذبہ پر شاہد ہیں کہ وہ ہندو اقتدار کے مقابلہ میں انگریزی حکومت اور انگریزی اقتدار کو نہ صرف پسند کرتا ہے بلکہ اس کی حمایت کرتا ہے اور انگریزی اقتدار کو ہر پہلو سے بچانا چاہتا ہے اور وہ اپنے عزائم میں یہاں تک پختہ ہے کہ اگر خدانخواستہ کانگریس نے کسی وقت کھلی بغاوت کی تو یہ فریق انگریز کے ساتھ ہو کر یونین جیک کے سائے تلے کانگریس سے لڑے گا اور مرکزی اسمبلی کی طرح، میدانِ جنگ میں بھی گورنمنٹ کو جتوانے اور فتحیاب کرانے کی پوری کوشش کرے گا۔ یہ اپنی خیر اور اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ اس ملک میں انگریزی اقتدار جوں کا توں قائم رہے۔ جو بات اس فریق کے لوگ کبھی دبے دبے کہتے تھے، اب علی الاعلان ممبروں پر اور پلیٹ فارموں پر کہہ رہے ہیں۔ اب تک حکومت کے یہ کاسہ لیس جو بات پوشیدہ کہا کرتے تھے، وہ اعلانیہ کہہ رہے ہیں اور کر کے دکھا رہے ہیں۔

دوسرا فریق

اسی کے ساتھ مسلمانوں کا ایک فریق وہ بھی ہے جو انگریزی حکومت کے اقتدار کو اس ملک سے ہمیشہ کے لیے ہر قیمت پر ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ کانگریس کے اقتدار کو انگریزی اقتدار پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کا جذبہ آپ کے نزدیک قابل تعریف ہو یا نہ ہو، یہ ہے کہ اگر دنیا کا یہ اصول صحیح ہے کہ پانچ کروڑ مسلمانوں کے بچانے کے لیے تین کروڑ مسلمانوں کو قربان کر دیا جائے، تو یہ کیوں نہیں تسلیم کرتے؟ کہ عالم اسلامی کے چالیس کروڑ فرزندانِ توحید کو بچانے کے لیے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو قربان کر دیا جائے، وہ کانگریس کو ہر حالت میں انگریز سے اُونچا اور بالاتر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کانگریس اگر صرف ہندوؤں جماعت ہوتی، تب بھی ہم تمام ہندوستان میں اُس کی حکومت کو، انگریزی حکومت کے مقابلے میں برداشت کر لیتے اور ایسی حالت میں جبکہ کانگریس میں، مسلمان بھی ہیں، خواہ ان کی تعداد بقول مسٹر جناح

اتنی ہی ہو۔ جیسے آٹے میں نمک، وہ بالکل مطمئن ہیں اور کانگریسی اقتدار سے خائف نہیں ہیں، ان کے نزدیک اس ملک کی غربت اور افلاس کا علاج، سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ اب جس طرح ہو سکے اس ملک سے اجنبی حکومت کے اقتدار کو رخصت کیا جائے اور اس ملک میں ہندوستانیوں کی حکومت قائم کی جائے۔ خواہ ہم کو تنہا حکومت سے لڑنا پڑے یا ہم کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر لڑنا پڑے۔ انگریز نے اس ملک میں لوٹ کھسوٹ کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اس لوٹ کو کسی نہ کسی طرح بند کرنا چاہیے، خواہ ہم کو کچھ بھی کرنا پڑے۔

انگریز دُنیا بھر سے ہندوستان کے نام پر قرض لیتا ہے اور اس ملک کی دولت سے اس قرضہ کو ادا کرتا ہے اور اس بے رحم کو اتنا رحم نہیں آتا کہ میری اس لوٹ سے اس ملک کے چالیس کروڑ باشندوں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک طرف ہندوستان کے ساتھ اس کا یہ سلوک ہے اور دوسری طرف عرب اور شام ولبنان اور مصر اور جاوا اور فلسطین وٹرکی کے ساتھ جو کچھ اب تک کیا ہے اور جو کر رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اس لیے جس بھاؤ ہو، اس کے اقتدار کو یہاں سے ختم کراؤ اور خواہ یہاں کسی کی حکومت ہو جائے، مگر ہو ہندوستانیوں کی۔

میرے عزیزو! یہ اصولی اختلاف ہے جس کا کوئی حل نہیں نکلتا۔ میں مانتا ہوں کہ دونوں فریقوں میں غلو ہے جس طرح انگریزی حکومت کی طرفداری اور حکومت متسلطہ کی حمایت، پرلے درجہ کی غداری، ناسپاسی اور خدا کی نافرمانی اور خدا کے چالیس کروڑ ہندو مسلمانوں پر زیادتی اور بے ایمانی ہے۔ اس طرح دوسرے فریق کا جذبہ اگرچہ لاکھ قابل تحسین سہی، لیکن مستقبل سے بالکل آنکھیں بند کر کے اس پر بھی عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ میں اُس فریق کے جذبہ آزادی کو قابل تعریف سمجھتا ہوں اور اُس کو سراہتا ہوں اور بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہندوؤں کو انتہائی تنگدل اور تنگ ظرف اور نااہل سمجھنے کے باوجود ہندو اقتدار کو انگریزی اقتدار پر ترجیح دیتا ہوں اور ملکی لوگوں کے اقتدار کو غیر ملکی حکومت اور اقتدار سے بہرحال بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر میری تمام قوم میں یہی جذبہ خدا پیدا کر دیتا ہے اور وہ میرا ساتھ دیتی تو میں تنہا تھوڑے سے باہمت مسلمانوں کو لے کر حکومت متسلطہ سے اُسی طرح اپنے ملک کو آزاد کراتا جس طرح میرے بزرگوں نے بار بار اُس کی سعی کی تھی، میں ہندوستان کے کسی کافر ومشرک کی

اعانت قبول نہ کرتا اور نہ کسی سے جا کر ملتا لیکن آپ ہی بتایئے میں کیا کروں اور ایسی نازک حالت میں کوئی بہادر سے بہادر انسان بھی کیا کر سکتا ہے۔

آگ دی صیاد نے جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا' وہی پتے ہوا دینے لگے

مسلمان اپنے تھے، انہی پر بھروسہ ہو سکتا تھا، انہی سے کام لیا جا سکتا تھا، لیکن اپنے تو سب انگریزوں سے جا ملے جس کو دیکھو وہ حکومت متسلطہ کا حامی نظر آتا ہے جس سے توقع تھی وہی دشمن کے کیمپ کی رونق بنا ہوا ہے۔ جس سے بات کرتا ہوں وہی کورا جواب دیتا ہے۔

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل
کجا دانند، حالِ ما سبکساران ساحل ہا

میرے عزیزو! تم اُس بے کس اور بے بس جرنیل کی بپتا سن کر کیا کرو گو جس کی تمام وفادار فوج کو ''میر جعفر'' اور ''میر صادق'' کی روح نے باغی بنا دیا ہو اور وہ تن تنہا دشمن سے جنگ کرنے اور فوج کو سمیٹنے کے لیے ایک ایک سپاہی کو آواز دے رہا ہو، اور اُس کی فوج کے باغی سپاہی دشمن کی صف میں کھڑے اُس کو گالیاں دے رہے ہوں،

دوش سوئے میکدہ، آمد ز مسجد پیر ما
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

اگر میری ملت پوری دلیری اور جانبازی سے میرا ساتھ دیتی اور ''وہن'' نہ پیدا ہو چکا ہوتا تو میں کیوں کسی ہندو یا سکھ کی طرف دیکھتا۔

عدو کی التجا کرنی پڑی ہے
مرادیں مانگتا ہوں آسماں سے!

جب اپنی وہ فوج نہ رہی جو قرآن اور رسول کے نام پر جمع ہو جاتی تھی اور کعبہ کے نام پر دوڑ کر آتی تھی، قرآن اور رسول سے باغی ہوگئی اور قرآن کو اور احادیث کو دشمن کی حمایت میں استعمال کرنے لگی تو میں نے مجبور ہو کر ہندوستان کی دوسری قوموں کو پکارا۔ کیا تم میں کوئی

''مہندر پرتاپ'' ہے جو مولوی عبید اللہ کا ساتھ دے اور جلاوطنی اختیار کرے؟ اس درد بھری آواز نے لوگوں کو آمادہ کیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مقصد تو دشمنوں پر فتح حاصل کرنا ہے، کافروں ہی کے ساتھ مل کر یہ مقصد پورا ہو جائے، تو کرلو، مگر مجھے کیا خبر تھی کہ جب یہ بیل منڈھے چڑھنے کو ہوگی اور دشمن کے پاؤں کمزور ہونے شروع ہو جائیں گے اور صرف ایک دھکے کی کسر رہ جائے گی، تو میری ہی ملت کے لوگ میرے دشمن ہو جائیں گے اور وہی علی گڑھ جس کے لیے میں خود چندے مانگتا پھرتا تھا اور اس توقع پر اُس کی ترقی کا خواہش مند تھا کہ شاید اس کالج کے کچھ نوجوان دارالعلوم دیوبند کے نوجوانوں سے مل کر اس خدمت کو انجام دیں گے، جس کی حسرت میرے، بزرگ اپنے سینوں میں لے کر قبروں میں جا سوئے، لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ وہی بچے جن سے میں نے بہت سی اُمیدیں وابستہ کی تھیں، میری راہ روکے کھڑے ہیں اور بجائے میرے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کے، دشمن کی فوج کا جھنڈا لیے پھر رہے ہیں اور غل مچا مچا کر یہ کہہ رہے ہیں کہ مولویوں کی بات نہ ماننا کیونکہ یہ انگریزوں کے مقابلے کے لیے ہندوؤں سے مل گئے ہیں۔

بہر حال میں نے نہایت واضح طور پر ہر فریق کا اصولی اختلاف بیان کر دیا اور اپنا عقیدہ بھی آپ کے سامنے عرض کر دیا لیکن میں موجودہ حالات میں آپ کو اپنے عقیدہ پر مجبور نہیں کرتا اور نہ میں آپ کو اپنی رائے ماننے پر مجبور کرتا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ دونوں فریق اپنی اپنی نقطۂ نگاہ کی تائید میں بہت دور نکل گئے ہیں، اس لیے ایک کو دوسرے کے مقابلہ پر لڑانا ملت کی کوئی بہتر خدمت نہ ہوگی، بلکہ باہمی سمجھوتہ سے اگر کوئی راہ نکل سکتی ہو تو اس کے نکالنے کی کوشش کرو کہ اس وقت مسلمانانِ ہند کی یہی بڑی خدمت ہے۔

جمعیۃ علماء ہند

میرے عزیزو! جمعیۃ علماء ہند ہی ایک ایسی جماعت ہے جس نے ہر دو فریق کے درمیان ایک صحیح اور مشترکہ راہ نکالنے کی کوشش کی ہے، اس نے انگریزی حکومت کو ہندوؤں سے مل کر ختم کر دینے کا ضرور اعلان کیا ہے لیکن اس نے کبھی مسلم حقوق کو نظر انداز نہیں کیا۔ جب کبھی

حقوق کی بحث آئی ہے تو اُس نے کوئی نہ کوئی ''فارمولا'' مرتب کر کے پیش کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ نے اس پر غور کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

میری رائے کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایک شخصی رائے ہے لیکن ''جماعت'' نے آج تک کبھی یہ نہیں کہا کہ انگریزی راج کو ہٹا کر ''ہندو راج'' قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ میں ایک دیوانہ آدمی ہوں، میری رائے کو چھوڑیے لیکن جماعت نے ہر فریق کی رائے کا احترام کیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم ۱۹۲۹ء میں سر آغا خاں کی آل پارٹیز میں کیوں شریک ہوتے اور ۱۹۳۵ء میں مسٹر جناح کی لیگ میں کیوں شرکت کرتے اور سر فضل حسین مرحوم کی خدمت میں جا کر بنگال کی یورپین نشستوں پر کیوں اُن سے جھگڑتے؟ اور اگر ''ہندو راج'' کے خواہشمند ہوتے تو ۱۹۳۰ء میں ''الٰہ آباد کی یونیٹی کانفرنس'' میں کیوں جاتے؟ ہم نے ہمیشہ مسلم حقوق کے متعلق آواز بلند کرنے میں کمی نہیں کی۔ اگر خدانخواستہ جمعیۃ علماء میری طرح دیوانی ہوتی تو ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر بنگال اور پنجاب میں ۵۱،۵۱ مسلم نشستوں کی کیوں حمایت کرتی؟ اور اگر ہم بعض نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرح، اسی طرح ''متحدہ قومیت'' کے حامی ہوتے، جس طرح وہ ہیں تو مسلمانوں کو ''شدہ'' ہونے سے بچانے کے لیے متھرا اور آگرہ کے جنگلوں کی کیوں خاک چھانتے؟

جہاں تک آزاد ہندوستان میں مسلم حقوق کا سوال ہے، ہم نے اس کے متعلق کوئی کوتاہی نہیں کی اور ہم نے ہمیشہ مسلم حقوق کے معاملہ میں سرکار پرستوں سے تعاون کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ سرکار پرستوں نے جب کوئی فارمولا مرتب کیا ہے تو اُس میں انگریزی مفاد کو بہت زیادہ مدنظر رکھا ہے۔ اُن کے ''فارمولے'' مسلم مفاد کے بجائے انگریزی مفاد کے زیادہ حامل ہوتے ہیں۔ اگر میں معاف کیا جاؤں، تو یہ کہنا کسی طرح بیجا نہ ہوگا کہ یہ فارمولے ''حکومت کے مشوروں'' یا اُس کے ''اشاروں'' سے مرتب ہوتے ہیں اِسی بنا پر ہم کو اس سے اختلاف ہوتا ہے، خواہ ہماری بات چلے یا نہ چلے لیکن ہم ہمیشہ حق کہنے سے نہیں چوکتے، اور ہمیشہ سرکار پرستوں کے مقابلہ میں ایسا فارمولا مرتب کر کے پیش کرتے ہیں جس میں انگریزوں کے لیے کوئی سامانِ زندگی نہیں ہوتا، لیکن مسلمانوں کا پورا فائدہ ہوتا ہے۔

مسلم لیگ سے مخالفت

آج بھی مسلم لیگ سے ہماری کوئی مخالفت بجز اس کے نہیں ہے کہ ہم اُس کے مطالبۂ پاکستان کو انگریزوں کے لیے بے انتہا مفید اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں، ورنہ خدانخواستہ ہماری لیگ سے کیا دشمنی ہے۔ لیگ نے ہم کو خواہ مخواہ مطعون کیا ہے۔ ہم کوئی لیگ کے مخالف نہیں ہیں۔ صرف اس کے مطالبۂ پاکستان کو ''اسلام دشمنی'' سمجھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ خاکم بدہن اگر یہ مطالبہ منظور ہو گیا تو انگریز اس ملک سے قیامت تک نہیں جائے گا۔

اگر مسلمان اس زہر کے پیالہ کو پینے کے لیے آمادہ ہو بھی جائیں گے تو بھی ہم کہتے رہیں گے کہ یہ مسلمانوں کی خدمت نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا نام لے کر انگریزوں کی خدمت کرنا مقصود ہے۔ اس سے زیادہ نہ ہمارا کوئی جھگڑا ہے اور نہ ہم مسلم لیگ کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک مسلمان سرمایہ داروں اور سرکار کے نام لیواؤں کی جماعت ہے جس طرح دُنیا میں باطل زندہ رہتا ہے اسی طرح وہ بھی زندہ رہے اور ''سرکار'' جب تک زندہ ہے اس قسم کے لوگ پیدا ہی ہوتے رہیں گے۔

البتہ جس دن انگریز اس ملک سے جائیں گے اُس دن اس قسم کے ''دعا گو'' یا تو انگریزوں کے ہمراہ انگلستان چلے جائیں گے یا ٹھیک اُسی طرح ختم ہو جائیں گے جس طرح کہ تیز سردی کے موسم میں سانپ اور بچھو ختم ہو جاتے ہیں اور اس طرح زمین کی تہہ میں گھس جاتے ہیں کہ تلاش کرنے کے باوجود بھی کہیں نظر نہیں آتے۔ یہ سب دعا گو حکومت کی پیداوار اور اُس کی عیال ہیں جس دن انگریز کی حکومت ختم ہوگی اُسی دن یہ بزرگ بھی زمین کی تہہ میں روپوش ہو جائیں گے اس لیے ہمیں کسی سرکاری پارٹی سے عناد یا دشمنی نہیں، ہاں ہم اس کھونٹے کو ہلانا چاہتے ہیں اور ہلانا کیا، اس کو اُکھیڑنا چاہتے ہیں۔ جس کے بل پر یہ بچھڑا کودتا ہے اسی لیے ہم جمعیۃ علماء کے نام پر لوگوں سے ووٹ مانگتے ہیں یا کانگریسی مسلمان کی حمایت کرتے ہیں اور مسلمانوں سے عرض کرتے ہیں کہ جو انگریزوں کی حکومت کا خواہاں نہیں ہے اور وہ اس کو مضبوط کرنا نہیں چاہتا وہ کانگریس کے نمائندے کو ووٹ دے یا جمعیۃ علماء کے نمائندے کو ووٹ

دے اور جو سرکار کا دعا گو ہے اور حکومت برطانیہ کے اقتدار کو اس ملک میں قائم رکھنے کا خواہشمند ہے اور حکومت کی آرزو پوری کرنے کا متمنی ہے، تو وہ مسلم لیگ کو ووٹ دے ہم کوئی یکطرفہ بات نہیں کہتے بلکہ ہر شخص کے جذبات کی رعایت کرتے ہیں۔

اب اگر اس حق و انصاف کے باوجود بھی کوئی ہم کو گالیاں دیتا ہے اور ہماری مخالفت کرتا ہے تو کرے، ہم تو اُس سے انتقام لیں گے نہیں، باقی اس کا معاملہ خدا سے ہے، خدا جانے اور وہ جانے۔ ہم نہ کسی سے بدلہ لینا چاہتے ہیں اور نہ بدلہ لینے کی ہماری عادت ہے۔

من آں مورم، کہ در پالم بمالند
نہ زنبورم، کہ از نیشم بنالند
کجا من شکر ایں نعمت گزارم
کہ زورِ مردم آزادی ندارم

جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی ایک جماعت ایسی ہے جو ہندوستان کی آزادی کے ساتھ بار بار اس امر کا اعلان کرتی رہی ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ مسلمان کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندہ رہنا نہیں چاہتے، یہی وجہ ہے کہ اُس نے ہمیشہ مسلم حقوق کے متعلق فارمولے مرتب کیے ہیں اور اُس موقع پر جبکہ مسلم لیگ کی طرف سے پاکستان کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، جمعیۃ علماء اپنا مستقل فارمولا شائع کر چکی ہے۔ جمعیۃ علماء نے اپنی ''لاہور والی تجویز'' ۱۹۴۲ء کی تشریح کرتے ہوئے حسب ذیل تجویز پاس کی ہے۔

> ''جمعیۃ علماء ہند کے نزدیک تمام ہندوستانیوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً یہ صورت مفید ہے کہ وہ حسب ذیل نکات پر اتفاق کرلیں اور اسی بنیاد پر حکومت برطانیہ کے سامنے متفقہ مطالبہ پیش کردیں۔''

(الف) ہمارا نصب العین آزادیٔ کامل ہے۔

(ب) وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، اُن کا مذہب آزاد ہوگا۔ مسلم کلچر اور تہذیب وثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

(ج) ہم ہندوستان میں صوبوں کی کامل خودمختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔ غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالہ کریں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

(د) ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے۔ مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب وثقافت کی مالک نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرے، ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی۔ یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

(تشریح) اگرچہ اس تجویز میں بیان کردہ اصول اور اِن کا مقصد واضح ہے کہ جمعیۃ علماء مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی اور تہذیبی آزادی کو کسی حال میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں، وہ بے شک ہندوستان کی وفاقی حکومت اور ایک مرکز پسند کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں مجموعۂ ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کے لیے یہ مفید ہے، مگر وفاقی حکومت کا قیام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ صوبوں کے لیے حق خودارادیت کو تسلیم کرلیا جائے اور وفاق کی تشکیل اس طرح ہو کہ مرکز کی غیر مسلم اکثریت، مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، تہذیبی حقوق پر اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر تعدی نہ کرسکے۔ مرکز کی ایسی تشکیل جس میں اکثریت کی تعدی کا خوف نہ رہے باہمی افہام وتفہیم سے، مندرجہ ذیل صورتوں میں سے کسی صورت پر، یا ان کے علاوہ کسی اور ایسی تجویز پر جو مسلم اور غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے ہوجائے ممکن ہے۔

(۱) مثلاً مرکزی ایوان کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔ ہندو ۴۵ مسلم ۴۵، دیگر اقلیتیں ۱۰۔

(۲) مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۲/۳ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخالفانہ اثر انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گا۔

(۳) ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں مسلم اور غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو، اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم اور غیر مسلم صوبوں کے مساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔ یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے اختلافات کا آخری فیصلہ کرے گا۔ نیز تجویز نمبر ۲۰ کے ماتحت اگر کسی بل کے، مسلمانوں کے خلاف ہونے، نہ ہونے میں مرکز کی اکثریت، مسلم ارکان کی ۲/۳ اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے، تو اس کا فیصلہ بھی سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا۔

(۴) یا اور کوئی تجویز جسے فریقین باہمی اتفاق سے طے کریں۔

(نوٹ) مندرجہ بالا تجویز الف سے بشمول د تک اجلاس لاہور منعقدہ ۱۹۴۲ء میں پاس ہو چکی تھی۔ اس پر مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳۱ر جنوری و یکم فروری ۱۹۴۵ء میں تشریح کا اضافہ کیا۔ اس کے بعد یہ پوری تجویز معہ تشریح جمعیۃ علماء ہند کے چودھویں اجلاسِ عام منعقدہ ۴، ۵، ۶، ۷ مئی ۱۹۴۵ء میں منظور کی گئی۔

مجلسِ عاملہ اجلاسِ سہارنپور کے منظور کردہ فارمولا کی چند دفعات

(۱) ہندوستان کی مختلف ملتوں کی کلچر، زبان، رسم الخط، پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی آزادی، مذہبی عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں اوقاف آزاد ہوں گے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

(۲) دستورِ اساسی میں اسلامی پرسنل لا کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی جس میں تصریح ہوگی کہ مجالس مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس میں مداخلت نہ کی جائے گی اور پرسنل لا کی مثال کے طور پر یہ چیزیں فٹ نوٹ میں درج کی جائیں گی۔ مثلاً احکامِ نکاح طلاق، رجعت، عدت، خیار بلوغ، تفریق زوجین، خلع، عنین ومفقود، نفقۂ زوجیت، حضانت،

ولایت نکاح و مال، وصیت وقف، وراثت، تکفین وتدفین، قربانی وغیرہ۔

(۳) مسلمانوں کے ایسے مقدمات فیصل کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائے گا اور اُن کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے۔

اس تجویز کو عام طور پر ''مرکز میں مساوات'' کہا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے اگر اس تجویز کو اصل قرار دیا جائے تو مسلمان ان تمام خطرات سے محفوظ ہو سکتے ہیں جو ایک مرکز کے قیام پر ظاہر کیے جاتے ہیں اور یہ تجویز ان شبہات سے بھی پاک ہے جو پاکستان پر کیے جاتے ہیں۔ میں یہ امر سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر جمعیۃ علماء کی تجویز آپ کی نظر التفات سے کیوں محروم ہے کہ آپ کو اس پر غور کرنے کی بھی تکلیف گوارا نہیں ہے۔ آخر آپ نے پاکستان کو الہامی چیز کیوں سمجھ لیا ہے، کہ اس کے خلاف نہ کچھ سننا چاہتے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ جمعیۃ علماء کے فارمولے کو پڑھ کر آپ یہ کہتے ہیں کہ کیا اس تجویز کو کانگریس نے مان لیا ہے؟ میں عرض کرتا ہوں کہ جناب نے بھی اس کو مان لیا؟ اگر آپ مان لیں تو کانگریس کو بھی مجبور کیا جا سکتا ہے لیکن جب آپ ہی اس پر غور کرنے کو تیار نہیں تو کانگریس اس کو تسلیم کرنے پر کس طرح آمادہ ہو سکتی ہے۔ کانگریس تو اُسی تجویز کو تسلیم کر سکتی ہے جس پر آپ اور ہم متفق ہو جائیں۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس پر غور کیجیے اور اگر آپ اس تجویز کو مسلم حقوق کا ضامن سمجھتے ہیں تو جمعیۃ علما کے ساتھ مل کر جمعیۃ کی آواز کو مضبوط بنایئے، اور اگر اس میں کچھ کوتاہی ہو تو ہم کو سمجھایئے۔ تاکہ ہم اور آپ کانگریس کے سامنے متفقہ مطالبہ پیش کر سکیں۔

آپ جانتے ہیں کہ میں اس امر کا کس قدر دل سے خواہشمند ہوں کہ مسلمان اگر مذہبی جزئیات میں ہم زبان اور ہم خیال نہیں ہو سکتے تو کم از کم سیاسی مسائل میں تو سب متحد ہوں۔ اسی خواہش کے پیش نظر میں نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی کہ مسلم لیگ اور جمعیۃ علما اور مجلس احرار باہم متفق اور متحد ہو جائیں، اسی غرض کی تکمیل کے لیے میں نے مسٹر جناح کی کوٹھی کا نیو دہلی میں طواف کیا اور اُن سے خط و کتابت بھی کی، لیکن مجھے افسوس ہے کہ واحد نمائندگی کے متکبرانہ تخیل کے مقابلہ میں مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ میں نے گزشتہ دنوں سہارنپور کی تقریر میں بھی

لیگی دوستوں سے التجا کی کہ کم از کم ایک آل پارٹیز (کانفرنس) طلب کرلو ہم تم آپس میں بیٹھ کر اپنے اختلاف کو باہمی گفتگو کر کے طے کرلیں لیکن جو لوگ علماء کے وقار کو ختم کرنے کے درپے ہوں اُن کو کب اس کی پرواہو سکتی ہے۔ جب تک اِس ملک میں خدا اور اُس کے رسول پر ایمان رکھنے والے مسلمان موجود ہیں اُس وقت تک علما کے وقار کو مٹانا آسان نہیں ہے۔ اگر جناب کو علما کی ضرورت نہیں اور آپ علما سے بے نیاز ہو چکے ہیں تو پھر آپ نے یہ جمعیۃ علماء اسلام یا ''مسجد ضرار'' کیوں بنائی ہے؟ اور کلکتہ میں یہ نیا کیمپ کیوں قائم کیا ہے؟ اور دنیا بھر سے اپنی طرح کے کمزور اور بزدل مولوی اور پیر کیوں چھانٹ چھانٹ کر جمع کر رہے ہو؟ اور تم نے ان سادہ لوح مولویوں اور پیروں کو کیوں آلہ کار بنایا ہے؟ اور اس آبرو باختہ ٹولی کی کیوں سرپرستی کی جارہی ہے اور ان بیچاروں کو اسلامی حکومت اور حکومت مستقلہ کے ناموں سے کیوں دھوکہ دے کر انگریزی حکومت کی بنیادیں مضبوط کر رہے ہو۔ کیا تم صرف علماء حق کے وقار اور آبرو کے دشمن ہو اور ان ''عبدالدراہم والدنانیر'' کے مخالف نہیں ہو۔ جو تمہاری ایک آواز پر تمہارے گرد اس طرح جمع ہو گئے ہیں جس طرح کسی قریب المرگ لاش پر گدھ جمع ہو جایا کرتے ہیں۔ میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ بعض ان علما میں سے یقیناً بے گناہ ہیں۔ جو محض اپنی سادگی سے تمہاری چکنی چپڑی باتوں کا اس طرح شکار ہو گئے ہیں جس طرح ۱۹۳۵ء میں قرولباغ کی ایک مجلس میں تم نے مجھے اپنی باتوں سے شکار کیا تھا اور بمبئی پہنچ کر مجھ سے ذاتی اعتماد حاصل کیا تھا۔

چو می بینم، کسے از کوئے تو دل شادی آید
فریبے کز تو اوّل خوردہ بودم، یاد می آید

حالانکہ اس وقت بڑے بڑے سرکاری آدمی مسٹر جناح کی ڈکٹیٹری کو پسند نہیں کرتے تھے اور برابر مسٹر جناح کی مخالفت کی جارہی تھی۔ اس وقت اس فریب خوردہ نے مسٹر جناح کی حمایت کی تھی اور سر محمد یعقوب اللہ غریق رحمت کرے ان سے تو ایسی نوک جھونک ہوئی تھی کہ وہ مدت العمر مجھ سے ناراض رہے اور انہوں نے جلسہ کے بعد ہی مجھ سے فرمایا کہ آپ دھوکہ کھا رہے ہیں۔ اس نااہل اور مغرور انسان کو پارلیمنٹری بورڈ کے انتخاب کا ڈکٹیٹر بنا رہے ہیں۔ کیا آپ کو مولانا محمد علی مرحوم کی رائے اس شخص کے متعلق معلوم نہیں۔ یہ شخص آپ کے کندھے پر

رکھ کر بندوق چلا رہا ہے اور پھر اس بندوق سے آپ کو قتل کر دے گا۔ میں نے عرض کیا تھا مولانا مجھے سب کچھ معلوم ہے لیکن جماعت نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک دفعہ اس نااہل کے ساتھ بھی ہو کر دیکھ لو۔ شاید اچھوں کے مرجانے کے بعد یہ برا ہی اچھا ہو جائے۔

لیکن سر یعقوب مرحوم نے جو کچھ کہا تھا وہ لفظ بہ لفظ سچ نکلا اور اسی لیے میں اپنی جماعت کے بزرگوں سے کہتا ہوں، کہ مجھے یہ تسلیم ہے کہ تم کو اپنوں نے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینک دیا، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کو آپ کی جماعت نے اچھوت بنا دیا ہے لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ آپ اس کا انتقام لینے کی غرض سے دشمنوں کے کیمپ میں جا گھسیں اور ان کے پلیٹ فارم پر جا کر اپنوں سے بدلہ لیں اور پھر ایک دن اُن کی محفل سے یہ کہتے ہوئے نکالے جائیں۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اپنے پھر اپنے ہیں اور غیر پھر غیر ہی ہیں۔ چاہے آپ اپنی خواہش کے مطابق اس اپنے مفروضہ پاکستان ہی میں دفن ہوں اور آپ سر سکندر اور سر فضل حسین اور سر شفیع ہی کے قبرستان میں سپردِ خاک کیے جائیں اور آپ کی لاش اسی صوبہ میں منتقل کی جائے، جس میں سکھوں کا ایک بہت بڑا گردوارہ موجود ہے لیکن تجہیز و تکفین تو بہر حال دیو بند میں ہوگی اور پاکستان تک پہنچانے والے تو اپنے ہوں گے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دامت برکاتہم

معزز حاضرین! اس جمعیۃ علماء اسلام کے سلسلہ میں پیر جماعت علی شاہ اور پیر کرامت علی شاہ وغیرہ کے نام کچھ زیادہ تعجب انگیز نہیں ہیں، کیونکہ جو لوگ خلیفۃ المسلمین کے مقابلے میں اپنے گنڈے اور تعویذوں کا جوہر دکھانے میں مشہور ہیں، اور انگریزی فتوحات ہمیشہ سے جن بزرگوں کی رہین منت ہوں، اُن سے گلہ کرنا بیکار ہے، اگر وہ اس وقت بھی یونین جیک کو سہارا نہ دیں گے تو اور کس وقت انگریزوں کے کام آئیں گے، انھوں نے عربوں اور ترکوں

کے مقابلے میں انگریزوں کو بچایا ہے تو کیا کانگریس کے مقابلہ میں گورنمنٹ کے کام نہ آئیں گے؟ اسی طرح مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی مدظلہٗ بھی اُن بزرگوں میں سے ہیں جن پر تھانہ بھون میں کبھی کبھی حق منکشف ہوتا ہے تو انگریزوں ہی کی حمایت کے لیے بشارت ملتی ہے، رہے مولوی ابراہیم سیالکوٹی، تو ان کو بھی معذور سمجھئے، کیونکہ وہ بھی جمعیۃ علما کے اُس اجلاس سے جو ۱۹۴۰ء میں امروہہ میں ہوا تھا۔ ہم لوگوں سے مایوس ہو گئے تھے۔ ہاں، یادش بخیر اگر شکایت ہے تو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب سے ہے، کیونکہ اُن کے ضعف طبیعت سے یہ خیال تو تھا کہ اُن کو جمعیۃ علماء کی ورکنگ کمیٹی میں منتخب نہ ہونے کا اور دارالعلوم کی صدارت سے معزول ہونے کا افسوس تو ضرور ہوگا لیکن یہ اُمید نہ تھی کہ وہ مسجد ضرار کی امامت قبول کریں گے اور اس پیرانہ سالی اور آخری وقت میں وہ مسلم لیگ کا پیروپیگنڈا کرتے پھریں گے۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کی نزاکتِ طبع اور عدمِ استقلال اور زودرنجی اور جذبہٗ انتقام سے جو واقف ہے، واقف ہے اور جس کو واقفیت نہیں وہ سخت متعجب اور پریشان ہے۔

مولانا شبیر احمد صاحب ان بزرگوں میں سے نہیں ہیں جو کسی امر پر آخر تک پوری طرح جمے رہیں۔ ڈابھیل ہجرت کر کے گئے، وہاں پوری نہ ڈالی۔ پھر دارالعلوم کے صدر مہتمم بنے، تو اُس میں بھی ادھورے ثابت ہوئے۔ البتہ جمعیۃ علماء ہند کے عرصہ تک ممبر رہے، اگرچہ بے التفاتی کے ساتھ رہے۔ اب آخر وقت میں مسجد ضرار یا سرکاری جمعیۃ علماء اسلام کے صدر مقرر ہوئے ہیں اور ایک ایسی ٹولی کی سرپرستی اختیار کی ہے جو عملاً اور اعتقاداً اُن کی سخت مخالف اور دشمن ہے، جس کا شیوہ یہ ہے کہ اُن نے اُن کے بزرگوں کو ہمیشہ علی الاعلان کافر اور مرتد کہا ہے اور یا پھر وہ لوگ ہیں جو ہر عالم کو بے وقار اور بے آبرو کرنے کے درپے ہیں۔ دیکھئے مولانا شبیر احمد صاحب مدظلہ اس ٹولی میں کب تک نبھتے ہیں، یا کب تک اُس کو نبھاتے ہیں۔ کسی دن بھی کوئی خفیف سی حرکت اُن کی نزاکت طبع کے خلاف ہو جانے دیجیے۔ پھر دیکھئے، اُسی دن استعفا رکھا ہوگا اور اخبارات میں ایک بہت ہی زہریلا بیان شائع کر دیا جائے گا۔ مولانا شبیر احمد صاحب نے دارالعلوم کی صدارت سے مستعفی ہوتے وقت کیسا خطرناک بیان دیا تھا، وہ کیا، آپ کو یاد نہیں؟ جب آپ کی زودرنجی اور جذبہٗ انتقام نے دارالعلوم کو معاف نہیں کیا تو بھلا

مسلم لیگ کو کیسے معاف کیا جاسکتا ہے۔ جب تک آپ صدرِ مہتمم رہے تو نہ دارالعلوم کانگریسی تھا، نہ وہاں کی تعلیم خراب تھی لیکن آپ کی سرپرستی ہٹتے ہی اس میں سینکڑوں کیڑے پڑ گئے اور بے شمار عیب پیدا ہو گئے۔

جب تک آپ جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ کے رکن رہے جمعیۃ علما نہ کانگریسی تھی اور نہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ''سیر کبیر'' میں کوئی جزئیہ تھا لیکن جس دن آپ انتخاب میں نہیں آئے، اُسی دن سے جمعیۃ علماء ایسی کافر پرست اور ہندوؤں کی زرخرید غلام ہوگئی کہ آپ کو اُس کے مقابلہ کے لیے ایک نئی جمعیۃ علماء اسلام کی امامت اختیار کرنی پڑی۔ پھر اس شوقِ امامت میں یہاں تک ترقی فرمائی کہ نہ اپنوں کی مروّت رہی، نہ اپنے معاصرین کا کوئی لحاظ رہا، نہ چھوٹوں پر شفقت رہی بلکہ وہ ملاقات، جو اُن کے مکان میں علی سبیل تذکرہ آ گئی تھی اور اُن کی عیادت کے سلسلہ میں جو وقتی باتیں ہوئی تھیں اُن کو بھی مولانا نے اخبارات میں شائع کرادیا اور اتنا خیال نہ فرمایا کہ یہ اپنوں کی باتیں یا شکایتیں، اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کو غیروں تک پہنچایا جائے اور اگر مولانا کو اپنی صفائی، نیک نامی اور تفوق علمی کے پیش نظر، اس گفتگو کو شائع کرنا ہی تھا اور ہم کو فریق مخالف قرار دینا تھا تو کم از کم ہماری اجازت سے شائع کی ہوتی اور ہم کو وہ گفتگو دکھا کر شائع کی جاتی۔ یہ کون سا طریقہ ہے کہ دو شخصوں کی گفتگو کو صرف مولوی طاہر جو وہاں موجود بھی نہ تھے، قلمبند کر کے شائع کر دیں اور فریق مخالف کی طرف وہ باتیں منسوب کر دیں جو اُس نے کہی نہ ہوں اور جبکہ وہ گفتگو مجلس میں قلمبند بھی نہ ہوئی ہو۔

ان باتوں کی غلط اشاعت سے ممکن ہے کہ مولانا کا پوزیشن حکومت دکن اور حکومت برطانیہ کی نظر میں صاف ہو گیا ہو، لیکن غیروں نے اس کا جس قدر مضحکہ اُڑایا وہ بہت ہی قابل افسوس ہے۔ ہر لیگی نے یہ سمجھ لیا کہ مولانا عثمانی اس قدر اخلاق کے بلند پایہ بزرگ ہیں جو پرائیویٹ باتوں کو بھی اخبارات میں شائع کر دیا کرتے ہیں اور غلط شائع کر دیا کرتے ہیں۔ بہر حال وہ بزرگ ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بھی انہی الفاظ کا شکار ہوئے جن الفاظ سے آج کل ہر شخص دھوکہ کھا رہا ہے یعنی پاکستان میں قرآنی حکومت ہوگی۔ چنانچہ اُنھوں نے دورانِ گفتگو میں یہ کہا بھی تھا اور اسی وجہ سے جب وہ جواب دینے سے عاجز ہو جاتے تھے تو آخر میں

فرماتے تھے کہ آخر اس میں کیا ہرج ہے؟ مجھے تو تقسیم میں کوئی ہرج معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے مولانا کی وہ تقریر بھی پڑھی ہے جو اُنھوں نے آپ کے اسی شہر میرٹھ میں کسی کانفرنس یا کسی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے فرمائی تھی اور جس میں ملحدین و مرتدین کی حمایت میں حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ''سیر کبیر'' سے ایک عبارت پیش کی تھی۔ باقی باتیں تو وہی ہیں جو عام طور سے لیگی لیڈر کہتے پھرتے ہیں اور جو شخص بھی اپنی خوش فہمی سے کانگریس کو خالص اور فقط ہندوؤں کی جماعت سمجھتا ہوگا اور مسلم لیگ کو بہترین مسلمانوں کی جماعت خیال کرتا ہوگا اور اسمبلیوں کے قوانین اور وائسرائے اور گورنروں کے اختیارات سے نا آشنا ہوگا، وہ ایسی ہی باتیں کرے گا جیسی مولانا شبیر احمد صاحب کر رہے ہیں۔ آپ، اس سے زیادہ کی توقع بھی کیوں کرتے ہیں۔ بھلا آپ خیال کیجیے جو شخص الیکشنوں کی دوڑ دھوپ کو حقیقی جہاد بالسیف کا مترادف سمجھ لے اور وہ شوکت اسلامی کو مٹانے کے در پے ہیں اور کوئی اسلامی سلطنت تباہ ہو رہی ہے وہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی 'سیر کبیر' سے مسلم لیگ کے کیمپ میں جانے کے لیے استدلال نہ کرے گا تو کیا کرے گا۔ جو اپنی سادہ لوحی اور بھولے پن سے مسٹر جناح کے مفروضہ پاکستان کو قرآنی حکومت اور خالص اسلامی حکومت کہتے ہیں وہ اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں؟ کہ خوارج کی شرکت پر امامِ محمد کی اس تصریح کا ترجمہ آپ کو سنائے، جو مولانا شبیر احمد صاحب مدظلہٗ آج بڑے فخر و مباہات کے ساتھ سناتے پھرتے ہیں، گویا ''سیر کبیر'' میں یہی ایک جزئیہ ہے جس کو لیگ میں جانے کے لیے بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔

کیا ''سیر کبیر'' دنیا کی کوئی ایسی معدوم کتاب ہے جو آج تک سوائے مولانا شبیر احمد صاحب کے کسی اور کی نظر ہی سے نہیں گزری۔ میں نے تو عرض کر دیا جو یہ سمجھ رہا ہو کہ ہندوستان میں ابھی تک شوکت اسلامی موجود ہے اور انگریزی حکومت کے باوجود شوکت اسلام باقی ہے اور یہاں قرآن پر تعزیراتِ ہند کی حکومت نہیں ہے اور اس ملک کے مسلمان حکمراں سو سال سے غلامی کی زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں اور کانگریس صرف اس غرض سے الیکشن لڑ رہی ہے کہ وہ نقشِ اسلام کو ہندوستان سے مٹا دے تو یقیناً امام محمدؒ کی عبارت اُس کو خوارج کی جماعت کا ''امام'' بننے پر اُبھار سکتی ہے!!

حضرت مولانا نے جو ترجمہ سیر کبیر کی عبارت کا کیا ہے اُسے آپ ملاحظہ فرمائیے کہ "اگر ان خوارج کی جنگ مشرکین بت پرستوں اور کفار مجاہرین سے ہو جائے تو اہل حق مسلمانوں کو کچھ مضائقہ نہیں کہ ان کفار اور مشرکین کے مقابلہ میں خوارج کی مدد کریں۔ کیونکہ وہ اس وقت کفر صریح کے فتنے کو رفع کرنے اور نقش اسلام کو ظاہر کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ (منشور ۹ جنوری ۱۹۴۶ء)

اب آپ غور فرمائیے کہ اس عبارت سے وہ استدلال کہاں تک صحیح ہے جو مولانا مرکزی اسمبلی اور صوبجاتی الیکشن کے لیے کر رہے ہیں۔

معاملہ کی حقیقت

اس ملک میں جہاں کئی سو سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی ہے، ایک انگلستانی جماعت قبضہ کر لیتی ہے اور مسلمانوں کو تخت و تاراج اور قتل و غارت کر کے اپنی حکومت قائم کر لیتی ہے اور مسلمانوں کو اُن کی ہندو رعایا کے ساتھ ملا کر اپنا غلام بنا لیتی ہے اور بے پناہ قوت و استبداد کے ساتھ اُن دونوں پر حکومت کرتی ہے، تقریباً پچیس سال کے بعد جب انگریزی حکومت کا استبداد حد سے بڑھ جاتا ہے، تو ہندو مسلمان مل کر ایک جماعت بناتے ہیں۔ اس کا نام کانگریس ہے، شروع شروع میں وہ بہت ہلکے اور دبے الفاظ میں اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی ہے، پھر جب وہ جماعت زور پکڑ جاتی ہے تو انگریز اس کو یہ موقع دیتا ہے کہ اچھا تم ایک کونسل بنا لو جس میں عام باشندوں کے انتخاب سے آیا کرو اور جو کچھ کہنا ہو ہمارے روبرو کہا کرو، جو قانون چاہو اپنے ملک کے لیے بنایا کرو لیکن آخری اختیار ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔ ہم جس قانون کو چاہیں مسترد کر دیں اور جس تجویز کو چاہیں پیش ہونے سے روک دیں۔

یہ ہندو مسلمانوں کی مشترک جماعت، بدرجہ مجبوری ان کونسلوں کو تسلیم کر لیتی ہے اور ہندو مسلمان اس غرض سے منتخب ہو کر جاتے ہیں کہ حکومت کے بالمقابل کھڑے ہو کر صاف صاف کہنے کا تو موقع ملے گا۔ اگرچہ ہمارے اختیارات کچھ نہ ہوں گے اور صوبوں میں اگر کچھ ہوں گے بھی تو وہ بھی انگریزوں کے رحم و کرم پر موقوف ہوں گے، وہ جب چاہیں گے کسی قانون کو

رد کر دیں گے، بلکہ وزیر اعظم سے استعفا طلب کر لیں گے۔ چونکہ بد قسمتی سے ہندو، ہندو کے ووٹوں سے منتخب ہوتا ہے اور مسلمان مسلمان کے ووٹوں سے اس لیے اس "مشترکہ جماعت" کو جس کا صدر ہندوستان کا ایک بہت بڑا عالم ہے اور اس جماعت کے بڑے بڑے عالم ارکان ہیں، ہرانے اور نیچا دکھانے کے لیے خوارج کی ایک جماعت کھڑی ہو جاتی ہے، ان "خارجیوں" کی حمایت میں بہت سے آدمی اس حکومت کافرہ متسلطہ کے بھی شامل ہیں، یہ خارجی اور حکومت کے آدمی مل کر اس کونسل میں، اس "مشترکہ جماعت" کے خلاف رائے دیتے ہیں، اور جب وہ مشترکہ جماعت اس حکومت کافرہ متسلطہ پر نکتہ چینی کرتی ہے تو یہ خارجیوں کی جماعت اپنی رائے حکومت کی طرفداری میں دیتی ہے اور اگر رائے شماری میں کافر حکومت کی جیت ہو جاتی ہے تو یہ خارجی اور حکومت کے آدمی مل کر تالیاں بجاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

یہ اس الیکشنی جنگ یا الیکشنی مقابلہ کی حقیقت ہے، اب اگر اس جنگ کو کوئی اسلام وکفر کی جنگ بنا کر نقش اسلامی کو مٹانے کی جنگ بنا دے اور خارجیوں، اور خارجیوں سے بدتر قادیانیوں اور سرکاری جماعت کی حمایت کرنے کھڑا ہو جائے تو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی "سیر کبیر" کی مذکورہ بالا عبارت، اُس کی کہاں تک رہنمائی کر سکتی ہے؟ اور اس الیکشن کو جس کے کامیاب ممبر، صرف انگریزی حکومت کے سامنے صاف گوئی سے اپنا مطلب بیان کر دیں اور یا بعض کاموں کو اپنے ہاتھ سے کر کے دکھائیں اور حکومت سے کہیں کہ ہم اس قسم کی حکومت چاہتے ہیں، اس کو اور امام محمد کی عبارت کو باہم کیا لگاؤ ہے؟

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مدظلہ میرے بزرگ ہیں، میں ان کا بڑا احترام کرتا ہوں۔ وہ ایک متبحر عالم اور اپنی علمی قابلیت کے اعتبار سے بہت بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ حضرت سلطان علوم شاہ دکن ان کی بڑی قدر کرتے ہیں اور خزانہ عامرہ سے ڈھائی سو روپے ماہوار کی پیشکش مولانا کو دوامی طور پر پیش کی جاتی ہے، ان کو اپنی شان کے لائق بات کرنی چاہیے، وہ علماء کی جماعت میں ایک خاص شان اور ایک اعلیٰ حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ شاہ دکن کی بارگاہ میں ایک خاص پایہ رکھتے ہیں، اُن کی شان کے لائق ہرگز یہ باتیں نہیں جو وہ

کررہے ہیں، ہم جیسا کوئی جاہل اور کندۂ ناتراش اس قسم کے رکیک استدلال کرتا تو اُس کو معاف کیا جاسکتا تھا لیکن مولانا کی شان، اس قسم کے استدلال سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔

اذا ابتلی ببلیتین، فلیتخذوا ھو نھما

یعنی جب کوئی شخص دو فتنوں یا بلاؤں میں مبتلا ہو جائے تو شرعی اصول کے ماتحت جو مصیبت آسان اور سہل ہو، اُس کو اختیار کر لے۔ حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس شرعی اصول کے پیش نظر بحث کی ہے، یہ ظاہر ہے کہ اس کلیۂ شرعیہ کے ہزاروں جزئیات ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ اگر دو کافروں میں جنگ ہو تو مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہونی چاہیے؟ اگر مسلمانوں اور کافروں کی جنگ ہو اور کافروں کا کوئی فرقہ مسلمانوں کی مدد کرنے پر آمادہ ہو لیکن اپنا جھنڈا لے کر آئے اور اپنے جھنڈے تلے مسلمانوں کی مدد کرے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر کافروں سے لڑے، تب مسلمانوں کی حیثیت کیا ہوگی؟ ان کافروں سے مدد لینی جائز ہوگی یا نہ ہوگی؟ اور اگر کافروں کا کوئی فرقہ اپنے جھنڈے کی شرط نہ لگائے اور مسلمانوں ہی کے جھنڈے تلے کھڑے ہو کر مسلمانوں کے کافر دشمن سے لڑنے پر آمادہ ہو اور مسلمانوں کی مدد کرنے پر تیار ہو تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اور اگر دو کافروں کی جنگ ہو اور مسلمان دیکھیں کہ ایک کافر کا ساتھ دینے میں اسلام کا فائدہ ہے تو وہ ایک کافر فریق کا ساتھ دیں یا نہ دیں اور اگر دیں تو اپنا جھنڈا لے کر ساتھ دیں اور ایک کافر کی حمایت میں دوسرے کافر سے لڑیں یا کافروں ہی کے جھنڈے کے نیچے جا کر ان کافروں کی مدد کریں۔ جن کی کامیابی سے مسلمانوں کا فائدہ مقصود ہو۔

یہ تمام صورتیں سیر کبیر میں موجود ہیں، پھر ہر جزیئے کے دلائل ہیں، انہی میں وہ جزئیہ بھی ہے جو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کو استخارے سے معلوم ہوا ہے اور انہی جزئیات میں وہ جزئیہ بھی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اگر مسلمانوں کا فائدہ دیکھیں تو خالص کافروں کے جھنڈے کے نیچے بھی دوسرے کافروں سے جنگ اور مقاتلہ کر سکتے ہیں، جیسا کہ حضرت زبیر بن عوام نے نجاشی کے دشمن کا مقابلہ کیا تھا اور ایک مشک میں پھونک بھر کر اور اس پر بیٹھ کر دریا کو عبور کیا تھا اور مسلمان نجاشی کی فتح کے لیے دعائیں کررہے تھے۔ کیونکہ نجاشی کی فتح میں

مسلمانوں کا مفاد تھا آخر زبیر بن عوام کی اس سعی سے نجاشی کے دشمن کو شکست ہوئی۔ کہا اچھا وہ جو آپ سیر کبیر کی اس عبارت کو جو مولانا شبیر احمد صاحب نے پیش کی ہے ملاحظہ کرلیں۔ اس کا ترجمہ تو میں ''منشور'' اخبار سے پیش ہی کر چکا ہوں۔

اصل عبارت یہ ہے:

لا باس بان یقاتل المسلمون من اهل العدل مع الخوارج، المشرکین من اهل الحرب، لا نهم یقاتلون الا ان لدفع فتنة الکفر واظهار الاسلام، فهذا قتالٌ علیٰ وحیه المامور به وهو اعلاء کلمة الله

اگر میں مولانا کے ترجمہ پر کوئی تنقید نہ بھی کروں اور اہل عدل اور خوارج کا وہی مفہوم اختیار کرلوں، جو مولانا نے اختیار فرمایا ہے، تب بھی اس عبارت کا مطلب اتنا ہی تو ہے کہ اگر حربی مشرکین خوارج سے جنگ کریں تو مسلمانوں کو خوارج کے ساتھ مل کر، حربی مشرکین کے ساتھ لڑنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ اگرچہ خوارج بھی بدترین کافر ہیں لیکن اس وقت وہ کفر کے فتنہ کی مدافعت کر رہے ہیں اور اسلام کے غلبہ کے لیے جہاد کر رہے ہیں، اس لیے مسلمانوں کو ان خوارج کا ساتھ دینے میں کچھ مضائقہ نہیں!

اب فرمایئے اس وقت ہندوستان میں نہ کہیں جہاد وقتال ہے نہ کافروں کی دو جماعتیں آپس میں قتال کررہی ہیں، نہ کہیں انگریزوں کی غلام اور مفروضہ شوکت اسلامی پر، کوئی حربی مشرکین کی جماعت حملہ کررہی ہے اور نہ خارجیوں کی کسی آزاد حکومت پر کوئی کافر حملہ آور ہے، جو ہم خارجیوں کی مدد کو پہنچیں اور خارجیوں سے مل کر کفر ساذج کا مقابلہ کریں۔ ہاں ہم یہ تو سن رہے ہیں کہ جاوا کے سات لاکھوں مسلمانوں پر کفار یلغار کررہے ہیں اور اُن پر بم گرارہے ہیں اور خدا جانے جھوٹ یا سچ یہ بھی سن رہے ہیں کہ فلسطین کے عربوں پر ظلم ہورہا ہے اور ہر مہینہ پندرہ سو یہودیوں کو اجازت مل گئی ہے، اور یہ بھی سن رہے ہیں کہ کافروں کی ایک جماعت عرب لیگ کا گلا گھونٹ رہی ہے اور یہ بھی سنتے ہیں کہ شاہِ فاروق کو کافر ستارہے ہیں اور یہ بھی مشہور ہے کہ کافروں کی ایک جماعت نے عرب میں ہوائی اڈہ بنالیا ہے اور یہ بھی سنا جارہا ہے کہ کپتان عبدالرشید جو مسلمانوں کی حفاظت اور صیانت کی غرض سے آزاد ہند فوج میں شامل ہو

گیا تھا اُس کو کسی کافر کی جماعت نے سات سال کے لیے قید کر دیا ہے اور یہ بھی سنتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مفتوحہ ملک ''ایران'' پر کافروں کی کوئی جماعت زبردستی قبضہ کر رہی ہے۔

اگر یہ باتیں سچ ہیں جیسا کہ میں سن رہا ہوں تو خالص مسلمانوں کی امداد کافروں کے مقابلہ میں مقدم اور ضروری ہے؟ یا خارجیوں کی جماعت میں شامل ہو کر کافروں اور مسلمانوں کی مشترکہ جماعت سے مقابلہ کرنا اور خارجیوں کو تقویت پہنچانا ضروری اور مقدم ہے؟ جبکہ وہ مشترکہ جماعت کسی خارجی حکومت یا اسلامی شوکت پر حملہ آور بھی نہ ہو رہی ہو۔

اوّل تو یہاں کوئی خارجی مسلمانوں کی حکومت ہی نہیں، نہ کہیں کوئی مسلمانوں کی آزاد شوکت ہے، یہ حکومت اور شوکت تو خالص کفاروں کی جماعت ختم کر چکی، تو اب پھر وہ مشترک کس حکومت اور کون سی شوکت پر حملہ آور ہیں جس کے لیے مسلمانوں کو خوارج کا ساتھ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، میں اس سے زیادہ کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ کبھی وہ وقت آیا کہ کوئی خالص کافروں کی جماعت مسلمانوں پر حملہ آور ہوئی تو اُس وقت بھی وہی مجاہدین علما سینہ سپر ہوں گے، جو آج حکومت متسلطہ سے برسرپیکار ہیں اور وہ خوارج کی جماعت اور اس کے ہم نوا خارجی علما اس دن بھی اسی طرح کافر حکمرانوں کے حامی ہوں گے۔ جس طرح آج حکومت کافرہ متسلطہ کے حامی اور مددگار ہیں۔

بڑی حیرت ہے کہ آخر مسلم کی شرح لکھتے لکھتے یکایک مولانا کا قلب مسلم لیگ کی طرف کیسے مائل ہو گیا، کیا اپنے خدام اور احباب سے انتقام لینے کی یہی ایک شکل تھی کہ مسجد ضرار کے امام بن کر تبحر علمی کا سارا زور خارجیوں کی حمایت و اعانت میں صرف کر دیا جائے۔

فتنہ پرداز، دغا باز، فسوں گر، عیار　　　ہائے افسوس دل آیا بھی تو آیا کس پر

مگر دل ہی تو ہے کسی کے پاس اس کا کیا علاج ہے؟

الھم ارنالحق وارزقنا اتباعه وارنا لباطل باطلا وارزقنا اجتنابه

مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا۔ میں آپ سے آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جمعیۃ علما کو پوری قوت کے ساتھ مضبوط کیجیے اور اس نازک دور میں

ثابت قدم رہیے اور ہر باطل کا جم کر مقابلہ کیجیے اور خدا پر بھروسا رکھیے۔

ان ینصر کم اللہ فلا غالب لکم، وان یخذ لکم فمن ذالذی ینصر کم من بعدہ.

اگر تم نے ہمت سے کام لیا تو خدا تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے دشمن خائب و خاصر ہوں گے۔ تم تنہا نہ حکومت متسلطہ کا مقابلہ کر سکتے ہو اور نہ اپنی طرح کے غلام ہندو سے! تم تنہا نبرد آزما ہو سکتے اور نہ بالکل غیر جانبدار رہ سکتے ہو، سمجھداری اور ہوشیاری اسی میں ہے کہ ایک کے ساتھ مل کر دوسرے کو شکست دو، یہ نہیں ہوسکتا کہ تم تنہا دو دشمنوں کا مقابلہ کرو، تم صرف ایک دشمن کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے، پھر دو دشمنوں سے کس طرح نبرد آزما ہو سکتے ہو۔ مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا، اب یہ بات تمہارے اختیارات تمیزی پر موقوف ہے کہ اگر تم ہندو سے لڑنا چاہتے ہو تو لامحالہ تم کو انگریز کا ساتھ دینا ہوگا، جیسا کہ مسلم لیگ کے ممبر، مرکزی اسمبلی میں کر رہے ہیں، اور اگر تم انگریز سے آئینی جنگ لڑ کر اُس کو اپنے ملک سے باہر نکالنا چاہتے ہو تو لامحالہ تم کو کانگریس سے مل کر، مشترکہ محاذ بنانا پڑے گا اور جو کچھ ہندو کر رہا ہے وہ سب کچھ تم کو کرنا ہوگا۔ خواہ جیل جانا ہو یا گولیوں کی بوچھار میں کھڑا ہونا ہو۔ یہ بات غلط اور صریح دھوکا ہے کہ تم کہو کہ ہم انگریزوں کے طرفدار نہیں ہیں، لیکن ہندو کے دشمن ہیں اس سے لڑنا چاہتے ہیں۔

قدرتی طور پر اس ملک میں صورت ایسی پیدا ہوگئی ہے۔ اگرچہ کوئی فوجی انقلاب نہیں ہو رہا ہے لیکن آئینی انقلاب ضرور ہونے والا ہے، اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ تم کو ایک راہ اختیار کرنی ہوگی، انگریز کے رہنے میں تم مسلمان کا فائدہ سمجھتے ہو اور عالم اسلامی کی خیریت انگریزی اقتدار کے ماتحت جانتے ہو، تو کھلے طور پر انگریزوں کی حمایت کا اعلان کرو اور مولانا شبیر احمد صاحب کی طرح گول مول باتیں اور فقہی موشگافیاں نہ کرو اور اگر تم اپنی دیانت اور ایمان کی روشنی میں یہ سمجھتے ہو کہ انگریزی حکومت کے زوال ہی میں تمہاری اور تمام عالم اسلام کی بھلائی ہے، تو صاف طور سے بلا خوف لومۃ لائم کانگریس میں شریک ہو جاؤ اور ان ہندو مسلمانوں کے ساتھ مل کر حکومت متسلطہ کے اقتدار کو یہاں سے زائل کرنے کی کوشش کرو جس نے تمہارے اقتدار کو دنیا سے مٹا دیا ہے۔

وہ ہندو اور مسلمان جو کفن بردوش پھر رہے ہیں اور جنھوں نے اپنی زندگی کا مقصد وحید حکومت متسلطہ سے نجات حاصل کرنا بنالیا ہے اور تم اُن رافضیوں اور خارجیوں کی جماعت سے اجتناب کرو، جو مسلمانوں کی خیر خواہی کا نام لے کر انگریزوں کی اعانت کر رہے ہیں۔

میں نے اپنا عقیدہ ظاہر کردیا ہے اب یہ تمہارا اپنا ذوق ہے کہ تم کون سی راہ اختیار کرتے ہو۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کی خدمت میں ضروری گزارش!

معزز حاضرین! آپ مجھے پھر معاف فرمائیں اگر میں آخر میں مولانا شبیر احمد صاحب کی خدمت میں چند ضروری باتیں عرض کروں۔ کیونکہ مولانا شبیر احمد صاحب نے ابھی گزشتہ دنوں سہارنپور میں تقریر کرتے ہوئے مولانا حسین احمد صاحب کو مباہلہ کا چیلنج دیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ مباہلہ سے قبل حضرت مولانا عثمانی کی خدمت میں مسٹر جناح کی ایک مفصل تقریر پیش کردوں تاکہ شاید مولانا عثمانی مسٹر جناح کے پاکستان کی حقیقت سے آگاہ ہوجائیں۔

مسٹر جناح کی تقریر

پاکستانی آئین زبردستی نافذ نہیں کیا جائے گا۔ پاکستان کی ہندو اقلیت کو مطمئن رہنا چاہیے کہ اُس کے حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔ میں اُس ایک جماعت کی مخالفت کروں گا۔ جو تنہا طاقت اور اقتدار حاصل کرنا چاہے گی۔ میں اُس عقیدہ کا قائل نہیں ہوں کہ پاکستان میں ایک جماعت (مسلم پارلیمنٹری جماعت) یا پارٹی کی حکومت ہو۔

(الف) پاکستان میں شمالی مغربی سرحدی صوبہ، صوبہ بلوچستان، صوبہ سندھ، صوبہ پنجاب، شمالی مغرب میں اور مشرقی سمت میں پاکستان کا دوسرا حصہ بنگال اور آسام شامل ہوں گے۔

(ب) پاکستان ایک جمہوریت ہوگا اور جداگانہ علاقوں پر مشتمل ہوگا اس کی آبادی دس کروڑ مسلمانوں اور غیر مسلموں پر مشتمل ہوگی۔ یہ دو علاقوں پر مشتمل ایک بلاک ہوگا۔ صوبے عصر حاضر کے فیڈرل دستور کے مطابق خود مختار ہوں گے۔ پاکستان کی تمام ہندو، مسلم، سکھ،

عیسائی آبادی ایک قوم کے اصول پر ترقی حاصل کرے گی۔ ان امور پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی کام کر رہی ہے۔

(ج) پاکستان میں آمدنی کے ذرائع اتنے ہوں گے کہ وہ آسانی سے ایک بڑی طاقت بن سکے گا۔ پاکستان کی بڑی صنعتیں اور کارخانے سوشلزم کے اصول پر قوم (حکومت) کے قبضہ میں دے دیے جائیں گے۔ پاکستان کی آمدنی مساوی ٹیکس عائد کرکے وصول کی جائے گی۔

(د) ہندوؤں کے خلاف کسی قسم کی معاشرتی پابندی یا رکاوٹ نہ ہوگی۔ بلکہ ہندوؤں کے ساتھ انسانی مساوات اور اخوت کے اصول پر کام کیا جائے گا انھیں مسلمانوں کے برابر درجہ دیا جائے گا اور مسلمانوں کا بھائی سمجھا جائے گا۔ پاکستان میں ایک پارٹی (مسلمانوں) کا تنہا اقتدار اور حکومت نہیں ہوگی بلکہ اپوزیشن ہندوؤں کی جماعت اُن کی اصلاح کے لیے موجود رہے گی اور مفید ہوگی۔ اُنھیں یہ محسوس کرا دیا جائے گا کہ حکومت میں اُن کا ہاتھ کام کر رہا ہے اور اُن کی نمائندگی موجود ہے اور اُن کے حقوق محفوظ ہیں۔ (روح روشن مستقبل ص ۱۷۵)

یہ وہ پاکستان ہے جس کو اسلامی اور قرآنی حکومت کہا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ میں چاہتا ہوں کہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے وہ اعداد بھی شامل کردوں تا کہ مولانا شبیر احمد صاحب صحیح اعداد معلوم کرکے اپنی رائے پر نظر ثانی کرسکیں۔ ملاحظہ کیجیے:

صوبہ کا نام	تعداد مسلم	تعداد غیر مسلم
آسام	۳۴۴۲۴۷۹	۶۷۶۲۲۵۴
بنگال	۳۳۰۰۵۴۳۴	۲۷۳۰۱۰۹۱
پنجاب	۱۶۲۱۷۲۴۲	۱۲۲۰۱۵۷۷
سرحد	۲۷۸۸۷۹۷	۲۴۹۲۷۰
سندھ	۳۲۰۸۳۲۵	۱۳۲۶۸۸۲
بلوچستان	۴۳۸۹۳۰	۶۲۷۰۱

پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد ۵و۹۱و۰۰و۲و۰۷

پاکستان میں غیر مسلموں کی تعداد ۴و۷۹و۰۳و۷و۷۵

یہ تعداد ''مردم شماری ۱۹۴۱ء پر تبصرہ'' مصنفہ چودھری رحم علی ہاشمی سے اور ہندوستان کی آبادی ڈاکٹر انور اقبال قریشی ادارۂ معاشیات دکن سے لی گئی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں ہندوستان کے کل مسلمانوں کی تعداد ہے۔ ۹۲۰۰۰۰۰۰ ہے۔

ان میں سے پاکستانی مسلمانوں کی تعداد ۵۹۱۰۱۰۲۰۷ ہے۔ اس حساب سے ہندو ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ۳۲۸۹۹۷۹۳ ہوئی۔ کاش مولانا شبیر احمد صاحب اس کو ملاحظہ فرمائیں کہ تین کروڑ اٹھائیس لاکھ ننانوے ہزار سات سو ترانوے کو کس جرات کے ساتھ دو کروڑ کہا جا رہا ہے۔

اور پاکستان کے مسلمان جن کی کل تعداد پانچ کروڑ اکیانوے لاکھ دو سو سات ہے۔ ان کی تعداد کو سات کروڑ بتایا جاتا ہے اور پاکستان میں غیر مسلم جن کی تعداد چار کروڑ اُناسی لاکھ تین ہزار سات سو چھتر ہے۔ اُن کی تعداد کو کل دو کروڑ اور سوا دو کروڑ بتایا جا رہا ہے اور پاکستان کے فیڈریشن میں جہاں ہندو مسلمانوں کی نسبت پچپن اعشاریہ پانچ اور چوالیس اعشاریہ پانچ ہے اس کو ستر اور تیس کی نسبت کہا جا رہا ہے۔ یعنی چوالیس ہندو اور پچپن مسلمانوں کی مشترک حکومت ہوگی۔ آپ نے دیکھا کیا خوب قرآنی حکومت بتائی جا رہی ہے۔ جس کے فیڈریشن میں پچپن مسلمان اور چوالیس ہندو ہوں گے اور (انہیں) مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ یہی تو وہ پرفریب امور ہیں جس میں مولانا شبیر احمد صاحب جیسے متبحر عالم مبتلا ہو گئے ہیں۔

میں نے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کا وہ پوسٹر بھی دیکھا ہے جس میں آپ کا وہ پیام شائع ہوا جو آپ نے مسلمانانِ سندھ کے نام بھیجا ہے اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی طرح مخرجین لیگ کو طاعت کرنے کا مشورہ دیا ہے لیکن سندھ کے مسلمانوں سے یہ توقع کس طرح کی جا سکتی ہے۔ جبکہ مولانا کی خود یہ حالت ہے کہ دارالعلوم کی صدارت سے معزول ہونے کے بعد دارالعلوم کی بنیادوں میں ڈائنامیٹ بچھا کر اس کو اُڑانے کے درپے ہو گئے تھے اور دارالعلوم کے خلاف ایسا زہریلا بیان دے کر دارالعلوم سے گئے تھے کہ اگر مسلمان اُس کا یقین کر لیتے تو دارالعلوم کا خاتمہ ہی ہو جاتا۔ کیا حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی سنت یہی ہے جس کا مشورہ جناب نے جے ایم سید کو دیا تھا۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سے ایک آخری بات!

آخر میں نہایت ادب کے ساتھ ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کرنے کی غرض سے محمد بن ابی بکر نے حضرت عثمان کی ڈاڑھی پر ہاتھ ڈالا تو حضرت عثمان نے ایک فقرہ فرمایا تھا کہ محمد! اگر تیرا باپ تجھ کو اس حالت میں دیکھتا تو تیری یہ حرکت اور تیرا یہ فعل اُس کو رنجیدہ کرتا اور تیری یہ حرکت اُس کو تکلیف دہ ہوتی۔ اسی طرح میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سے عرض کرتا ہوں کہ اگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ آج آپ کی ان باتوں کو دیکھتے، جو آپ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور اُن کے رفقاء کے ساتھ کر رہے ہیں تو آپ کا یہ برتاؤ ان کے لیے سخت رنج دہ اور انتہائی تکلیف دہ ہوتا۔

سبحٰن ربک رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۵ فروری ۱۹۴۶ء

مولانا کے بیانات:

(۱)

مسلم یونٹی بورڈ کے اجلاس سے جمعیت کا واک آؤٹ

۴؍ اگست ۱۹۳۴ء کو وایسرائے ہند نے اعلان کیا تھا کہ وہ آیندہ الیکشن سے پہلے ۳۱؍ دسمبر ۱۹۳۴ء کو اسمبلی برخاست کریں گے لیکن جرمنی کی جنگی تیاری اور ہٹلر کے اعلانات نے برطانیہ کے خوف کی جو فضا قایم کر دی تھی، اس سے پریشان ہو کر وایسرائے نے ۲۹؍ اگست ہی کو اسمبلی توڑ دی۔ اب آیندہ متوقع سیاسی صورت حال کا نقشہ بدلنے سے مسلم لیگ کے رہنماؤں نے بھی اپنی سیاست کا رُخ بدلنا چاہا۔ چناں چہ مسلم یونٹی بورڈ کے اجلاس لکھنؤ میں اس

کا واضح اظہار ہوا اور جمعیت علماے ہند کے ارکان نے اجلاس سے واک آؤٹ کر کے اپنا ردعمل ظاہر کر دیا۔ اس موقع پر جمعیت کے ناظم اعلیٰ نے ایک بیان جاری کیا جو ۲۲/اگست ۱۹۳۴ء کے اخبارات میں شائع ہوا۔ اخبارات کی رپورٹ یہ ہے:

۲۱/اگست (۱۹۳۴ء) مسلم یونٹی بورڈ لکھنؤ کے اجلاس میں آخری روز جمعیۃ علمائے ہند کے نمائندوں نے واک آؤٹ کیا۔ ان کا موقف یہ تھا۔

> ''چونکہ مسلم یونٹی بورڈ سے ہمارا اشتراک صرف ان شرائط پر تھا کہ آئندہ انتخاب میں ہم ایسے نمائندوں کی امداد کریں گے جو اسمبلی میں مذہبی امور کے سلسلے میں جمعیۃ کے فیصلوں کے مطابق کام کریں لیکن یونٹی بورڈ نے ہماری شرائط پوری نہیں کیں۔ لہٰذا ان حالات میں ہم آئندہ انتخاب میں مسلم یونٹی بورڈ کی حمایت نہیں کریں گے۔ تاہم جمعیۃ علمائے ہند ان حالات میں بھی بورڈ کا ایک نمایاں گروپ ہے۔''
>
> (کاروان احرار: ج۲ص۶۹)

(۲)

نہرو جناح گفت وشنید اور جمعیت علماے ہند کا موقف

وقت کے سیاسی اُتار چڑھاؤ میں لیگ اور کانگریس کے رویوں کے اختلافات کو دور کرنے کے لیے مسٹر محمد علی جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو میں جو گفتگو ہو رہی تھی اس سلسلے میں جمعیت علماے ہند نے ضروری سمجھا کہ وہ اپنا موقف واضح کر دے۔ چناں چہ جمعیت علماے ہند کے ناظم اعلیٰ کا یہ تحریری بیان شائع ہوا۔

۱۴/مئی کے اخبارات کو مولانا احمد سعید ناظم جمعیت علماے ہند، ممبر یوپی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے ایک بیان میں کہا:

> ''پنڈت جواہر لعل نہرو اور مسٹر جناح کے کاغذی مجادلوں نے بعض مسلمانوں کو مضطرب کیا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسے مباحث ملکی

مفاد کے لیے مفید نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے ایسی کشیدگی پیدا ہونے کا احتمال ہے جس سے ہندوستان کی غلامی کے دن طویل ہو جائیں گے۔

میں ان اشخاص میں سے نہیں، جن کا خیال ہے کہ پنڈت نہرو اور مسٹر جناح کے درمیان سمجھوتہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر وہ مل کر آزادانہ حالات حاضرہ پر بحث کریں، تو سمجھوتہ کے راستہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکے گی۔ اس وقت ملک کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ چند کانگرسی اور مسلم لیگی لیڈر میدان میں آئیں اور اس قسم کی مجلس کا انتظام کریں۔ میں نے کنونشن کے دوران پنڈت نہرو اور مسٹر جناح سے ملاقات کی تھی۔ چنانچہ دونوں کا لب و لہجہ مفاہمت آمیز تھا۔ ہمارے درمیان وقار کا سوال ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں متحدہ طور پر ملک کے مقاصد کی راہ ہموار کرنی چاہیے۔ اگر ہم فی الحقیقت ملک کی آزادی چاہتے ہیں، تو ہمیں متحدہ محاذ کے لیے راہ صاف کرنی ہوگی۔

اس وقت ہندوستان کے ہندو اور مسلمان یکساں طور پر آزادی حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ چنانچہ اس ملی فریضے میں مسلمان کسی دوسری قوم سے پیچھے نہیں۔ مسلمان آزادی کی راہ میں پیشتر بہت سی قربانیاں پیش کر چکے ہیں اور آئندہ بھی اس راہ میں کوتاہی نہیں ہوگی۔ مگر وہ اپنے حقوق کے بارے میں اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ کانگریس کا کراچی ریزولیشن مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی انفرادیت کو تسلیم کیا جائے۔ اس ضمن میں کراچی ریزولیشن وضاحت طلب ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت حاصل ہوئی ہے کہ پنڈت نہرو نے اپنے ایک بیان میں اقلیت کے سیاسی حقوق کے

موازنے کی نسبت بہتر خیال کا اظہار کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گفت و شنید کے لیے اب بھی دروازہ کھلا ہے۔ پنڈت جی اچھے غور وخوض کے لیے شہرت پیدا کر چکے ہیں۔ بنابریں اگر وہ مسٹر جناح سے دوبارہ گفت وشنید کر لیں تو مسائل کے تصفیے کے لیے ضرور کوئی فارمولا مرتب ہو جائے گا۔ اس وقت سر تیج بہادر سپرد اور مسٹر جیکر کانگریس اور حکومت میں مصالحت کرانے کے لیے بیچ بچاؤ کر رہے ہیں اور سارا ملک ان کے اس اقدام کو سراہ رہا ہے۔ مہاتما گاندھی اور وائسرائے کو ایک مجلس میں لانے کے لیے سیاسی اثر ڈالا جا رہا ہے۔ جس صورت میں بیچ بچاؤ کے یہ اقدامات سراہے جا رہے ہیں۔ کانگریس اعتماد حاصل کرنے کے متعلق اپنے مطالبے کو حق بجانب قرار دے رہی ہے۔ اس قسم کے اطمینان سے متعلق مسلمانوں کا مطالبہ مضحکہ خیز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ پنڈت نہرو اور مسٹر جناح ایک مجلس میں دُوبدو باتیں کر کے کسی آخری فیصلے پر نہ پہنچیں۔ اس طرح کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ سیاسی بیچ بچاؤ کرانے والے مصالحت کرانے کے لیے آگے نہ بڑھیں۔

جس حد تک جمعیت علمائے ہند کے اجلاس مراد آباد کا تعلق ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے سے روکا جائے۔ اگر کانگریس میں شمول اور عدم شمول کا سوال جمعیت کے پیش نظر ہے تو اس نے اپنی پوزیشن صاف کر دی ہے۔ اگر کانگریس آزادی کے حصول کے لیے نبرد آزما ہو رہی ہے تو جمعیت بھی اس کے دوش بدوش اور اپنے ہمیشہ کے اصول کے مطابق اس سے اشتراک مساعی کرے گی۔ جس وقت تک ہندوستان مکمل آزادی حاصل نہیں کر لیتا۔ جمعیت کانگریس سے تعاون کرتی رہے گی۔ مگر جس صورت میں کہ

کانگریس گورنروں سے معاہدہ کر کے دستور اساسی کے تحت وزارتیں قبول کر رہی ہے۔ اس صورت میں کانگریس کا فرض ہے کہ وہ اپنے سیاسی وقار کے دوام اور اپنے عزائم کے متعلق مسلمانوں کو اطمینان دلانے کے لیے ان سے دوستانہ تعلق پیدا کرے اور انہیں ہر حالت میں مطمئن کرے۔''

(ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' دہلی، ۱۶ مئی ۱۹۳۷ء، بہ حوالہ کاروان احرار: ج ۳ ص ۷۵-۷۶)

(۴)

جمعیت علمائے ہند کی تجویز اتحاد اور جناح صاحب کا ردعمل

مسلم مسایل پر گفتگو خواہ حکومت سے ہوتی یا کانگریس سے، جمعیت علمائے ہند کا ہمیشہ یہ موقف رہا کہ پہلے مسلمان اور ان کی نمایندہ جماعتیں مل کر آپس میں ایک متفقہ فیصلہ کریں اور پھر حکومت یا کانگریس سے مفاہمت اور تصفیے کی گفتگو کریں۔ جمعیت کا ہمیشہ یہی اصرار رہا اور لیگ نے ہمیشہ اس سے اعراض واختلاف کیا اور اس کا ہمیشہ ایک ہی نتیجہ نکلا کہ کبھی مفاہمت کی بیل منڈھے نہ چڑھی۔ ۱۹۳۸ء میں پھر ایک ایسا موقع آیا، یہی عمل دوہرایا گیا اور اس کا وہی نتیجہ نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔

جمعیۃ علمائے ہند کی تجویز:

جیسے ہی یہ افواہ ملک میں پھیلی کہ کانگریس فرقہ وارانہ مسائل پر مسٹر جناح سے گفتگو کرنے کا ارادہ کر رہی ہے، مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند نے پریس کے ذریعے حسب ذیل تجویز پیش کی۔

''یہ افواہ عام گشت کر رہی ہے کہ کانگریس بمبئی فیصلے کے مطابق مسٹر محمد جناح سے بات چیت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

اس موقعہ پر میری تجویز ہے کہ کانگریس سے بات چیت کرنے سے پیشتر تمام مسلم جماعتوں کا ایک کنونشن بلا لیا جائے۔ کیونکہ اس سے

پیشتر مسلمانوں کا باہمی اتحاد بڑا ضروری ہے اور یہ کنونشن بہتر نتائج پیدا
کرسکتا ہے۔'' (ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' دہلی، ۶ / جنوری ۱۹۳۸ء)

مسٹر جناح کا انکار:

مولانا احمد سعید کی مندرجہ بالا تجویز کی تائید میں بہار جمعیت کے سیکرٹری جنرل نے مسٹر محمد علی جناح کو حسب ذیل تار دیا:

''کانگریس سے فرقہ وارانہ مسائل پر گفتگو کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ آپ مولانا احمد سعید کی تجویز کے مطابق مسلمانانِ ہند کی تمام جماعتوں کا ایک کنونشن طلب کریں۔ تاکہ باہم مل کر بات طے ہو سکے اور انہی شرائط کے تحت کانگریس سے گفتگو کی جائے۔''

اس تار کے جواب میں مسٹر جناح نے کہا:

''کانگریس کے ساتھ گفتگوئے صلح کے آغاز سے پیشتر شرائط طے کرنے کے لیے ایک آل مسلم کانفرنس منعقد کرنا مولانا احمد سعید کی تجویز قبل از وقت اور غیر معقول ہے۔ میں اس تجویز کے سخت خلاف ہوں۔'' (روزنامہ ''انقلاب''۔ لاہور ۱۶ / جنوری ۱۹۳۸ء)

بمبئی سے مسٹر محمد علی جناح نے ۱۰ / جنوری کو ایسوسی ایٹڈ پریس کی وساطت سے ایک بیان شائع کرایا۔ جس میں انہوں نے جواہر لعل کے بیان کا جواب دیا ہے:

''ہم آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں اس تجویز پر غور کریں گے جو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی طرف سے رسمی طور پر منظور کی گئی ہے۔ گو پنڈت نہرو کے بیان کا حقیقی مطلب نہایت واضح ہے اور میں اسے خوش آمدید کہتا ہوں۔ اس بیان کے بعض حصوں کا ظاہر مطلب مصلحت آمیز معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گزشتہ چند مہینوں کے واقعات نے کانگریسی رہنماؤں پر واضح کر دیا ہے کہ مسلم لیگ کی حیثیت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں۔''

(روزنامہ ''انقلاب''۔ لاہور۔ ۱۳ / جنوری ۱۹۳۸ء بہ حوالہ ''کاروانِ احرار'': ج ۳، ص ۳۱-۲۳۰)

(۴)

لیگ اور کانگریس کے رویوں کا تضاد!

کانگریس نے جنگ کے بعد ملک کی آزادی کی یقین دہائی کے بغیر عالمی جنگ میں فریق بننے سے صاف انکار کر دیا لیکن لیگ کا تعاون اس کے لیے غیر مشروط تھا۔ جمعیت علماء ہند اپنے ردعمل کے اظہار کے لیے ایک بیان کے اجرا کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ مولانا احمد سعید دہلوی ناظم جمعیت علمائے ہند نے ایک بیان میں فرمایا:

''وائسرائے ہند کے مایوس کن اعلان اور وزیر ہند کے اس بے موقع تبصرہ نے تمام ہندوستان کے آزادی پسند طبقے کے دلوں کو مجروح کر دیا ہے۔ کانگریس نے اس بیان کا جس طرح خیر مقدم کیا۔ وہ کانگریس کی پچاس سالہ روایات کے بالکل مطابق ہے۔

لیگ کے فیصلہ پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس نازک موقع پر وائسرائے کو پھر مسلمانوں کی ایک جماعت کی ضرورت تھی جس کو وہ اپنا آلہ کار بنا کر کانگریس کو شکست دیں اور مسلمانوں کے کاندھوں پر رکھ کر بندوق چلائیں۔ اگر مسلم لیگ اس وقت اس خدمت کے انجام دینے کے لیے تیار نہ ہوتی اور مسٹر جینا واحد نمایندگی کے جال میں نہ پھنس جاتے تو وائسرائے ہند سر سکندر حیات وغیرہ سے ایک مسلم کانفرنس کی تشکیل کراتے اور اس کو مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت کے لقب سے سرفراز کرتے لیکن گورنمنٹ کو اس قسم کی دشواری پیش نہ آئی اور مسٹر جینا اس جال میں پھنس گئے۔

اب ہندوستان کی ترقی اور آزادی کی راہ میں ہر موقع پر وائسرائے ہند مسٹر جینا اور اُن کی لیگ کو استعمال کریں گے۔

آخر میں آپ نے فرمایا میں نہایت صفائی کے ساتھ اس امر کو ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جینا نے اگر وائسرائے کو مسلمانوں کی طرف سے جنگ میں امداد اور تعاون کا یقین دلایا تو وہ نہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دیں گے بلکہ وائسرائے کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کریں گے۔(مدنیہ، ۵ر نومبر ۳۹ء بہ حوالہ ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: ج ۲،۹۶-۹۴)

(۵)

جناح صاحب کی یوم نجات کی اپیل پر مولانا احمد سعید کا تبصرہ

مسلم لیگ کے رہنما نے کانگریسی وزارتوں کے مسلمانوں پر مظالم کی داستان سرائی کے جواب میں مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، راجندر پرشاد کی انکوائری کرانے کی پیشکش سے اعراض اور پھر کانگریسی وزارتوں کے استعفا پر یوم نجات منانے کی اپیل پر جمعیت علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعید دہلوی نے اپنے بیان میں حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:

''ٹھیک ایسے وقت میں جبکہ ملک مسٹر جناح اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی گفت وشنید کا منتظر تھا اور ہندوستان کا ہر بہی خواہ اس امر کا خواہشمند تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی ایسا سمجھوتہ ہو جائے، جس سے ملک کی دو بڑی قوتیں باہمی اطمینان اور اعتبار کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں اور اپنے ملک کو آزاد کرانے اور سامراجی طاقتوں سے نجات دلانے کے لیے مل جل کر کوشش کریں۔ مسٹر جناح نے ایک ایسا بے موقعہ اور بے معنی بیان دیا ہے جس سے ملک کے ترقی پسند طبقے میں مایوسی پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کا بہترین آدمی کسی کی دشمنی یا دوستی میں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور اتنا بے قابو ہو جائے کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہے کہ کل اس نے کیا کہا تھا۔

مسٹر جناح ان صوبوں کے مسلمانوں سے ۲۲ر دسمبر کو ''یوم نجات'' منانے کی خواہش کرتے ہیں، جن صوبوں سے کانگریسی وزارتوں نے بطور احتجاج استعفے دے دیے ہیں اور جہاں آج انیسویں صدی کی طرح گورنروں کی حکومت ہو رہی ہے۔ جہاں تک کانگریسی حکومتوں کا تعلق ہے میں ان کی جانب سے کوئی صفائی پیش کرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ دوسری حکومتوں کی طرح کانگریسی حکومتوں نے بھی غلطیاں کیں۔ کیا جن صوبوں میں کانگریسی حکومتیں نہیں ہیں، ان صوبوں کے باشندے مطمئن ہیں؟ پنجاب میں تو کانگریسی حکومت نہیں ہے لیکن مجلس احرار اور اس کے معزز کارکنوں کے ساتھ جو رقیبانہ اور منتقمانہ سلوک ہو رہا ہے اس جیسی ایک مثال بھی کانگریسی حکومتوں میں نہیں مل سکتی۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ حکومت اور حکمرانی کے لیے جس فراخ حوصلگی اور وسعتِ قلب کی ضرورت ہے وہ بنیا پن کی پالیسی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کنویں سے نکل کر کھائی میں گر جانے کو نجات کہا جائے۔

کانگریسی حکومتوں کے جن مظالم کو مسٹر جناح بار بار دہراتے ہیں کیا ان کو معلوم نہیں کہ ان مظالم کی تمام ذمہ داری ان گورنروں پر عائد ہوتی ہے جو مداخلت کا اختیار رکھنے کے باوجود خاموشی کے ساتھ تمام مظالم کا تماشہ دیکھتے رہے اور انہوں نے اپنے اختیارات کا استعمال نہیں کیا اور جب گورنر بھی کانگریسی حکومتوں کے ساتھ ظلم میں برابر کے شریک ہیں تو ایک ظالم کے اقتدار سے نکل کر دوسرے ظالم کی سرپرستی میں جانا، نہ معلوم کس قسم کی نجات ہے؟ مسٹر جناح جس پر ''یومِ نجات'' منانا چاہتے ہیں۔

اس موقع پر مسٹر جناح سے کچھ عرض کرنا بے سود ہے۔ البتہ میں نہایت

ادب کے ساتھ مسلم لیگ کے ترقی پسند عناصر سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ جمعیۃ علماء ہند پر اعتماد نہیں رکھتے یا مجلس احرار جیسی فعال جماعت پر ان کو اعتماد نہیں ہے اور مسلمانوں کی ان جماعتوں سے اشتراک عمل میں اپنی توہین خیال کرتے ہیں تو کم از کم لیگ کے بنیادی اصولوں کا احترام قائم رکھیں اور اپنی خانہ ساز واحد نمائندہ جماعت کی قیادت موقع شناس لوگوں کے سپرد کریں جن کا دماغی توازن صحیح ہو اور جو جنگ اور صلح کے دونوں موقعوں پر صحیح رہنمائی کی اہلیت رکھتے ہوں۔ ورنہ آزاد خیال مسلمان یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مسلم لیگ ایک ایسی جماعت ہے، جو ہندوستان کی آزادی کی دشمن اور مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی پر قانع رکھنا چاہتی ہے۔" (سہ روزہ "زمزم" ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء بہ حوالہ "کاروان احرار": ج ۴، ص ۵۳-۲۵۰)

(۶)

مولانا احمد سعید کا برقیہ

۷رمئی ۱۹۴۵ء

دہلی (ڈاک سے) حضرت مولانا احمد سعید صاحب صدر جمعیت علمائے صوبہ دہلی نے حسب ذیل برقیہ وائسرائے ہند لارڈ ویول کے نام روانہ کیا ہے:

"مولانا ابوالکلام آزاد کو ایسی حالت میں جب کہ ان کی صحت انتہائی خراب ہو چکی ہے اور ان کا وزن بہت کم ہو گیا ہے، کسی ایک مقام پر تنہا رکھنا جو مختلف بیماریوں کے لیے عموماً اور ملیریا کے لیے ضرب المثل ہے، ایک ایسی کارروائی ہے جس کی مثال کسی مہذب حکومت میں ملنی دشوار ہے۔ کیا آپ کی گورنمنٹ مہربانی فرما کر ایک ایسے فیصلے پر نظر ثانی کرے گی جس نے ملک کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی بڑی اکثریت کو

بے چین کررکھا ہے؟

ناظم جمعیت علماے صوبہ دہلی

(زمزم لاہور: ۷رمئی ۱۹۴۵ء)

۱۰راگست ۱۹۴۲ء کی شب کو مولانا آزاد گرفتار کیے گئے تھے تو قلعہ احمد نگر میں ڈاکٹر کے معائنے سے معلوم ہوا کہ ان کا وزن ۱۷۰ پونڈ ہے۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب انھیں بانکوڑا جیل منتقل کیا گیا تو ان کا وزن ۱۳۰ پونڈ ہے۔ اپریل کو مسٹر آصف علی ممبر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک اخبار کو بتایا جب مولانا کی صحت کی صورت حال مشتہر ہوئی تو ملک میں بے چینی کی ایک عام لہر دوڑ گئی اور ملک کے سربرآوردہ حضرات نے اپنے بیانات، جماعتوں نے اپنی تجاویز اور اخبارات نے اپنے اداریوں اور عوام نے اپنے مراسلات میں مولانا آزاد کے لیے اپنی اپنی تشویشات کا اظہار کیا۔ مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم کا یہ برقیہ اسی سلسلۂ تحریک کی ایک کڑی ہے۔

(۷)

مسٹر جناح کی مسلمانوں سے اتحاد کے لیے اپیل اور اس پر ردعمل

مسٹر محمد علی جناح نے ۲۸راگست ۱۹۴۶ء کو مسلمانوں سے اتحاد کی اپیل کی تھی۔ جمعیت علماے ہند کے ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعید دہلویؒ نے اس اپیل کے جواب میں اپنے بیان میں کہا:

''جمعیت علمائے ہند، مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کے اس بیان کا خیر مقدم کرتی ہے جس میں انھوں نے لیگ کے علاوہ باقی مسلمان سیاسی جماعتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اتحاد باہمی کے ساتھ انگریز اور ہندو کا مقابلہ کریں۔ بلاشبہ اس وقت ضرورت کا تقاضہ یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں باہم ربط ہو لیکن قائداعظم صاحب یہ سوچ لیں کہ ان کے واحد نمائندگی کے دعویٰ کا کیا ہوگا جبکہ وہ خود غیر لیگی مسلمانوں کو کافر قرار دے چکے ہیں۔ اس کے باوجود میں ان کے اس

جذبے کی قدر کرتے ہوئے ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ غیر مسلم لیگی جماعتوں کے اجلاس میں شریک ہو کر ان کے سامنے اپنا مؤقف بیان کرنے پر آمادہ ہیں؟ اگر تیار ہوں تو نیشنلسٹ مسلمان جماعتیں ان کی رہنمائی قبول کرنے کو تیار ہیں۔''

(سہ روزہ الجمعیۃ دہلی، بہ حوالہ کاروانِ احرار: ج ۷، ص ۳۶۸)

حاشیہ:

۱- اس زمانے میں مولانا دہلوی کا تعلق جمعیت علمائے صوبہ دہلی سے تھا۔ وہ مرکزی جمعیت علما کے ناظم اعلیٰ رہے تھے اور قایم مقام صدر بھی۔ ۱۹۴۶ء میں مرکزی جمعیت کی نظامت سے ان کا تعلق میرے علم میں نہیں۔ یقین ہے کہ یہ اخبار کے کاتب کا سہو قلم ہے۔

جناح سعید مراسلت:

اتحاد بین المسلمین

جمعیۃ علماے ہند اور جناح صاحب

خضر حیات خاں کی بغاوت:

۱۹۳۶ء میں جمعیت علماے ہند نے لیگ کے ساتھ اس شرط پر اشتراک کیا تھا اور جگہ جگہ پروپیگنڈا کر کے لیگی اُمیدواروں کو کامیاب بنایا تھا کہ لیگ کے دایرے سے سرکار پرست لوگوں کو خارج کر دیا جائے گا۔ مسٹر جناح نے وعدہ کر لیا تھا، مگر کام نکال کر وعدے کو سیاسی وعدہ کہہ کر ٹال دیا۔ علماے کرام جانتے تھے کہ نوابوں اور سروں کا یہ عنصر لیگ کو حکومت کے خلاف صف آرا ہونے سے روکے گا۔ وطن کی آزادی اور نظام حکومت کی تبدیلی ان کی موت ہے۔ اس لیے وہ لیگ کی سرگرمیوں کو صرف کاغذی تجاویز اور فرقے وارانہ کشمکش پیدا کرنے تک محدود رکھنے کی کوشش کرے گا۔

مسٹر جناح کا دل جانتا ہے کہ ان غداروں نے مسٹر جناح کو ہر موقع پر آنکھیں دکھائیں اور بے چون وچرا ساتھ چلنے کے لیے بڑے بڑے اہم اور نازک موقعوں پر انکار کر دیا ہے۔

چناں چہ ۱۹۴۴ء میں پنجاب کے وزیراعظم سر خضر حیات خاں نے اپنے پیش روکی منافقانہ پالیسی چھوڑ کر مسٹر جناح کی قیادت کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا۔ اس پر مسٹر جناح چلا اُٹھے۔ ذہن ناکامی سے تھک گیا۔ آرام کے لیے کشمیر کی طرف رُخ کرنا پڑا۔ جاتے ہوئے سیالکوٹ میں چند تقریریں کیں اور اس میں قوم پرور طبقے سے سرکار پرستوں کے خلاف تعاون و اشتراک کی اپیل کی۔

اس اپیل کی محرک دراصل پنجاب میں مسٹر جناح کی ناکامی تھی لیکن ایک واقعہ اس کے

ساتھ اور بھی ہو گیا تھا جس نے مسٹر جناح کو متاثر کیے بغیر نہ چھوڑا۔ ہوا یہ کہ احراری رضا کاروں نے بینڈ باجے کے ساتھ مسٹر جناح کے جلوس میں شرکت کی۔ بس اب کیا تھا۔ شاہانہ جلوس کی رونق دوبالا ہو گئی اور مسٹر جناح نے اظہارِ تشکر کے طور پر بشمول جمعیت علما ان کی طرف توجہ کی اور لیگ میں آ جانے کے لیے درخواست کی۔ اس اپیل پر جمعیت علما نے لبیک کہا اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب قایم مقام صدر جمعیت علما نے مسٹر جناح سے خط و کتابت کی جسے ہم مکمل طور پر درج ذیل کرتے ہیں۔

برقیہ مولانا احمد سعید بنام مسٹر جناح

دہلی

۸؍مئی ۱۹۴۴ء

میں نے اخبارات میں جناب کی وہ تقریر پڑھی جو آپ نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے ۲؍مئی ۱۹۴۴ء کو سیالکوٹ میں فرمائی ہے۔ اس تقریر میں آپ نے جن جماعتوں سے اپیل کی ہے اس میں جمعیت علما اور احرار کا بھی نام لیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے لیے تقریباً چار سال قبل حضرت العلامہ مفتی اعظم محمد کفایت اللہ صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے آپ سے نیو دہلی میں ملاقات کی تھی اور تقریباً تین گھنٹے تک آپ سے ان حضرات نے تبادلہ خیالات کیا تھا اور خلوص قلب کے ساتھ تعاون و اشتراک عمل کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں وہ نہایت خطرناک دور ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق بین المسلمین کی ضرورت گزشتہ تمام زمانوں سے زیادہ شدید ہے۔ اگر چار سال بعد آپ بھی اس کو محسوس کرتے ہیں کہ غداروں کو شکست دینے کے لیے آپ کو آزاد جماعتوں کی مدد حاصل کرنے اور آزاد خیال مسلمانوں کو رائٹ ونگ بنانے کی ضرورت ہے تو میں آپ کے اس جذبۂ اتحاد و اتفاق کا خیر مقدم کرتا ہوں اور خلوص اور درد دل کے ساتھ اس جذبۂ اتحاد میں نہ صرف آپ کا ہم نوا ہوں، بلکہ آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ جمعیت

علما صوبہ دہلی کے اجلاس میں جو ۲۶/ ۲۷/ ۲۸ مئی ۱۹۴۴ء کو دہلی میں ہو رہا ہے شرکت فرمائیں تا کہ ہم اور آپ باہمی تبادلہ افکار و آرا سے ملت اسلامیہ کے صحیح اور حقیقی مفاد پر غور کر سکیں۔ اگر جناب پسند فرمائیں تو ملت اسلامیہ کی دیگر معتمد جماعتوں کے نمائندوں کو بھی اس موقع پر مدعو کر لیا جائے اور کوئی متحدہ و متفقہ لائحہ عمل تیار کر کے ہم اور آپ متفقہ طور پر اپنے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد شروع کر دیں اور پھر ہم اور آپ متفق ہو کر ان غداروں کو راستے سے ہٹا دیں جو ہماری منزل کو دور اور دشوار تر بنانے کی کوشش کریں۔

میں ہوں آپ کا مخلص
احمد سعید[1]

جواب بذریعہ خط بنام مولانا احمد سعید صاحب

کوشک متصل پشاور سری نگر، کشمیر
۱۵ مئی ۱۹۴۴ء

ڈیئر سر!

مجھے آپ کا تار مؤرخہ ۸ر مئی جو لاہور کے پتے پر بھیجا گیا تھا اور جسے یہاں روانہ کیا گیا ہے، موصول ہوا۔ میں اس تار کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایڈریس (کے جواب) میں جو تقریر میں نے کی تھی اور ۳۰ر اپریل ۱۹۴۴ء کو پنجاب مسلم لیگ کانفرنس منعقدہ سیالکوٹ میں جو آخری تقریر میری ہوئی تھی، اس میں میں نے ہر مسلمان سے بشمول جمعیت علما و احرار یہ اپیل ضرور کی تھی کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہوں۔ میں لیگ میں شریک ہونے اور اس کے عقیدہ، پالیسی اور پروگرام کی تہ دل سے حمایت کرنے اور لیگ کے اندر آ کر اس کی اصلاح کرنے اور اسے زیادہ لائق اور بہتر بنانے کے لیے ہر مسلمان کا خیر مقدم کروں گا۔

گزشتہ گفتگوؤں اور اختلافات کو جو مختلف وجوہ کی بنا پر تھے میرے خیال میں اب جاری رکھنا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ماضی کو دفن کر دے اور مسلمانوں کے قومی

مقصد اور ہماری منزل مقصود یعنی پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے ہم جس جد و جہد میں مشغول ہیں ہم سب کو آل انڈیا مسلم لیگ کے عقیدہ، پالیسی اور پروگرام کو قبول کر لینا چاہیے اور دل و جان سے اپنی اس جماعت کو سب سے زیادہ طاقتور اور لایق بنانا چاہیے۔ جس کے بغیر ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اس مشفقانہ دعوت کو قبول نہیں کر سکتا جو آپ نے جمعیت علماے صوبہ دہلی کے سالانہ اجلاس میں ۲۶/۲۷/۲۸ مئی ۱۹۴۴ء کو شرکت کرنے کے لیے مجھے دی ہے۔ کیوں کہ میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ معلوم ہے کہ میں نے کئی سال بعد تھوڑی مدت کے لیے چھٹی لی ہے اور میں یہاں سری نگر میں مکمل آرام کر رہا ہوں۔ جو کچھ عرصہ کے لیے میرے واسطے بہت ضروری ہے۔ مگر میں آپ سے ملاقات کر کے بہت خوش ہوں گا۔ اگر آپ اور آپ کے احباب اس وقت ایسا کرنا چاہیں گے جب کہ میں پہاڑوں سے میدان کی طرف واپس ہوں گا۔

آپ کا مخلص

ایم اے جناح

خط بنام مسٹر جناح

دفتر جمعیت علماء صوبہ دہلی

۳۱/ جولائی ۱۹۴۴ء

ڈیئر مسٹر جناح پریزیڈنٹ آل انڈیا مسلم لیگ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! آپ نے اپنے خط مورخہ ۱۵/ مئی ۱۹۴۴ء میں تحریر فرمایا تھا کہ جب میں جولائی میں پہاڑ سے اُتر کر میدان کی طرف واپس ہوں گا اس وقت آپ اور آپ کے احباب اگر ملاقات کرنا چاہیں گے تو میں ان سے مل کر بہت خوش ہوں گا۔ لیگ میں شرکت کی اپیل جو آپ نے کی ہے وہ میں نے پڑھی اس کے پیش نظر میرا خیال ہے کہ اگر ملاقات کے وقت آپ کا جواب یہی ہوا کہ لیگ میں شریک ہو جاؤ پھر بات کریں گے تو

ملاقات کی زحمت آپ کو دینی لاحاصل ہے۔ جناب کو معلوم ہے کہ جمعیت علما کی ایک تاریخ ہے اور اس کی روایات اور قربانیاں ہیں۔ وہ ان کو کس طرح ضایع یا فراموش کر سکتی ہے۔

جمعیت علما بھی ہندوستان کے تمام مفکرین و مبصرین کی طرح پختہ یقین رکھتی ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ بغیر ہندو مسلم سمجھوتے کے طے ہونے والا نہیں اور ہندو مسلم سمجھوتے میں جس قدر دیر ہو رہی ہے اس قدر آزادی کے حصول میں تاخیر ہونی لازمی ہے۔ نیز یہ وقت ہندو مسلم سمجھوتے کے لیے بہترین وقت ہے۔

سمجھوتے میں مسلمانوں کے قومی، مذہبی، وطنی مفاد کی حفاظت لازمی ہے۔ ان تمام امور کے پیش نظر لازمی ہے کہ مسلم مطالبات کی تفصیلات تمام مفکرین و ذی بصیرت مسلمانوں کے مشورے سے طے ہوں اور مسلم مطالبات کا ایک متفقہ مسودہ تیار کر کے سمجھوتے کے لیے پیش کیا جائے۔ میں سر دست اس بحث کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا کہ کسی ایسے مبہم عنوان پر جس کی تفصیل بہت سے ارباب فکر بھی نہ جانتے ہوں، نہ بتلا سکے ہوں بغیر تبادلۂ خیال اور افہام و تفہیم کے تمام مسلم جماعتوں اور مفکرین و مبصرین کو ایمان لانے پر مجبور کرنا اور جب تک وہ اسے بغیر سمجھے ہوئے مان نہ لیں، ان سے بات نہ کرنا جمہوریت کے آئین کے کہاں تک موافق ہے؟

ان حقایق کے پیش نظر میں آپ سے مخلصانہ اور دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ مسلم لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی جو آل انڈیا جماعتیں ہیں اور جن میں ہندوستان کے معتمد محبانِ ملک و ملت اور مخلص کارکن شامل ہیں، ان کے ساتھ مسلمانوں اور وطن و مذہب کے حقیقی مفاد کی خاطر تبادلۂ خیالات کر کے مسلم مطالبہ متعین کیجیے۔

میں بے چینی سے آپ کی منظوری کا انتظار کرتا ہوں۔ اگر جناب نے منظوری عطا فرما دی تو جن جماعتوں کے نمایندوں کو مدعو کرنا اہم اور آپ ضروری سمجھیں گے ان کو دعوت دینے اور اجتماع کے انتظام کا میں وعدہ کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص

احمد سعید

خط بنام حضرت مولانا احمد سعید صاحب

ممدوٹ ولا، ڈیوس روڈ، لاہور
۲/اگست ۱۹۴۴ء

ڈیئر مسٹر سعید!

مجھے آپ کا خط مؤرخہ ۲۱ جولائی ۱۹۴۴ء موصول ہوا۔ چوں کہ میں سری نگر سے لاہور کو روانہ ہو رہا تھا اور چوں کہ لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل کے اجلاس منعقدہ ۲۹/جولائی کے سلسلے میں اور اس کے بعد مجھے بہت زیادہ کام تھا اس لیے میں آپ کے خط کا جواب جلد نہ دے سکا۔

مجھے افسوس ہے کہ میں ان نکات پر جن کا تذکرہ آپ نے اپنے خط میں کیا ہے، خط و کتابت کے ذریعے بحث نہیں کرسکتا اور مجھے اپنے خط مؤرخہ ۱۵/مئی ۱۹۴۴ء کے مضمون پر کچھ اضافہ بھی نہیں کرنا ہے۔ میں ۱۰/اور ۱۵/اگست کے درمیان دہلی میں ہو رہا ہوں اور میں آپ سے اور آپ کے دوستوں سے اگر آپ چاہیں تو ملاقات کرسکتا ہوں۔

آپ کا مخلص

ایم اے جناح

یہ پوری خط و کتاب آپ کے سامنے ہے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کون اب تک ضدی رویے پر قایم رہا۔ کس نے معقول افہام وتفہیم سے ہمیشہ گریز کیا، کون ہے جو اپنے سیاسی افکار کو غیر جمہوری طور پر مسلمانوں پر مسلط کرنا چاہتا ہے اور موجودہ افتراق کی ذمہ داری کس پر ہے؟

حاشیہ:

۱۔ مولانا سیّد حسین احمد مدنی اس وقت جیل میں تھے۔ حضرت مولانا احمد سعید دہلوی جمعیت علما کے قایم مقام صدر تھے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد حضرت مدنی بھی رہا ہوگئے تھے۔ (ا۔س۔ش)

جناح صاحب کی ایک اور دعوت اتحاد

اور مولانا احمد سعید دہلوی کا مثبت جواب

۱۹۴۶ء میں عید کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے قوم پرور مسلمانوں کو پھر ایک بار لیگ میں شرکت کی دعوت دی[1]۔ اس کے جواب میں مولانا احمد سعید صاحب نے حسب ذیل خط روانہ کیا۔ جس کے جواب دینے کی بھی مسٹر جناح نے زحمت گوارا نہ فرمائی۔

دعوت اتحاد کے جواب میں:

آپ نے تقریباً دو سال کے بعد پھر اس ضرورت کو محسوس کیا ہے کہ تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہونا چاہیے۔ آپ نے جمعیت علما، مجلس احرار، جماعت خاکسار اور نیشنلسٹ مسلمانوں کا نام لے کر ان سے اپیل کی ہے کہ وہ مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے جمع ہو جائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت بھی ایسی نہیں ہے جو باہمی اتحاد کا احساس نہ کرتی ہو، بالخصوص ایسے زمانے میں جب کہ اس باہمی اتحاد پر آئندہ مسلمانوں کی باعزت زندگی کا دارومدار ہو لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ جب اس قسم کی عام دعوت دیتے ہیں تو غیر آئینی طریقہ اختیار کرتے ہیں! جیسا کہ میں آپ کو اس سے پیشتر بھی سیالکوٹ کی ایک تقریر پر مطلع کر چکا ہوں۔ آپ عام مسلمانوں کو تو لیگ کے پرچم کے زیر سایہ بلا سکتے ہیں لیکن جماعتوں کو دعوت دینے کا یہ طریقہ غیر آئینی ہے۔ اگر واقعی آپ دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تمام مسلمان باہم مل کر اپنے مستقبل کے لیے کوئی راہ مقرر کریں تو آپ کا فرض ہے کہ آپ ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کریں یا تمام مسلمان جماعتوں کے مخصوص نمایندوں کو ایک مشترکہ اجتماع کی غرض سے جمع کریں اور اس اجتماع میں مسلم لیگ کے بھی مخصوص نمایندے جمع ہوں اور باہم تبادلہ خیالات سے ایک مشترکہ اور متفقہ راہ عمل مقرر کریں اور ان اختلافی امور میں غور کریں جن کی وجہ سے مسلمانوں کی آزادی پسند جماعتیں اس وقت تک مسلم لیگ سے علاحدہ رہی ہیں یا شریک ہو کر علاحدہ ہو گئی ہیں۔ اگر آپ میری رائے سے متفق ہوں اور اس قسم کے

اجتماع کی دعوت دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مسلم جماعتیں جن کا آپ نے اپنی تقریر میں نام لیا ہے باہم جمع ہو کر مسلم لیگ سے تبادلۂ خیالات نہ کریں اور کسی مفید نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوں۔

میرے نزدیک یہ طریقہ بہت ہی غیر آئینی بلکہ غیر جمہوری ہے کہ آپ اپنی ایک ایسی طے شدہ پالیسی کو قبول کرنے کی دعوت دیں جس سے ملک کا ایک بہت بڑا اور معقول طبقہ متفق نہ ہو، بلکہ آپ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو باہم مشورہ کر کے پالیسی طے کرنے کے لیے دعوت دیجیے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ آپ غیر لیگی مسلمانوں کی رائے کو بھی سننے اور اس پر غور کرنے کو تیار ہیں۔ میں آپ سے توقع کرتا ہوں کہ آپ میرے اس مخلصانہ عریضے پر خاص توجہ فرمائیں گے۔

میں آپ کے اُمید افزا جواب کا نہایت بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر و عافیت ہوں گے، چوں کہ آپ کی تقریر پریس میں شایع ہو چکی ہے اس لیے میں بھی اپنا یہ خط پریس کو دے رہا ہوں۔

اتحاد کی منظم سعی:

مئی ۱۹۴۴ء کو قوم پرور جماعتوں نے دہلی میں بڑے بڑے شاندار جلسے کر کے لیگ کے رہنماؤں کو سیاسی مسائل پر گفت وشنید کی دعوت دی اور پاکستان کے معاملے پر ایک نمایندہ مسلم کانفرنس بلانے کے لیے اپیل کی مگر لیگ کی طرف سے کوئی جواب نہ دیا گیا۔ حال آں کہ اس وقت مسلمانوں کی طرف سے وزارتی مشن کے سامنے ایک متحدہ مطالبہ پیش کرنے کی سخت ضرورت تھی۔

حاشیہ:

۱- مسلم لیگ کے صدر نے یہ تقریر ۳۰ راگست ۱۹۴۶ء کو قیصر باغ بمبئی میں جشن عید کے ایک جلسے میں فرمائی تھی۔ انھوں نے کہا تھا:

"بلا شبہ اسلامی دنیا کے لیے آج کا دن مسرت و شادمانی کا دن ہے لیکن

ہم حقایق سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ آج ہمارے سروں پر سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا منڈلا رہا ہے۔ ایسے نازک حالات میں میں اسلامیانِ ہند سے درخواست کروں گا کہ وہ آنے والے خطرات کو محسوس کریں اور اپنے اختلافات کو بھول جائیں۔ شانے سے شانہ ملا کر سارے ملک میں متحد و منظم ہو جائیں اور اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ میں جمعیت علماے ہند، مجلس احرار، خاکسار اور مسلم مجلس سے اپیل کرتا ہوں کہ اسلام کی فلاح و سربلندی کی خاطر متحد ہو جائیں اور مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔''

جناح صاحب کے نزدیک اتحاد کا مقصد تھا، ان کی قیادت پر ایمان لانا اور مسلم لیگ میں شامل ہو جانا۔ جمعیت علماے ہند نے اتحاد کا مطلب دوسرا اور حقیقی معنوں میں لیا۔ اسی خوش فہمی میں حضرت مولانا احمد سعیدؒ نے انھیں خط لکھا اور توقع کی کہ وہ واقعی اتحاد کے قیام کے لیے قدم اُٹھائیں گے اور جب انھوں نے ایسا نہیں کیا تو رنجیدہ و شکوہ سنج ہوئے۔ جناح صاحب کا ایک اور مقصد مسلمانانِ ہند پر اپنی جانب سے اتحاد کے لیے سعی و اقدام کا پروپیگنڈا کرنا تھا اور اتحاد میں ناکامی کا الزام دوسروں پر ڈالنا تھا۔ وہ اس میں ناکام نہیں رہے۔ مولانا کے سامنے ان کی خوش فہمی کا جو نتیجہ آنا تھا وہی آیا۔

دعوت اتحاد سے جناح صاحب کا منشا، اتحاد کے بارے میں ان کے مجموعی رویے اور ان کی اپنی جماعت لیگ میں ان کی پالیسی کے بارے میں ''کاروانِ احرار'' کے حوالے سے ایک نوٹ ''مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی......ایک سیاسی مطالعہ'' میں شامل ہے۔ ہم قارئین کرام کو اس کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔